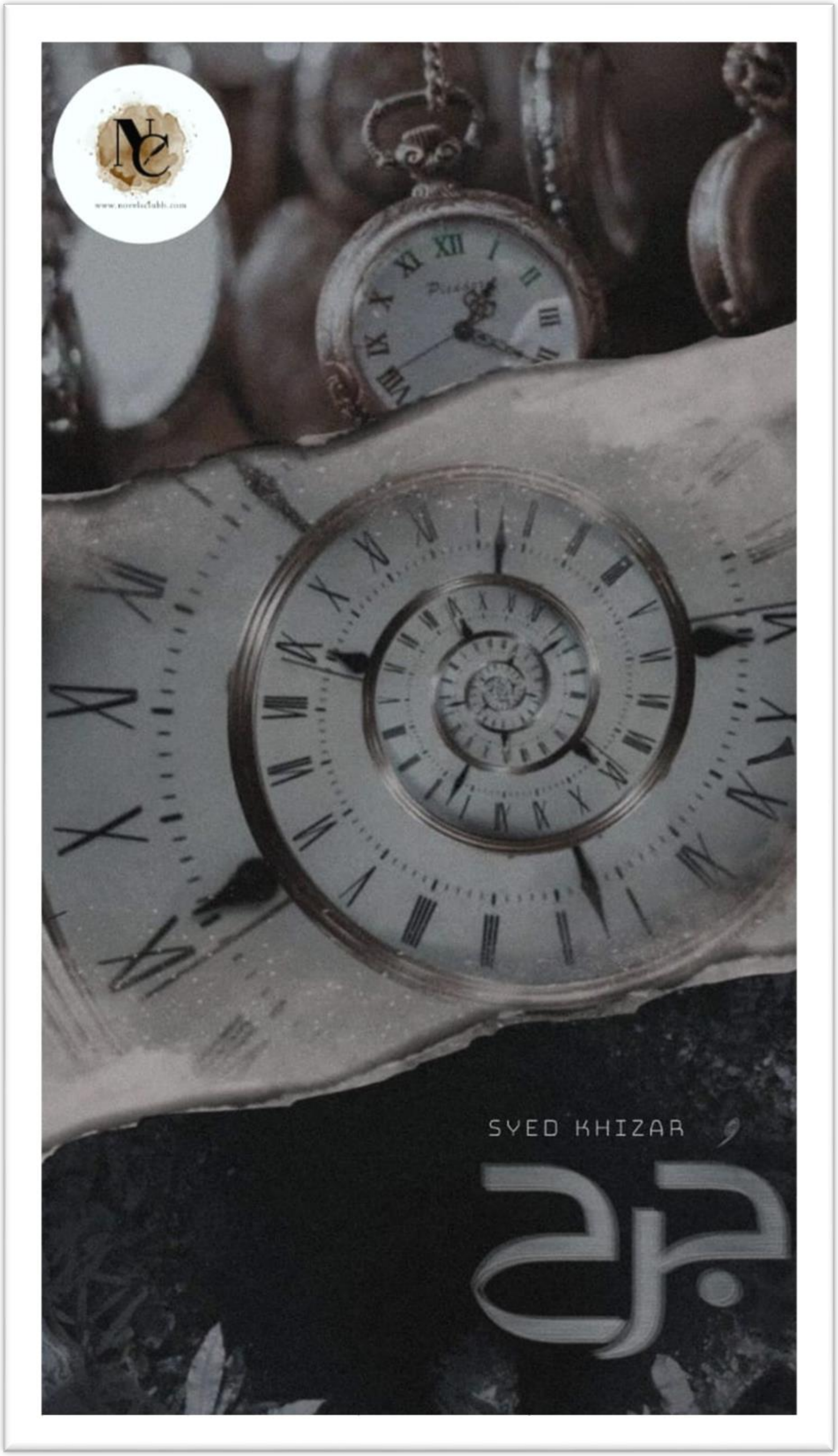
SYED KHIZAR
جرح

السلام علیکم

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری،ناولٹ،کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک،انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842

جرح

قسط نمبر ایک

"جس کو خبر ہوئی"

جب انسان لا علم ہوتا ہے

دھوکے سے، جھوٹ سے

اور نہیں جان پاتا ہے کہ

کون ہے نقلی چہرہ اوڑھے ہوئے

کیا نیت ہے، بس ہے مسکراہٹ

جھوٹ ہوتا ہے، دھوکا ہوتا ہے

مگر کتنا اچھا ہوتا ہے

وہ اک لمحہ

جب وہ قریب ہوتا ہے

ہوتی ہے ہنسی خوشی اس لمحے میں

فریبی ہی سہی

☆☆☆☆

چہرہ سفید، آنکھیں جیسے قبول ہی نا کر پا رہی ہوں کہ جو اس نے دیکھا وہ حقیقت تھا یا خواب۔

تم۔۔۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا سارہ؟"۔وہ جیسے سمجھ ہی نہیں پائی ہو کہ جو منظر چند لمحوں پہلے اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا تھا، اچانک اوجھل کیسے ہو گیا۔

"کیا نہیں دیکھا؟ تم کس چیز کی بات کر رہی ہو؟"-اس کو بھی جیسے سمجھ نا آیا ہو کہ ایسا کیا ہوا تھا جو وہ اتنی شاکڈ تھی۔

"وہ۔۔۔حادثہ؟ تم نے نہیں دیکھا؟ میں سچ کہہ رہی ہوں، میرے سامنے ایک حادثہ پیش آیا تھا سارہ، ابھی ابھی جب تم آرڈر لینے گئی تھی"۔وہ صدر کی قدیم سڑک پر موجود ایک انتہا کے ہجوم کو اشارے کے حصار میں لائے کہہ رہی تھی۔

"میں نے خود دیکھا تھا کہ ایک عورت گاڑی سے ٹکرا کر دور پھنکا گئی۔اسکے سر سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔۔۔اور پھر۔۔۔اور پھر تم نے مجھے ٹوک دیا اور وہ منظر اچانک گم ہو گیا۔ایسے جیسے خواب ہو، مگر کوئی انسان جاگتی آنکھوں سے خواب کیسے دیکھ سکتا ہے سارہ؟"۔

"میں نے دیکھا تو ہے، ارسلان کا"۔وہ ماحول کو کول ڈاون کرنے کی کوشش میں تھی مگر ناکام رہی۔"میں سیریس ہوں سارہ"۔وہ ابھی بھی سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اچھا سوری یار۔۔۔بھائی دیکھو، تمہارا وژن ہو گا کوئی یا تم کچھ سوچ رہی ہو گی۔ تمہارے ذہن میں کوئی فلم چل رہی ہو گی جس کو تم اپنی آنکھوں سے اس سڑک پر امیجن کر رہی ہو گی۔" وہ جو ایک ساتھ ایک سانس میں سب کہہ رہی تھی، ایک پل کو رکی اور کہا،

تم hallucinate

تو کرنا شروع نہیں ہو گئی ہو؟۔

"نہیں سارہ۔۔۔میں اس زون سے باہر نکل چکی ہوں, کتنی بار بتاوں۔۔۔"۔

"تم کہہ رہی ہو تو شاید۔ پھر تو امیجن کر رہی ہو گی تم، ہوتا ہے ایسا، اپنے ذہن میں اتنے وسوسے مت پالو، کافی پیو"۔

کراچی میں صدر نہیں صدر سے کراچی تھا، کراچی کا وہ علاقہ جہاں ہمیشہ ایک انتہا کا رش موجود ہوتا تھا۔ قدیم عمارتیں، بریٹش چرچ اور حسین کیفے انسان کو وہاں جانے پر مائل کرتے تھے۔ صدر کی سڑکیں کبھی خالی نا رہتیں۔ رات کو خوبصورت لائٹس کا اہتمام اور تھی۔ کوئی بھی قدیم شخص nostalgia کراچی کی مشہور زینب مارکٹ بھی وہیں بستی وہاں جاتا تو ایک

تھا جو ہٹ کر تا تھا۔ کراچی کو اسکے کھانوں اور سمندر کی وجہ سے پسند کیا جاتا تھا۔ مگر کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ صدر کی وہ خوبصورت عمارتیں کتنے راز اکھٹا کیے آخری سانسوں میں بھی اسی طرح منجمد کھڑی تھیں۔

وہ کافی کا سپ لے رہی تھی کہ کسی نے اسے مخاطب کیا۔ بلوٹر اوزر اور وائٹ ٹی شرٹ میں وہ کوئی انجان اسکے برابر میں کھڑا تھا۔ آدھے چہرے کو گول عینک نے گھیرے رکھا تھا اور باقی آدھے کو کالے ماسک نے۔

"ایکس کیوز می، میری گھڑی"۔ اس کی آواز ماسک کی وجہ سے دب گئی تھی۔ وہ سمجھ نا پائی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

"سوری؟"۔ وہ ابھی بھی اس وژن کے بارے میں سوچ رہی تھی، یا شاید وہ اسکی بات کو پروسس نہیں کر پائی تھی۔

"میں اپنی گھڑی بھول گیا تھا، وہ وہاں رکھی ہوئی ہے"۔ اب کی بار اس نے ٹیبل کے کارنر کی طرف اشارہ کیے ماسک نیچے کر کے بولا۔ ماسک سے چھپی سیٹ کی ہوئی داڑھی اب واضح تھی۔

اسکے دوبارہ دھرانے پر اس نے ٹیبل کے کارنر کو دیکھا، وہاں ایک پاکٹ واچ ضرور تھی۔ ہاتھ بڑھا کے اس نے وہ گھڑی اٹھائی تو وہ وزنی تھی۔

گھڑی اسکے حوالے کر کے اس نے کافی کا کپ اٹھا لیا۔ مگر وہ وہاں سے نہیں گیا تھا، وہ اب بھی وہیں ہی کھڑا رہا جیسے وہ کچھ اور کہنا چاہ رہا ہو۔

"Be careful"

خیال، وارنگ، کس چیز سے خیال، کس چیز کی وارنگ؟

شاید وہ اسکی بات کو سن نا سکی تھی، اور جب تک اس نے گردن گھما کے دیکھا وہ کیفے کے باہر جا چکا تھا۔

اس نے گردن واپس سارہ کی طرف کر لی تھی۔ اب وہ صرف سارہ سے مخاطب تھی، مگر وہ دیکھتی ہے کی سارہ شل بیٹھی ہے۔ جیسے اسے سانپ سونجھ گیا ہو۔ وہ برف سی وہاں بیٹھی تھی، اور نظریں اس کے ہاتھوں پر۔

"ایرج۔۔۔ تمہاری انگلیوں پر خون لگا ہوا ہے"۔

سارہ آنکھیں پھاڑے اب اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

کرسیوں کا ایک ڈھیر صحن میں ادھر ادھر پڑا تھا۔ گھر کے اعتراف میں بہت سے ملازمین کو دیکھا جا سکتا تھا جو گھر کی سجاوٹ میں الگ الگ کام کر رہے تھے۔ صحن کے باہر موجود سیڑھیاں جو اوپر کے فلور تک جانے کے لئے بنائی گئی تھیں، وہ آج پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ سیڑھیوں کے ایک طرف موم بتیاں رکھی ہوئی تھیں جو فلحال بجھی ہوئی تھیں۔ گھر گلاب اور دوسرے پھولوں کی مہک میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر دیکھا جاتا تو محلے میں سب سے منفرد گھر آج "فاطمہ منزل" ہی لگ رہا تھا۔

سیڑھیوں کے کنارے کھڑی وہ کسی کو کال کر رہی تھی۔ اور انداز سے وہ عاجز تھی، پتا چل رہا تھا کہ اس کے بار بار کال کرنے پر بھی کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ اب کی بار اس نے کال نہیں کی بلکہ سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے ہی چلایا۔

"سارہ؟"۔ قدرے آہستہ آواز میں اس نے سارہ کو پکارا تھا مگر آواز سارے میں گونجی۔ چند لمحوں بعد ہی اوپر کے فلور کا دروازہ کھلا اور وہاں سے وہ اترتے آ رہی تھی۔ کافی دبلی سی لڑکی تھی جس نے آج سفید رنگ کی فراک پر لال چھنری دار دوپٹا پہنے ہوئے تھا۔ "چلو بھی۔۔۔ کب سے میں ویٹ کر رہی ہوں کہ تم اب آؤ گی۔ تمہیں ڈیزائنر کی تیمینگ کا پتا بھی ہے۔ چلو اب، مغرب سے پہلے واپس بھی آنا ہے"۔ وہ گھر کے داخلی دروازے کی طرف چلتے چلتے کہہ رہی تھی جبکہ سارہ اسکے پیچھے اسے ان سنی کرتے موبائل پر کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔

عصر کی اذان ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا مگر آسمان دیکھ کر لگتا تھا کے مغرب کا وقت ہو چکا ہو۔ جنوری کی وہ شام اتنی سرد نہیں تھی جتنی اکثر دنوں ہوتی رہی تھی۔ آج صرف ہوائیں چل رہی تھیں جبکہ آسمان پر سورج بن بادل نمایاں تھا۔

اس نے آج چکن کڑھائی کی ہوئی ایک پنک کرتی ملبوس کی ہوئی تھی,، ڈوپٹا رسی کے مانند گلے میں مفلر کی طرح اوڑھ رکھا تھا۔ سارہ کے کہنے پر ہی ایرج نے اپنے لمبے بالوں کو

وولف کٹ کی شکل دی تھی اور شاید سارہ کا مشورہ درست ہی تھا کیونکہ اسکے چھوٹے سے گال پر جتنا وولف کٹ سوٹ کر رہا تھا شاید ہی کوئی اور ہیئر سٹائل کرتا۔اس چھوٹے سے گال کو آدھا گول چشمے چھپا دیتے تھے۔وہ روز کے معمول کے حساب سے وہ بے تحاشہ ٹوٹکے آزماتی تھی کہ اس کی ان موٹے موٹے چشموں سے جان چھوٹے مگر ان تمام پر پانی پھر جاتا کیونکہ ہر وقت تو وہ لیپ ٹاپ کی سکرین سے چپکی رہتی تھی۔

یونیورسٹی کی وجہ سے اسکا سکن ٹین (tan)

حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا حالاں کہ اسکی اصل رنگت گندمی ہی تھی۔یونیورسٹی کے آخری سال میں آئے اسے کچھ عرصہ ہی ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے کمرے کے باہر کم ہی دکھتی تھی۔اسکا آدھا وقت یونیورسٹی کے اسائنمنٹ گھیر لیتے تھے اور باقی وقت وہ لوگو ڈیزائننگ میں صرف کر دیتی تھی۔وہ اپنے آپ کے لئے خود کماتی تھی۔ایرج کے والد اتنا کماتے تھے کے اپنی اکلوتی اولاد کی فرمائشوں کو پورا کر سکیں مگر وہ ایسا نہیں کرتی تھی۔ بہت مجبوری میں اگر ہو تو وہ اپنے باپ سے پیسے لیتی تھی مگر اسکی نوبت کم ہی آتی،وہ اپنے کام سے جتنا کماتی تھی،اسکے لئے کافی ہوتا تھا۔وہ اپنی زندگی یونیورسٹی کے اسائنمنٹ اور

پریزنٹیشن میں گزارنا نہیں چاہتی تھی۔وہ کوئی ہنر سیکھنا چاہتی تھی جس کی وجہ سے وہ لوگو ڈیزائننگ کر کے پیسے کماتی تھی۔

ہر ماہ اپنے باپ کی طرف سے دیے گئے جیب خرچ کو وہ جمع کرتی رہی تھی۔ مگر اسے خود نہیں پتا تھا کہ وہ پیسے جمع کیوں کر رہی تھی؟

ہاں وہ سادہ لڑکی بھی نہیں تھی۔وہ ویسی ہی تھی جیسی تمام لڑکیاں ہوتی ہیں۔اسکے بھی خواب تھے جن کو وہ پورا نہیں، محنت سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ایرج جاوید صدیقی، اپنے ماں باپ، جاوید صدیقی اور حنا جاوید کی اکلوتی اولاد تھی۔۔۔یا شاید ہو گئی تھی۔ایرج کے بعد اللّٰہ نے ان کو ایک اور اولاد سے نوازہ تھا۔وہ لڑکا تھا، سعد جاوید صدیقی۔دو سال پہلے اس کی کار ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوئی تھا۔وہ ایک ایسا سانحہ تھا جس سے کوئی بھی اب تک باہر نکل نہیں پایا تھا۔سب کی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی، مگر اس گھر میں کوئی کسی کا اندازہ نہیں لگا پاتا تھا کہ کون کس غم کو برداشت کر رہا ہے، کون کس مصیبت کو جھیل رہا ہے۔کون کیسی جنگ لڑ رہا ہے۔

فاطمہ منزل زیادہ بڑا گھر نہیں تھا، تین فلور کے اس مکان میں فاطمہ بیگم کے دو بیٹے، جاوید اور نسیم صدیقی اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر کے تین فلور تھے جس میں سب سے اوپر والا فلور تو گھر کی خالی چھت تھی جو عرصوں سے بند تھی۔ گھر کا سب سے نچلا حصّہ گھر کا سب سے بڑا حصّہ تھا، کھلا صحن اور تین کمروں کے اس فلور پر جاوید کی فیملی رہتی تھی۔ ایک کمرہ جاوید اور حنا کا تھا، جو گھر کی پچھلی طرف بنا ہوا تھا۔ اسی سے جڑا ہوا ایک اور کمرہ تھا جو اب خالی تھا۔ وہ سعد کا کمرہ تھا جس کا دروازہ اب نہیں کھلتا تھا، حالاں کہ سعد کا کافی سامان اس کمرے میں ابھی تک موجود تھا، مگر پھر بھی وہاں کی اب صفائی بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ شاید اس گھر میں رہتے ان لوگوں کو خوف آتا تھا۔ وہ کمرہ ایک داستان سناتا تھا مگر کوئی تھا ہی نہیں جو سن پاتا ان بے جان چیزوں کی آواز جو بیان کرتے تھے ایک سانس لیتی جان کا قصّہ۔ اب وہ سلسلہ ختم ہو جاتا تو اچھا تھا، اب وہ کہانی ذہن سے نکل جائے تو سکون تھا۔

ان دو کمروں کے مقابل ایک واحد کمرہ بھی تھا جو ایرج کا ذاتی کمرہ تھا۔کافی عرصے سے اس کمرے کا رنگ جامنی تھا، سب سے پہلا کام جو ایرج نے کروانا تھا وہ اس کمرے کا رنگ تبدیل کروانا تھا۔وہ رنگ چبتا ہوا رنگ تھا جو کسی کو بھی زہر لگ سکتا تھا۔

سیکنڈ فلور پر جاوید کے بڑے بھائی نسیم صدیقی اپنی بیوی مریم کے ساتھ رہتے تھے۔انکی تین اولادیں تھیں جن میں دو بیٹے دانیال اور ارحم، ارحم سب سے بڑا بیٹا پاکستان سے باہر نوکری کرتا تھا، شادی شدہ، اپنی بیوی کے ساتھ جرمنی میں ہی رہتا تھا، معمول کے مطابق وہ ہر سال دو دفعہ کراچی آیا کرتا تھا اور خبر تھی کے سارہ کی شادی کے لئے وہ آرہا تھا۔سارہ منجلی تھی جو آرٹس میں دو سال کا ڈپلوما کر رہی تھی، دانیال ان تینوں بھائی بھنوں میں سب سے چھوٹا تھا جو اپنے فرسٹ ایئر کے بورڈز کی تیّاریوں میں مصروف رہتا تھا۔

سارہ کی کچھ دنوں میں ہی شادی تھی، یہ اریجنڈ میرج تھی مگر سارہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔سارہ اور ارسلان کی منگنی کو تقریباً سال ہونے کو تھے مگر اب فروری میں انکی شادی ہونے کو تھی۔

گھر میں تیاریاں زور شور سے جاری تھیں، تقریباً روز ہی ان کے گھر میں ڈھولکی ہوتی۔ گھر میں اب جبکہ آفیشل مہندی ہونے کو تھی تو گھر میں بہت رونق تھی۔ مہمانوں کی آمد و رفت جاری رہتی، پورے خاندان میں ہلا گلا مچا ہوا تھا، خاندان میں کسی کی شادی وہ واحد ایونٹ ہوتا تھا جس میں تمام احباب پرانے گلے شکوے دور کر کے اپنے قریب کی خوشی میں شامل ہوتے تھے۔ ہر چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوتی۔

مگر کچھ وہ ہوتے تھے جو گلوں کو بھولتے نہیں تھے۔ جو بدلہ لیتے تھے کسی بھی حال میں، جن کے چہروں پر مسکراہٹ ہوتی تھی مگر دوغلی۔ جو دو چہرے لئے پھرتے تھے۔ جو ماحول میں بدمزگی پھیلاتے تھے، نظر لگاتے تھے، نظر بد۔ وہ نظر جو سب تباہ کر دیتی ہے۔ تمام خوشیوں کو راکھ کر دیتی ہے۔ اور نظر بد ان کو سب سے پہلے کھاتی ہے جو بے قدرے اور نہ شکرے ہوتے ہیں۔ جو گمراہی میں زندگی جی رہے ہوتے ہیں۔

آسمان بادلوں سے صاف، سورج کی ہلکی روشنی گرماہٹ پیدا کرنے میں ناکام تھی کیونکہ موسم کی ٹھنڈک اور شدید تیز چلتی ہوائیں یاد دلا دیتی تھیں کہ سردیاں ابھی گئی نہیں ہیں۔

طارق روڈ پر موجود ایک دکان میں کھڑے وہ دکاندار سے مخاطب تھے۔"بھائی آپکو تین ہفتے ہوگئے کپڑوں کا آرڈر دیے ہوئے، اپنے نہیں بنانا تو بتا دیں۔ہم کب سے روز خوار ہوتے ہیں یہاں آکے"۔سارہ دکاندار پر گرج رہی تھی۔وہ اپنے شادی کے جوڑے کو لے کر بحث کر رہی تھی جبکہ ایرج دکان میں ہی موجود ایک کرسی پہ بیٹھے کبھی سارہ کو دیکھتی کبھی دکاندار کو جو مسکین سی شکل بنائے سارہ سے چند دنوں کا اور وقت مانگ رہا تھا، وقفے وقفے سے وہ ہاتھ میں پکڑے اناناس کے جوس کا گھونٹ بھرتی اور ناک سے پھسلے چشمے کو واپس اپنی جگہ پر لاتی بڑے مزے سے ان کی لڑائی کو دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ دکان سے باہر تھے، سارہ کا منہ اب بھی پھولا ہوا تھا، شاید وہ تھوڑی دیر اور وہاں ٹھہرتے تو سارہ نے سچ میں ہی پھٹ جانا تھا۔ایرج نے حلاں کہ کچھ بھی نہ بولا، اس سے لڑائی نہیں ہوتی تھی۔اور سچ بات تھی کہ جتنا وقت انہوں نے ڈیزائنر کو دے دیا تھا، اس میں کپڑے آرام سے تیار ہو سکتے تھے، مگر آج ایرج بات نہیں کر پاتی کیونکہ آج دو ٹوک بات کرنے والی سارہ ہی تھی۔

ایرج ایسی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ معاف کر دیتی تھی، چاہے غلطی ہو یا نہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہر کسی کو ایک موقع دیا جانا چاہیے۔ مگر شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جتنے موقعے وہ ہر کسی کو دیتی تھی، اتنے موقعے میں کوئی بھی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا، ہر کوئی یہی سمجھتا ہوگا کے اسے موقعے ملتے رہیں گے اور وہ کچھ نہیں بولے گی، اور یہی ہوتا بھی تھا۔ وہ معاف کر دیتی تھی۔ اور دوسروں کی وجہ سے خود پریشان ہوتی تھی۔

ایرج آن لائن تو مقابلہ کر لیتی تھی۔ مگر وہ آمنے سامنے کے مقابلے سے کتراتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ دوسرا اس سے فیکٹس پر بات کرے گا اور وہ لاجواب رہ جائے گی، اس ہی وجہ سے وہ کبھی ٹرائے بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ لوگوں کو آسانی سے معاف کر دیتی تھی، کیونکہ وہ خود میں ڈرتی تھی اور سامنے والے کو فرشتہ سمجھ بیٹھتی تھی۔ وہ خود ہار مان دیتی تھی، تاکے اس پر سوال نہ اٹھ سکے، تاکہ اسے کسی کو فیس کرنا نا پڑے۔

انسان اس وقت ہار مان لیتا ہے جب اس کی جیت چند قدموں پر اسکے سامنے موجود ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمت کھو دیتا ہے، جس ہمت سے وہ اپنے لئے لڑ رہا ہوتا ہے وہ ہمت دنیا کی منفی سوچ سے کمزور پڑنے لگتی ہے اور ایک وقت آتا ہے جب انسان کے اندر وہ بچی کچی

ہمت اور لگن بھی ختم ہو جاتی ہے۔نہ صرف انسان ہمت کھوتا ہے بلکہ کسی خوشی اور کامیابی، کسی روشنی کے سہارے کی امید بھی نہیں بچتی۔امید ایک موم بتی کی طرح ہوتی ہے، جیسے انسان موم بتی جلاتا ہے اور ایک پھونک اس موم بتی کے ننھے سے شعلے کو بجھا دیتی ہے ویسے ہی امید بھی کمزور ہوتی ہے،جو دنیا کے اندھیرے اور لوگوں کی منفی سوچ کے تلے کہیں دب جاتی ہے اور انسان اس امید کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دیر کر دیتا ہے۔

اب کہ وہ دکان کے باہر تھے تو آسمان کے اوپر گلابی بادلوں کی ہلکی ہلکی سی لکیریں نمایاں تھیں جیسے کوئی راکٹ ابھی ابھی اڑ کے گیا ہو۔شام پرانی ہونے لگی تھی اور ایک نئ رات جلد نمودار ہونے کو تھی۔ابھی بھی ہوا میں وہی شدّت تھی۔

وہ دکان کے باہر کھڑے تھے،ان کے سامنے بہت سے ٹھیلوں کا ڈھیر لگا تھا۔ہر کوئی الگ الگ ٹھیلوں پر الگ الگ اشیاء بیچ رہا تھا۔کچھ پر جیولری نمایاں تھی اور کھانے کے ٹھیلوں میں چاٹ اور گول گپے پر سب سے زیادہ رش تھا۔شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور اتنے ہی تیزی سے طارق روڈ پر رش بڑھتا جا رہا تھا۔

طارق روڈ اس ہی لئے جانا پہچانا جاتا تھا۔ کراچی کے اکثر لوگ مہنگے کپڑے یہیں سے لیتے اور بنواتے تھے۔ ایک لمبی سی روڈ پر بے تحاشا دکانیں۔ یہ بات تو سچ تھی کے طارق روڈ رات کے پہر جایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس روڈ پر چونکہ بہت سی دکانیں تھیں تو رات کو رش بھی اتنا ہی ہوتا تھا (اتنا رش کے چلنے کی جگہ بھی بمشکل ملتی تھی)۔ کچھ دکاندار تو جان بوجھ کر اپنی دکان رات کے وقت ہی کھولتے تھے کیونکہ سورج کی روشنی ان کا زیادہ دھندھا نہیں کرواتی تھی۔ طارق روڈ اچھی خاصی وسعی اور چوڑی تھی مگر رات کے وقت لوگوں کی گاڑیاں اس روڈ کو بھی پتلی کر دیتی تھیں۔ اگر کراچی، جو روشنی کا شہر کہا جاتا تھا تو شاید طارق روڈ کی وجہ سے ہی، طارق روڈ اندھیرے میں اتنا روشن ہوتا تھا کہ اتنا پورا کراچی بھی ایک ساتھ نہ ہوتا ہوگا۔

سارہ اب الگ الگ ٹھیلوں پر جا جاکر چھوٹی موٹی چیزیں خرید رہی تھی جبکہ ایرج چاٹ کی دو پلیٹ تھامے سارہ کی طرف ہی آ رہی تھی۔

وہ دونوں جب بھی گھر سے باہر نکلتے، وہ پورا کراچی تو گھوم کہ آتے تھے۔ آج بھی انہیں صرف طارق روڈ ہی جانا تھا مگر ایرج کو تو رہ رہ کر کام یاد آتے تھے۔ اب بھی یہی ہوا تھا اور

اسکے دوپٹے کے لئے ان دونوں کو ابھی صدر کی زینب مارکٹ خوار ہونا تھا۔ان کا ارادہ تو مغرب سے پہلے گھر واپس جانے کا تھا مگر یہ ارادہ دور دور سے بھی پورا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔

سارہ اور ایرج گھر کے ان بچوں کی طرح تھے جن کی وجہ سے گھر میں رونق لگی رہتی تھی۔ وہی دونوں تھے جو گھر میں ہلا گلا لگائے رکھے تھے۔دونوں کزنز کم اور دوستیں زیادہ تھیں۔ان کی دوستی دیکھ کر لگتا تھا کہ پرانے وقت اب تک وہی جی رہے ہیں بس۔وہی اب تک ویسے تھے جیسے پہلے کزنز رہا کرتے تھے، مل جھل کر، بنا کسی دوری کے؟

گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دوسرے کے گھر رہنا، ہفتے میں ایک دن ایک دوسرے کے گھر جانا، موبائل سے بہت دور وہ پر سکون زندگی۔وہ بورڈ گیمز۔۔۔آج کا ٹین ایجر تو وہ سب بھول بھی گیا تھا۔اب تو مہینوں بعد ملاقات ہوتی اور وہ بھی موبائل پر ہی گزر جاتی۔ دوسروں سے حسد، الجھن اور ناراضی اتنی بڑھ گئی تھی کے اب دوسرے سے ملتے بھی تو کسی کے فورس کرنے پر۔

لوگ جوائنٹ فیملی سسٹم سے دور بھاگتے ہیں، مگر شاید کوئی سمجھ ہی نہیں پایا تھا کے جوائنٹ فیملی تو ہوتی ہی اپنوں کو باندھ کے رکھنے کے لئے تھی۔اپنوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کے رکھنے کے لئے تھی۔شاید یہی تھا مل جھل کر رہنے کا مقصد، کہ وہ نہ ہوتا جو اب ہو رہا تھا۔کہ فاصلے اور راستے دور نہ ہوتے جتنے اب تھے، نہ گھر کے نہ دل کے۔

صدر کا ماحول ہمیشہ کی طرح ویسا ہی تھا، بہت سے لوگ سڑکوں پر تھے، سب اپنے کام سے کام رکھتے، کچھ ڈھابے پر بیٹھے یاروں سے باتیں کرتے۔ادھر ادھر بھاگتے کھیلتے بچے۔ صدر شاید وہ واحد علاقہ تھا جہاں دن ہو یا رات، ماحول ایک سا ہی رہتا۔ایک شور تھا جو شور محسوس نہیں ہوتا تھا، وہاں لوگ بے جا چلاتے پھرتے نہیں تھے، بلکہ لوگ ہی اتنے زیادہ تھے کہ ان کی مدھم آواز بھی کانوں میں ہلکا پھلکا سا شور پیدا کرتی تھی۔

سورج اب اپنی تھوڑی سی جھلک دکھاتا نظر آرہا تھا جبکہ مغرب میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا، سردیوں کے دن ایسے گزر جاتے تھے کہ پتا بھی نہیں چلتا۔جو کہتے ہیں کے سردراتیں لمبی ہوتی ہیں، یہ سمجھ نہیں آتا تھا کے اگر لمبی رات ہوتی تھیں تو نیند اتنی ہی زیادہ کیوں آتی تھی

کیب سے اترتے اب وہ ڈرائیور سے بقیہ پیسے لے رہی تھی۔اترتے ساتھ ہی سرد ہوا کا ایک جھونکا ان کے گالوں پر تھپڑ کی مانند لگا تھا۔عین مقابل زینب مارکٹ تھی جس میں آج حیرت کن طور پر رش کم تھا۔

دونوں زینب مارکٹ کی طرف چل ہی رہے تھے کہ سارہ نے بیچارگی سی شکل بنائے کہا،

"یار پہلے ڈونٹ کھالیں؟قسم سے صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے بس اور شدید بھوک لگ رہی ہے"۔سارہ ایسی ہی تھی،ہر وقت اس کو بس کھانے کو مل جاتا تو جنّت ہے۔ایرج اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی تھی کے وہ کتنا کھاتی تھی مگر پھر بھی موٹی نہیں تھی۔

سارہ پہلے ڈوپٹا لے لو ورنہ تمہیں پتا ہے کے رش کتنا بڑھ جائے گا،اور ڈونٹ پیک کروا لیں گے نا"۔اسکا کھانے پینے کا فلحال کوئی موڈ نہیں تھا،اسے جلدی سے بس یہ کام نبٹانا تھا۔

بھوک ابھی لگ رہی ہے ڈونٹ بعد میں کھانے کا کیا فائدہ۔چلو بس پہلے ڈونٹ پھر خواری"۔وہ کہیں سے میچیور لگتی ہی نہیں تھی۔اس نے اپنا رخ اب موڑ لیا تھا جیسے اس کی بات پر ہی عمل کیا جانا تھا،کچھ قدم پر ایک کیفے نظر آرہا تھا جس کے سامنے شیشے کی

کھڑکی کہ پار نظر آتے ڈونٹ، کیک اور باقی چیزیں سارہ کی آنکھوں کو چمکا رہی تھیں۔

ایرج اب اسے گھورے گئی، اسے پتا تھا وہ سارہ سے کبھی بحث نہیں کر سکتی۔شاید کافی پینے سے اسکا سر درد کم ہو جائے، اس نے سوچا تھا۔

کیفے میں بیٹھے سارہ اب اپنے بال کو واپس باندھ رہی تھی، اسکے بال سلکی نہیں تھے اور انہیں سلکی بنانے کی چکّر میں وہ ہر ماہ ہزاروں اڑا دیتی تھی۔

میرے لئے ایک سمپل کافی بول دینا، اور جو تمہیں لینا ہے وہ لو اور جلدی کھا کر چلو"۔"

نہیں تھا مگر بے حد صاف ستر ا اور خوبصورت تھا۔ایک abstract کیفے زیادہ بڑا تو دیوار پر کسی نے ہاتھوں سے

پینٹ کیا تھا جس کو دیکھ کر سارہ پہلی نظر میں ہی متاثر ہوئی تھی، ایرج نے اس پر اتنا غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس کا سر ویسے ہی شدید درد کرنے لگا تھا۔کیفے میں تھوڑی بہت کرسیاں اور میز تھیں جو لکڑی سے بنی تھیں۔کارنر پر ایک آرڈر کاؤنٹر تھا جس پر جا کے آرڈر دینا اور لینا ہوتا تھا۔کیفے بہت لوگوں کے لئے نہیں بنایا گیا تھا مگر وہ چھوٹا مگر محنت سے بنایا گیا کیفے تھا۔

سارہ اٹھ کر آرڈر دینے جا چکی تھی، پیچھے ٹیبل پر اب وہ اکیلی رہ گئی تھی۔اسکے سامنے صدر کی سڑک کا پرانا سا منظر چل رہا تھا۔اس نے تھکاوٹ سے آنکھیں موند لیں۔دماغ میں بہت سی چیزیں سوار تھیں کہ ایک دم سے اسکی آنکھیں کھلیں۔

روڈ،خون،گاڑی۔

وہ اپنے سامنے، صدر کی اس سڑک پر ایک حادثہ دیکھتی ہے۔جس سڑک پر ابھی لوگوں کا رش لگا تھا،اب وہاں ایک عورت اوندھے منہ پڑی ہوئی ہے،اسکے سر سے بہنے والا خون اب پورے جسم کو سرخ کر گیا ہے۔ایک گاڑی ہے جس کی بتی جل رہی ہے،لوگوں میں شور سا ہے۔اب کہ بہت سے لوگوں نے اس عورت کو گھیر لیا ہے جس کا چہرہ اسکے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔کوئی اسکے چہرے سے بال ہٹاتا ہے۔

"ایرج، تمہاری کافی"۔ایک ہاتھ سے ٹرے پکڑے وہ ایرج کی طرف اسکی کافی بڑھاتی ہے،اسکی خود کی ٹرے میں دو ڈونٹز تھے۔

ایرج اب اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔چہرہ سفید، آنکھیں جیسے قبول نہ کر پا رہی ہوں کے جو اسنے دیکھا وہ حقیقت تھا یا خواب۔

تم۔۔۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا سارہ؟"۔"""

اس منظر کو ہم یہیں روک دیتے ہیں، ان دونوں سے ہم دوبارہ ملیں گے، مگر ایک وقفے کے بعد۔ ابھی ہم جانتے ہیں کہانی کو ایک دوسرے رخ سے، ایک نئے زاویے سے!

☆☆☆☆☆☆

سیٹ پر میرے برابر بیٹھا شخص ویپ پی رہا تھا، مجھے اس کے ویپ سے کوئی مسلہ نہیں تھا، اسکی زندگی تھی جو کرتا پھرے، مگر یہاں بس ایک مسلہ تھا کہ وہ ویپ پی تو رہا تھا، مگر تین مرتبہ میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ویپ کا دھواں میری طرف خارج کر رہا تھا۔ شاید شو آف کے لیے؟ یقیناً شو آف کے لیے۔ اس نے ویپ بھی الگ طریقے سے تھاما ہوا تھا جس سے اسکا برانڈ نظر آتا ہو۔

کوکو"۔ ویپ کی دنیا میں ایک مشہور کینسر۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ لوگوں کے پاس" کینسر سے جان

چھڑانے کے پیسے نہیں ہیں اور یہاں سولہ سترہ سال کے so called

پاکستان کا مستقبل "خوشی خوشی اپنے باپ کا تمام پیسہ کینسر کو خرید کر بس کول بننے کے" لیے اس کو خود سے جوڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔

میرے ساتھ بیٹھا وہ شخص ابھی بھی بے نیازی سے دھواں اڑا رہا تھا۔گلے میں چین اور ساتھ ساتھ ہیڈ فون کا تار جو اس کے فون سے جڑا ہوا تھا، سبز رنگ کی چیک شرٹ اور بلیک جینس میں ملبوس میرے برابر بیٹھا وہ لڑکا کم عمر ہی لگتا تھا۔ابھی بھی بے پرواہ وہ ویپ کا دھواں اڑا رہا تھا۔

اپنے چہرے کو میں نے اسکی طرف موڑ لیا مگر کچھ بولا نہیں، بس اسے دیکھتے گیا۔

کچھ لمحوں میں جب اسے احساس ہوا کے میں اسکی طرف دیکھ رہا ہوں، وہ بھی مجھے نا سمجھی سے دیکھنے لگا، اب وہ ہیڈ فون کو اپنے کانوں سے جدا کر رہا تھا۔

کوئی کام ہے ؟"۔اسکے چہرے پر ناگواری تھی۔

" جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ (P65) پی سکسٹی فائو"

بہت آہستہ سے میں اس کے کان کے قریب گیا اور اس کے کان میں قدرے بن بناہٹ کی۔

ہاں۔۔۔تو؟"اگر تم یہ کہہ رہے ہو کے اس ویپ میں وہ ہے، تو اس میں وہ نہیں ہے"۔"
جس انداز میں اسنے جواب دیا اس سے صاف واضح ہوتا تھا کے ویپ پر کسی اور نے بھی اسکو لیکچر دیا ہے۔

اب میں پیچھے کو ہوا، مگر ابھی بھی میں اسے ہی دیکھ رہا تھا، اسکے چہرے پر نیم غصّہ تاری تھا۔
"نہیں۔۔۔میں نے یہ تو نہیں کہا کے تمہارے ویپ میں پی سکسٹی فائیو ہے، شاید نہ ہو۔۔۔ مگر تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کے تمہارے والد صاحب کے ویپ میں ضرور تھا"۔

وہ ویپ نہیں۔۔۔۔"۔وہ کہتے کہتے رکا۔اور جب تک وہ میری بات کو سمجھا میں سیٹ" سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔وہ میرے پیچھے گالیوں میں چلاتا رہا تھا۔ مگر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، مجھے لگا تھا کہ وہ پیچھے سے آکر میرا گریبان پکڑے گا، اور میں اس کے لئے تیار بھی تھا۔ مگر ایسا ہوا ہی نہیں۔میں نے پیچھے مڑ کہ تو نہیں دیکھا مگر اسکی آنا ہرٹ نا ہونے اور اسکا جذباتی نا ہونے نے مجھے تھوڑا سا حیران تو کیا تھا۔

میں اب چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا گرین بس کی طرف چل دیا تھا، وہ سیٹ اور وہ لڑکا میری مرکزِ نگاہ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

گرین بس کا دروازہ دوسری طرف کا منظر واضح کرتا تھا جہاں اب گرین بس لمحہ بالمحہ رکتی جا رہی تھی۔ دروازے کی طرف لوگوں کا اب ایک ہجوم سا لگ گیا تھا جو دروازہ کھلنے کے منتظر تھے۔ میں بھی اب ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا، جب بس تمام رک گئی تو سلائڈ ڈور کھلتے گئے۔ پہلے بس کے اندر سے کچھ مسافر نکلے اور پھر آہستہ آہستہ بس پھر سے بھرنے لگی۔

اپنے قدم رکھتے میں بھی سوار ہونے لگا تھا کے میرے قدم ہوا میں ہی ٹھٹک کر منجمد رہ گئے۔ ایک لمحے پہلے میرا ہاتھ میری جیب پر پڑا، اور دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری جیب سے وہ گم ہے۔ دروازہ اب بھی کھلا رہا، مکمل طور پر جب میں بس میں چڑھ گیا تو وہ دروازے ویسے ہی بند ہونے لگے جیسے کھلے تھے۔ اب کی بار میں نے واپس سے

اپنی جیب کو چیک کیا۔ موبائل، والٹ، چھبیاں، گرین لائن کا کارڈ۔۔۔سب وہاں ہی تھا، مگر سب سے اہم چیز میری جیب سے غائب تھی۔

" پھر سے نہیں یار!"۔

گرین بس آج زیادہ بھری ہوئی نہ تھی، بہت سی خالی کرسیوں میں سے ایک پر میں تقریباً گرتے گرتے بیٹھا اور برابر والی کرسی پر اپنا بیگ اچھال دیا۔

میری منزل نمائش تھی،اور مسلہ یہ نہیں تھا کے مجھے اس گھڑی ڈھونڈنے کے لئے اب خواری کرنی ہوگی، مگر مسلہ وہ تماشا تھا جو وہ گھڑی مجھ سے کروانے والی تھی۔ایک انتظار کا عرصہ کاٹنا تھا مجھے اور پھر وہ گھڑی مجھے اطلاح (حکم) دے گی۔ مجھ سے امید کرے گی کہ میں پھر سے ایک سیویئر بنوں گا، میں پھر مصیبت سے کسی کو نکالوں گا۔وہ گھڑی آج مجھے کسی کی جان سونپے گی،اور اسکی امید میں دھول کی طرح پھونک مار کے اڑا دوں گا۔ مجھ سے لگائی گئی امید آج پھر مدہم ہو جائے گی۔اور میں اس امید کے ٹوٹ جانے کا انتظار کرتا رہوں گا۔

سیٹ سے ٹیک لگائے میں نے آنکھیں موند لیں،ایک لمبا سانس خارج کیا اور اب انتظار کی گھڑی آہستہ آہستہ شروع ہوتی گئی۔

وہ گھڑی کہاں تھی؟کس کے پاس تھی؟جس کے پاس تھی کیا اسے معلوم تھا کہ اسکے ساتھ کیا ہوگا؟آج کون سی سڑک یاقوت کے رنگ میں بھیگے گی؟آج کون اپنی سانسوں کی جڑ سے اکھاڑا جائے گا۔۔۔ایک جرح سے، محض ایک جرح سے کون اپنی جان کھوے گا؟

کیا وہ کوئی بچہ ہوگا؟کوئی لڑکا۔۔۔یا کوئی لڑکی؟

ایک انبار تھا سوالوں کا جو میرے ذہن کو اور الجھاتا جا رہا تھا۔آج کوئی اس دنیا کے رازوں میں شامل اور فلک کے نیچے فنا ہونے جا رہا تھا، مگر دکھ نہ تھا۔دکھ کا ایک ذرہ بھی میرے دل کو ملال پر مائل نا کر پایا تھا۔البتہ میں خوش تھا۔کیا تھا میرے دل میں جو مجھے پتھر کر رہا تھا،میں خود گمان میں تھا۔شاید دنیا سے ایک دشمن کم ہونے کو تھا؟شاید آج وہ پودا مرجھانے والا تھا جو اپنے کانٹوں سے دوسروں کو تکلیف دیتا تھا؟شاید آج وہ مرنے والا تھا جو زندگی جینے کا حق نہیں رکھتا ہو؟

تسلی ہی تھی جو دل کو بہلائے رکھی تھی، بے خبری ہی تھی جو ڈر سے بچائے رکھی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

"وہ۔۔۔حادثہ؟ تم نے نہیں دیکھا؟ میں سچ کہہ رہی ہوں، میرے سامنے ایک حادثہ پیش آیا تھا سارہ، ابھی ابھی جب تم آرڈر لینے گئی تھی"۔وہ صدر کی قدیم سڑک پر موجود ایک انتہا کے ہجوم کو اشارے کے حصار میں لائے کہہ رہی تھی۔

"میں نے خود دیکھا تھا کہ ایک عورت گاڑی سے ٹکرا کر دور پھنکا گئی۔اسکے سر سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔۔۔اور پھر۔۔۔اور پھر تم نے مجھے ٹوک دیا اور وہ منظر اچانک گم ہو گیا۔ایسے جیسے خواب ہو، مگر کوئی انسان جاگتی آنکھوں سے خواب کیسے دیکھ سکتا ہے سارہ؟"۔

☆☆☆☆☆☆

نمائش کے سٹیشن کی کال سے میری آنکھیں ٹھک سے کھلی۔

خواب ختم، حقیقت سامنے۔

بس کا دروازہ "سس" کی آواز سے کھلتا گیا اور مسافر ایک ایک کر کے باہر کی طرف نکلتے رہے۔

وہی خواب، وہی خواب مجھے واپس دکھائی دیا تھا جو پہلی مرتبہ دکھا تھا۔ بلکل وہی منظر تھا۔ مگر جو مجھے الگ محسوس ہوا تھا وہ ماحول تھا، وہ ماحول وہ سڑک، وہ لوگ الگ تھے۔ سب بلکل پہلے جیسے تھا مگر جو ایک جیسا نا تھا، اسے بوجھنے میں مجھے زیادہ وقفہ نا لگا۔ اس سڑک اور ماحول کو جان جانا کتنا آسان تھا۔ جن پردوں نے مجھے میرے ماضی کی دھوپ سے بچائے رکھا تھا، آج ایک خواب نے اس مخملی پردے کو چیر پھاڑ دیا تھا، اور میرے حصّے کی دھوپ پھر سے میرے سر پر چنگھاڑ رہی تھی۔

اپنا کارڈ سکین کرتے اب میں اسٹیشن کے باہر تھا۔ حالاں کہ میری منزل نمائش تھی مگر میں پہلے ادھر جانا چاہتا تھا، اپنی بچپن کی سڑکوں پہ، جسکا مجھے پتا تھا کے وہاں آج بھی ویسا ہی سماں ہونا تھا جیسا پہلے رہ چکا تھا۔

برتج پر کھڑے میں آسمان سے سورج ڈھلتے واضح دیکھ پا رہا تھا۔

مجھے اب صدر کی سڑکوں پر اپنی امانت کو خود تلاش کرنا تھا۔ایک تماشا تھا جو جھیلنا تھا۔ ایک زندگی کو بکھرتے دیکھنا تھا۔

جنوری کی شام آج اتنی ٹھنڈی نہیں تھی جتنی پچھلے دنوں رہ چکی تھی، کم از کم جیکٹ تن کرنے والی سردی نا تھی۔

پیٹ پہ جھولتے بیگ کو اب میں نے تھام کر اس میں سے پانی کی بوتل نکالی اور کچھ سانسوں میں ہی بوتل میں بچا پانی اب قطرے برابر تھا۔ نمائش سے صدر تک کا فاصلہ زیادہ نا تھا مگر پھر بھی میں نے ایک رکشا لیا اور سفر صدر کی گلیوں تک چلتا نظر آیا۔

رکشا رک گیا اور صدر کا ایک مشہور حصّہ اب سامنے تھا۔پیسے رکشا ڈرائیور کو تھاماتے میں اس سڑک پر کچھ منٹ کے لئے کھڑا رہا۔ ہر طرف رخ موڑنے پر بھی ایک ہی منظر سامنے آتا تھا۔ ہر جگہ لوگ تھے۔ سامنے زینب مارکٹ تھی۔

"اتنی بھی ہمّت نہیں ہے مجھ میں کہ میں اسے ڈھونڈنے کے لئے یہاں قدم بھی رکھوں۔"

صدر مارکٹ کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو، اتنے لوگوں سے گھٹن لازمی ہوتی تھی۔ اتنا تو پتا تھا کے گھڑی مارکٹ کے اندر نہیں ہوگی۔ اور اگر ہوگی بھی تو میں ہار مانتا ہوں۔

الگ الگ جگاہوں سے الگ الگ خوشبو آرہی تھیں۔ کہیں سے کپڑوں کی، کہیں سے کھانوں کی، کہیں سے عطر اور پرفیوم کی، مگر جو سب سے الگ اور سب سے منفرد خوشبو تھی، وہ خوشبو خون کی تھی، جو قصائی کے ذباح کردہ جانوروں سے تازہ تازہ آرہی تھی۔ خون کی نالیان پھٹ جانے کی صورت قصائی کا کپڑا اب سفید سے لال میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مرغی آہستہ آہستہ اپنے پنجے ہلانا چھوڑ چکی تھی، تڑپاہٹ سے وہ اب اپنی جان کھو چکی تھی۔ اور آزادی کی خواہش خواب کی صورت دل وہ دماغ میں ہی قید رہ گئی تھی۔

مجھے پتا ہی نہیں چل پا رہا تھا کہ میں اسے کہاں ڈھونڈھوں۔ اندھوں کی طرح ادھر ادھر پھرنے کا فائدہ رائیگاں ہی جانا تھا تو میں ٹھیرا رہا۔ اور میں نے سوچنے کی کوشش کی۔

اتنا تو پتا تھا کہ وہ گھڑی اسی سڑک پر موجود ہے، اور اس سڑک پر ایک طرف ایک حد درجے کی زینب مارکٹ تھی، اسکے مقابل دو تین کھلے کیفے بنے تھے۔ مجھے اندازہ تو تھا

کہ گھڑی اتنی بڑی عمارت میں ڈھونڈنا مشکل تھا، دوسرا راستہ بچتا تھا کہ میں کیفے کا جائزہ لوں۔

اس گھڑی کے لئے میں خوار ہو رہا تھا مگر کیوں ہو رہا تھا یہ مجھے خود بھی نہیں پتا تھا، فلحال اس وقت تو نہیں۔

رخ موڑے اب میری نظریں سامنے تین چھوٹے چھوٹے کیفیز پر مرکوز تھیں۔

تین کیفے تھے جن میں سے دو تو کیفے کم ڈھابہ زیادہ لگتے تھے، کھلی کھلی کرسیاں ایک دوسرے سے جام ہوئی لگتی تھیں۔ان دو کیفے میں لوگوں کی تعداد زیادہ تھی، جو تیسرا کیفے بھورے رنگ تھا wooden تھا، وہ کیفے لگتا تھا، باہر سے ٹیکسٹرا سے ایک بیکری شاپ کی شکل میں ڈھالتا تھا۔سامنے کی طرف شیشہ لگا تھا جس سے اندر کا کیفے اور لوگ صاف دکھائی دیتے تھے۔اندر زیادہ کرسیاں اور ٹیبلز نہیں تھیں جو اس کیفے کو اور سمپل مگر خوبصورت بناتی تھیں۔وہ صاف ستھرا، چھوٹا سا کیفے تھا جو دیکھنے میں لگتا تھا کہ نیا کھلا ہے۔

میں نے دور سے اندر جھانکا تو نظر آتا تھا کہ اس کیفے میں زیادہ لوگ نہ تھے۔میں نے قدم بڑھادیئے۔حالاں کہ مجھے امید نہیں تھی کہ وہاں میری تلاش مکمل ہو جائے گی۔میں سامنے تھا اور اب اندر کا منظر اور زیادہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔اندر صرف دو تین لوگ ہی موجود تھے اور اسے ڈھونڈنے میں مشکل ہوئی ہی نہیں،ذرا سی بھی نہیں۔

شیشے سے سر ٹکائے،اسکا چہرہ واضح نہ تھا حتیٰ کہ بڑے بڑے چشمے دکھائی دیتے تھے،میری نظر اس سے ہٹ چکی تھی۔اور اب اس چیز پر جا ٹکی تھی جو سب سے زیادہ واضح تھی۔

جہاں وہ بیٹھی تھی اسکے ہی برابر تقریباً بلکل کارنر پہ وہ گھڑی پڑی تھی۔اب بھی اسکا رنگ ویسا ہی تھا،قدیم سا سنہیرہ رنگ جو چمکتا نہیں تھا۔ایک سانس بحال ہوا اور میں چل دیا۔ میرا کام تو ہو گیا تھا،جو مجھے حاصل کرنا تھا وہ میرے چند قدموں پر تھا۔میں زمین پر قدم دھرتے چلتا گیا یہاں تک کہ سڑک پیچھے رہ گئی اور اب سب نہایت واضح ہو گیا،وہ گھڑی واضح ہو گئی،تمام منظر واضح ہو گیا۔

کیفے کا دروازہ ایک چڑ کرتی ہوئی آواز سے کھلتا گیا،مگر میرے ذہن پر ایک سایہ سا لہرایا، ایک بات یاد آئی۔

"ایک زندگی جو تمام ہو جائے گی، کیا تم بچاؤ گے ایک جان کو؟ کیا نبھاؤ گے تم وعدہ اپنا، باخبر حیوان؟"

وہ گھڑی اس میز پر اب بھی ساکت سی پڑی تھی، میں کیفے کے اندر داخل ہو چکا تھا مگر وہ ایک فاصلے پر موجود تھے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ کیا اسے علم ہے کہ اس کے پاس اسکی جان کا ایک ثبوت موجود ہے۔ میں اب قدموں کو حرکت میں لاتے ان کے قریب جا رہا تھا۔

"کیا ہر کسی کا ہوتا ہے کوئی دشمن؟ کیا لازمی ہوتا ہے کہ کوئی دشمن پالتا ہو؟ کیا کوئی نہیں ہوتا جو نور کی روشنی سے چمکتا ہو؟"

اب میں اسکے چند فاصلوں پر تھا، کہ ایسے میں اسے دیکھ پا رہا تھا، وہ شیشے کے پار سڑک کو تاک رہی تھی۔ میری نظر پہلے اس گھڑی پر گئی، اور پھر اس پر۔ اسکے بال اسکا چھوٹا سا چہرہ کافی حد تک چھپا دیتے تھے، آنکھوں پر وہی چشمے تھے جن کی جھلک میں نے کیفے کے باہر سڑک پر کھڑے دیکھی تھی، میری نظر اس سے ہٹ چکی تھی، اب واپس گھڑی پر تھی۔ کچھ لمحوں بعد اس گھڑی کا منظر ایک لڑکی بلاک کر دیتی ہے، اب گھڑی چھپ چکی تھی کہ اب وہ اسکے سامنے آ بیٹھی تھی۔ وہ اس سے مخاطب ہو چکی تھی۔

بس چند قدموں کا سفر تھا اور میں انکے سامنے تھا۔ جو دوسری لڑکی بعد میں آکر بیٹھی تھی اس نے ہی سب سے پہلے مجھے گھورا، مگر میں نے اسکی طرف دیکھا ہی نہیں۔ میری نظر ایک لمحہ گھڑی پر ہوتی اور دوسرے لمحے اس پر جو اب اپنا چہرہ موڑے مجھے دیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

"ایکس کیوزمی، میری گھڑی"۔ اس کی آواز ماسک کی وجہ سے دب گئی تھی۔ وہ سمجھ ناپائی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

سوری؟"۔ وہ ابھی بھی اس وژن کے بارے میں سوچ رہی تھی، یا شاید وہ اسکی بات کو پروسس نہیں کرپائی تھی۔

میں اپنی گھڑی بھول گیا تھا، وہ وہاں رکھی ہوئی ہے، وہ دے دیں"۔

☆☆☆☆☆☆

وہ گھڑی اٹھا رہی تھی۔اور وہ چند لمحے ایسے لگے تھے کہ گزر ہی نہ رہے ہوں۔وہ گھڑی مجھے تھما دیتی اور میں چلا جاتا، یہی تو سوچا تھا میں نے، مگر کیوں پھر میرا ذہن جم گیا تھا۔میں کیوں وہیں کھڑا رہا تھا۔

آج پہلی بار۔۔۔پہلی بار احساس ہوا تھا کے کچھ لوگوں کے دشمن نہیں ہوا کرتے،اور جو ان کے دشمن ہوتے ہیں وہ حاسد ہوتے ہیں۔آج احساس ہوا تھا کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو گواہوں کی ضرورت نہیں ہوتی،کچھ لوگوں کا چہرہ ہی ان کے لئے گواہی دیتا تھا۔ان میں سے شاید وہ بھی ایک تھی۔اس چہرے پر نا سمجھی تھی،بے خبر savior ہوتے ہیں نہ جیسے،وہ ندامت نہیں تھی۔لگا تھا کہ آج

نہیں بنا تو لوگوں کا حسد جیت جائے گا۔آج مجھے لگا کہ میں نے کچھ نہیں کیا تو دنیا سے وہ فنا ہو جائے گا جو اس دنیا میں جینے کا حق رکھتا ہے۔

میرے ہاتھوں پر ایک وزن آ گرا تھا۔بے دھانی میں،میں نے گھڑی تھام بھی لی تھی۔اسکا اور میرا سامنا یہاں تک ہی تھا،ہونا چاہیے تھا۔مگر میرے قدم جنبشِ نہیں کر پائے،مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔اپنے ہاتھوں کو ایک نظر دیکھا۔وہاں آج بھی وہی خون کے دھبے

تھے جو پچھلی بار بھی موجود تھے،اب بھی راضی تھے۔وہ گھڑی پھر سے وہی مطالبہ کر رہی تھی،وہ چیخ رہی تھی، کہہ رہی تھی کہ میں زندگی کو پناہ دوں۔

"Be careful"

میرے لب جو بات کہتے گئے وہ مجھے میرے ہی الفاظ نہیں لگے۔اور اب میری ذات ہی تھی بس جو وہاں رہ گئی تھی۔میرا دماغ، میرا دل، وہ منظر کشی کر رہا تھا جو کچھ لمحوں بعد صدر کی اس سڑک پر ہونا تھا۔

میں واپس اپنے قدموں میں آیا اور وہ اب مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ایک اور جملہ میرے حلق میں رہ گیا،اور دماغ تو پھر سوچتا ہی ہے سب سے جلدی ہے۔

" تم ایک creep ہو ارمغان"

"تم ایک لوزر ہو، وہی رہو گے"

"We are ashamed that you're our son"

میرا رخ مڑ گیا، گھٹن، سوکھا گلا، زر جیسے من من کا ہو گیا ہو اور دل جیسے دلدل کے گھوارے میں ہو۔

"میں بھی تھا جس کا کوئی دشمن نہیں تھا، میں نے تو کوئی دشمنی نہیں پالی تھی، پھر اپنی زندگی کے پندرہ سال میں نے پکارا تھا اپنوں کو، مگر وہ بھی تو مجھے چھوڑ گئے تھے، جیسے میں قبر میں دفنائی لاش ہو گیا ہوں ان کے لئے، کوئی کسی کا دشمن نہیں ہوتا، بس دل کا بغض ہوتا ہے جو دلوں کو کالا کر دیتا ہے۔"

کہیں دور سے آتی ہلکی ہلکی اذان کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ مغرب کا وقت ہونے کو تھا۔ سورج کی روشنی مدھم ہوتی گئی، ایک اور شام پرانی ہو چکی تھی۔ کیفے کا دروازہ کھولے میں اب بس چل رہا تھا، جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا یا ماحول سرد ہو گیا تھا پتا نہ چل سکا۔ سڑک پر رش اب کم ہو چکا تھا اور گلیوں کی بتیاں آہستہ آہستہ روشن ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ سڑک کے کنارے کھڑے میں نے ایک آخری نظر اس شیشے کے پار ڈالی، وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی، حیران آنکھیں لئے وہ اٹھ رہے تھے، اور اب ہونے والا آگے کا ہر ایک منظر جیسے ذہن پر چھپ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

"ایرج۔۔۔تمہاری انگلیوں پر خون لگا ہوا ہے۔"

سارہ آنکھیں پھاڑے اب اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی، ڈونٹ کو وہ اب بھول چکی تھی۔اسکا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی ہے، ہاتھ کی تین انگلیوں پر خون لگا ہوا تھا جو کافی کے کپ پر بھی چھپ چکا تھا۔کچھ حد تک خون سوکھ چکا تھا جو شاید اسے محسوس ہی نہیں ہوا تھا، وہ حیران تھی ہے اسے اندازہ کیسے نہیں ہوا۔

"یہ خون کہاں سے آیا ہے ایرج؟ کوئی کٹ لگا ہے تمھیں کیا؟"۔سارہ کے چہرے پر فکرمندی در آئی تھی جبکہ وہ ساکن سی اپنے ہاتھوں کو دیکھتے دیکھتے اس سڑک پر موجود اسی شخص کو دیکھے گئی، وہ جو چند لمحوں پہلے یہاں تھا اب سڑک پار وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا

"سارہ۔۔۔وہ وژن جھوٹ۔۔۔"۔

" ایرج تم پھر سے hallucinate "

کرنے لگ گئی ہو؟ ایرج اب ہم ڈاکٹر سے کنسلٹ کریں گے، کوئی نہیں سنوں گی اب میں۔۔۔۔"

"سارہ۔۔۔اٹھو جلدی،اسے روکنا ہے۔"

سارہ کی بات آدھی ہی رہ گئی۔دونوں کرسی سے اتنی جلدی اٹھے کہ کرسی لڑکھڑا گئی۔ تقریباً بھاگتے ہوئے وہ کیفے سے باہر کو نکلے تھے۔

پیچھے اس ٹیبل پر کچھ سامان ابھی بھی ویسے ہی پڑا رہ گیا تھا،آدھا کھایا ہوا ایک ڈونٹ،اوریو شیک اور وہ کافی کا کپ جس پر ابھی بھی خون کے نشان واضح تھے۔

☆☆☆☆☆☆

کوئی میرے پیچھے تھا،مجھے محسوس ہو گیا تھا،شاید اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ کون ہے۔

☆☆☆☆☆☆

سڑک بے دھیانی میں پار کرتے وہ بے جا اسکے پیچھے چل رہی تھی،اسکے قدموں کی چاپ تیز تھی۔سارہ کہیں پیچھے رہ گئی تھی،شاید اس نے روڈ پار نہیں کی تھی۔اسکا ذہن اس وژن،گھڑی،خون اور اس شخص کے حصار میں تھا جو اب اس سے تھوڑے فاصلے پر اسی رفتار سے چل رہا تھا جس رفتار سے وہ۔

☆☆☆☆☆☆

پیچھے گردن موڑنے سے قاصر تھا، مگر ایک آہٹ تھی جو کانوں میں اتنے شور کے باوجود گونج رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

وہ ابھی سڑک کے دوسرے پار تھی کے ایک چیخ اسے سنائی دی، ایک پل کے لئے سب تھم سا گیا، سارا شور ساکن ہو گیا، تمام آوازین بند ہو گئیں۔ ایک لمحہ سب ویسا ہی رہا، جو جلد گزر گیا۔ پہلے سے زیادہ شور، گاڑی کے ہارن، سب اب تیز طرار ہو گیا، مگر وہ لمحہ جو ساکن تھا، وہ دماغ، دل، جسم۔۔۔ ہر جگہ قید ہو گیا۔ ایک سانس کی مانند وہ لمحہ ایک زندگی کے مقابلے بے حد طویل ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

تمام طرف شور تھا، سب سے زیادہ شور گاڑی کا ہارن پیدا کر رہے تھے۔ "کیا سب ہو چکا تھا؟"۔ وہ آہٹ اب نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے کانوں میں گونج رہی تھی، وہ آہٹ سماں کے شور میں دبتی گئی۔ اب بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ راستہ ترک ہو گیا تھا، وہ سڑک وہیں رہ

گئی تھی، وہ بھی وہیں رہ گئی تھی۔ ایک کہانی بھی اس سڑک پر تمام ہو گئی تھی، جس کو تحریر میں نے کیا تھا، میرے ہاتھ میں موجود بے جان شے نے کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

وہ دور جا چکا تھا، وہ وہیں کھڑی رہی تھی۔ لوگ اسکے عقب سے گزرتے پیچھے کے منظر میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ کیا ہوا تھا اسکی آنکھوں کے پیچھے؟ ایسا کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ایک گہما گہمی ہر سو پھیلی محسوس ہوئی تھی۔ وہ پیچھے پلٹتی ہے، لوگوں نے کسی چیز کو گھیرا ہوا ہے۔ گاڑی کی لائٹ قدرے تیز ہیں جو اس طرف دیکھنا دشوار کر رہی ہیں۔ ایک گاڑی ہے جس کا ہارن مسلسل بج رہا ہے، اس گاڑی کے سامنے والے حصّے پر خون کے تازہ چھینٹے ہیں، لوگوں کی آواز مدھم ہوتی جا رہی ہے،

اللہ ّہو اکبر اللہ ّہو اکبر۔۔۔

مغرب کی اذان ان تمام آواز کی شدّت کم کر رہی ہے۔ آسمان اب گلابی ہو گیا ہے، اور عرش سرخ۔

ہکابکا سی نظروں سے وہ سارے میں اسے تلاش کرتی ہے۔ سڑک کے دوسری طرف بھی وہ نہیں ہے، وہ اسکی نظروں کے پیچھے رہ گئی تھی، مگر اب وہ کہاں تھی؟

"سارہ۔۔۔" آواز تقریباً گلے میں پھندا ثابت ہوئی۔ بے جان قدموں سے وہ اس ہجوم کی طرف بڑھ دی۔

☆☆☆☆☆☆

چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی نکال کر میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ پہلے نیٹ کا دروازہ، پھر اصل لکڑی کا۔

گھر نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، واحد روشنی جو گھر کو کچھ حد تک روشن کیے ہوئے تھی وہ مغرب کے بعد کے بادل تھے۔ میں قدم بڑھاتے اندر آیا اور پیچھے گھر کا دروازہ بند ہوتا گیا۔ ایک سوئچ سے گھر کی راہداری روشن ہوئی جو گھر کا ایک چھوٹا سا کمرہ اور لاونج بھی نمایاں کرتی گئی، میں نے اور کوئی لائٹ نہیں جلائی اور کمرے میں آکر بستر پر گر گیا۔ جیب سے گھڑی نکالی، اس پر موجود خون اب سوکھ چکا تھا، ایسا لگتا ہو کہ وہ سرخ رنگ بھی گھڑی

کے رنگ کا حصّہ ہو۔گھڑی اپنے برابر اچھال دی، آنکھوں پر ٹکا ہوا چشمہ چہرے سے جدا کر کے فولڈ کیا۔اب میری آنکھیں اس ہی کو دیکھ رہی تھیں۔

میں کسی کا savior

کیوں بنوں گا؟ ہر کوئی اپنا savior

خود ہوتا ہے"۔اس گھڑی کو دیکھے تلخ

مسکراہٹ سے کہا جیسے اس بے جان کو ہی کہہ رہا ہوں۔

پھر اپنا بدلہ بھی تم خود لیتے ارمغان، تم نے پھر کیوں کسی کا سہارا چاہا، کیوں کسی کی مدد" پندرہ سال تم نے اپنوں کو پکارتے گزار دی۔تم بھی اپنے savior مانگی۔زندگی کے خود تھے ارمغان، پھر تم نے اپنے لیے خود کیوں نہیں لڑا؟"۔

وہ سوچ نہیں تھی میری، وہ جواب تھا اسکا، دھک سے میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔میرے ذہن کی بات نہیں تھی یہ۔یہ اس بے جان گھڑی کا جواب تھا جو بظاہر خاموش تھی، مگر میرے دماغ سے جا ملی وہ ایک بات کہہ گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

جرح

قسط نمبر دوم

ذکریاتً جیدہ

ٹریگر وارنگ

مذکورہ قسط میں کچھ ٹریگرنگ سینز ہیں۔اگر آپ کو ٹارچر اور خون جیسی چیزیں پڑھنا ٹھیک نہیں لگتا تو براہ مہربانی کچھ سطر کو اسکپ کر دیں۔ شکریہ۔۔۔

جرح

قسط نمبر دوم

ذکریاتؔ جیدہ

ہم ساتھ رہیں گے

ہر لمحہ ساتھ رہیں گے

اور اگر موت جدا کرتی ہے

ہم دونوں کو، اس ساتھ کو

تو تم وعدہ کرو

کہ تم راکھ کر دو گے

جس نے ہمیں الگ کیا

تمہاری زندگی۔۔۔

اور تمہاری موت

میری لکیروں میں قید ہیں

اور تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں

تم جو کام کرتے ہو

اسے محبّت کے سپرد نہ کرو

کیونکہ تم جانتے ہو

کہ محض وہ محبّت

بس ہے ایک فریب

بس ہے ایک کھیل

☆=☆=☆

میں دھک سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔اس سنہری گھڑی کو اٹھایا۔اور پھر ایک دفعہ اس کو صحیح سے دیکھا۔وہ خون اب سوکھ چکا تھا اور دور سے دیکھنے پر زنگ آلود لگتا تھا۔اسکی چین سے اسے تھامے میں کمرے سے باہر آیا۔اب کے گھر بلکل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔باہر آسمان اب سیاہ ہو چکا تھا جس پر غور کرنے سے باریک تارے بھی دکھ جاتے۔آسمان پر سجے بادل آتے جاتے چاند کی روشنی کو چھپا دیتے۔ایک لمحے ہر طرف اندھیرہ پھیل جاتا اور وقفے کے بعد بادل چاند سے ہٹتے چاند نمایاں کرتے۔ پورے شہر پر پھر سے چاند کی روشنی طاری ہو جاتی۔

میں کمرے سے باہر آیا۔ میرے کمرے کے سامنے لاؤنج کھلتا تھا۔ اسکے ساتھ جڑا ایک کمرہ نما کچن بھی اندھیرے میں گم تھا۔ میں چلتے کچن کے برابر بالکنی میں آیا۔ ادھ کھلا پردہ اب کہ پورا کھولا تو سامنے شہر روشن تھا۔ ہر ایک مکان کی جلتی بتیاں اوپر سے چھوٹے چھوٹے جگمگاتے ستارے لگتی تھیں۔ دور کہیں سڑک پر گاڑیوں کی آمد ورفت جاری تھی۔ بالکنی سے ایک بٹن جلایا تو میرا گھر بھی ان روشن مکانوں میں شامل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ گھر کی ہر ایک بتی جلتی گئی، گھر تاریکی کے عالم سے نکلتا گیا۔ واپس کمرے میں آیا تو واحد وہی جگہ تھی جو اب بھی اندھیر تھی۔ ایک بٹن آن کیا تو کمرہ روشن ہوا، آنکھیں چندھیا گئیں، سکڑ گئیں۔ کمرہ باقی فلیٹ کہ لحاظ سے حد

تک صاف ستھرا الگ رہا تھا مگر ابھی بھی بستر کے ایک طرف گیلا تولیا پڑا ہوا تھا جو بستر پر پانی کا داغ چھوڑ گیا تھا۔

میں واپس وہیں آکر بیٹھ گیا جہاں پہلے بیٹھا تھا۔ نظریں میرے ہاتھ میں موجود گھڑی پر مرکوز۔ سامنے سے وہ ایک عام گھڑی ہی لگتی تھی۔ باہر سے سنہرے رنگ کی اور اندر سے سفید جس پر سیاہ لکھائی سے ایک سے بارہ تک ہندسے تحریر تھے۔ تین لکیریں جو وقت بتانے کا کام کرتی تھیں وہ ابھی حرکت میں نا تھیں۔ باہر کے شیشے پر ایک کریک تھا جو واضح نہ تھا مگر گھڑی ترچھی کرنے پر دکھ جاتا تھا۔

میں نے گھڑی کو پلٹا دیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اب بھی سوکھے خون کے دھبے موجود تھے۔ گھڑی کے پیچھے کچھ نہ تھا، پر وہ سرخ خون ایک عبارت، ایک فقرے کو واضح

کر رہا تھا۔ سنہرے رنگ میں ابھرا وہ جملہ اب سرخ رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، مگر اب بھی صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ اپنی انگلی کی پوروں سے اس تحریر کو چھوا، ایک اور مرتبہ اس گھڑی پر لکھے عربی الفاظ پڑھے۔

"في ذكريات الجيده وفي ذكريات سيئة سأظل معك إلى الأبد۔"

(اچھی یادوں میں اور بری یادوں میں، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔)

اسے پڑھتے آج بھی وہ منظر پھر سے میری آنکھوں پر اترتا گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں سے سب شروع ہوا تھا، سب کچھ غلط۔

☆=☆=☆

چہرے سے ٹپکتا وہ آنسو تھا یا خوف سے بہتا شدید پسینہ، جانچنا مشکل تھا۔ دھک سے بستر سے اٹھ بیٹھنے والی وہ ایرج تھی۔ (پچھلی قسط میں ہم نے جانا تھا کہ یہ ایرج ہنستی کھیلتی ایک لڑکی تھی، مگر آج اس کوئی دیکھتا تو بولتا وہ ایسی تو نا تھی۔) وقت نے اسے پھر سے اسی حالات میں لا کھڑا کر دیا تھا جہاں وہ دو سال پہلے تھی۔

پھر سے کیا وہ ہی ہونے کو تھا؟ زندگی کیا پھر ان ہی لمحات کو دہرانے والی تھی؟ دو دن سے وہ آنے والا خواب آج پھر آیا تھا۔ وہی پیلے دانت۔۔۔ وہی گاڑی۔۔۔ وہی شام۔۔۔ وہی سڑک

رات کا پہرا اختتام کو تھا۔ فجر کی اذان کو ہوئے پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے۔ اکا دکا چرند پرند اپنے پر پھیلائے دانے کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ آسمان سے چاند او جھل

تھا،شاید کسی اور ملک کی رات نے اس چاند کی روشنی کو پکارا تھا۔یہاں سورج عروج

پر آنے کو تیار تھااور انسان بھی اپنی روٹی پیاس کے لیے سفر کو نکلنے کے لیے تیار ہو

رہے تھے۔

اور ایک وہ تھی، پسینے میں بھیگی ہوئی،ساکن سانسوں کے درمیان وہ پھر سے

hallucinationsکرنے لگی تھی۔

ایک دھوکے کی لپیٹ میں وہ خود کو پھر سے کھونے لگی تھی،اور اس دلدل سے وہ

کبھی نہیں چھڑا پائی تھی۔اس کے لیے یہ ایک فیز تھا۔جیسے غم اور غصہ وقت کے

ساتھ ڈھل جاتا ہے،اس کے لیے یہ بھی ویسے ہی تھا۔مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔اسے

کوئی نہیں سمجھ پایا تھا کہ یہ مسئلہ ہے یا ایرج ہی شاید ضدی تھی کہ مان نہ پائی تھی کہ یہ مسئلہ ہے۔

پیروں میں چپل ڈال کر اس نے خود کو غسل خانے تک گھسیٹا۔ دیوار کے سہارے بیسن تک آتے اس نے پانی کا نل کھول دیا۔ پانی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ایک ساتھ بہتا پانی سفید رنگ لگ رہا تھا۔ پہلے ہاتھوں کو کلائی تک دھویا اور پھر چہرے پر پانی ڈال کر مکمل وضو کیا۔ مسلم شاور سے وضو کا آخری فرض سر انجام دیا اور بکھرے بالوں کو باندھنے لگی۔ ہوا میں آج سردی کم تھی اور شال اوڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی. لاونج میں رکھی جائے نماز اٹھاتی وہ کھلے صحن تک آگئی۔ آسمان پر سورج اب تک واضح نہیں ہوا تھا۔

صحن میں چارپائی کے پاس قبلے کی طرف جائے نماز بچھائی اور دو رکعات فجر کی نیت

باندھ لی

فاطمہ منزل کے باہر محلے ایک صاحب گھر گھر جا کے اخبار بانٹ رہے تھے۔ہاتھ

میں کپڑے کا تھیلا جس میں چند لپٹے کاغذ کے اخبار تھے۔وہ روز صبح فجر کے وقت

آپ کے گھر اخبار ڈالتے تھے مگر شاید اب کوئی تھا ہی نہیں جو صبح سب سے پہلے

اخبار کا انتظار کرتا۔اخبار کا رواج ختم ہوتے جا رہا تھا۔کون اخبار میں چھان بین

کر کے اپنے مطلب کی خبر نکالے جب گوگل کے ہزار میگزین کو لائک کیا ہوا

ہے۔اخبار کی کیا ضرورت ہے؟

اس نے نماز مکمل کی تو نظر چند قدم دور تہہ شدہ اخبار پر پڑی۔آج پہلی بار شاید اس نے کاغذ کو صحن کی زمین پر دیکھا تھا۔ورنہ فجر کی نماز وہ اکثر اپنے کمرے میں ہی پڑھتی تھی۔سب ویسے ہی تھا، صبح بھی ویسے ہی تھی۔روایت بھی ویسے ہی تھی، پرندوں کی گنگناہٹ بھی ویسے ہی تھی۔ صبح تو جاندار ہوتی ہیں۔پھر آج فضا خاموش کیوں تھی؟ماحول روکھا روکھا سا تھا؟

دیواروں پر اب بھی پھولوں کی سوکھی لڑیاں ہوا سے جھول رہی تھیں البتہ سیڑھیوں سے موم بتی غائب تھی۔ادھر ادھر پھولوں کی پتیاں بکھری تھیں۔یہ سارہ کے سوئم کا دن تھا۔

وہ اب بھی جائے نماز پر بیٹھی رہی۔ آسمان پر پرندوں کی پرواز شروع ہو چکی تھی۔ گھر کے باہر وقفے وقفے سے گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے گزرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

وہیں بیٹھے بیٹھے نظر چارپائی کی دوسری طرف بچھی چاندنی پر پڑی جہاں دو دن پہلے سب لوگوں نے سارہ کو رخصت کیا تھا، دنیاوی رخصت۔ بے اختیار اس نے آسمان کو دیکھا، پار بادلوں کو دیکھا۔

سیاہ سے سفید ہوتے بادل، سیاہ سے آب ہوتا آسمان، کیا وہیں کہیں تھی سارہ؟ بہت دور مگر دل کے بے حد قریب۔ وہ ان دو دنوں سے روئی بھی نہیں تھی اور اب لگتا تھا کہ روئے گی نہیں تو زندگی مشکل ہو جائے گی۔ کیا وہ سارہ کو الوداع کہہ پائی

تھی؟ابھی تو اسے بہت کچھ کہنا تھا۔یوں اچانک سب ہو جاتا ہے۔وقت ہی نہیں

ملتا۔

!اللہ"

مجھے لگتا ہے میں پھر سے ماضی میں دھنستی جا رہی ہوں۔

آپ کو یاد ہے اللہ..جب سعد گیا تھا تو میں کتنا روتی تھی.آپ سے میں کتنی

دعائیں، کتنی باتیں کرتی تھی.مجھے یاد ہے جب سعد گیا تھا تو میں روز اس کے لیئے دعا

کرتی تھی...اسکی خیرت آپ سے پوچھتی تھی۔

"پھر وہ وقت چلا گیا،اور آپ سے بات پتا نہیں کہاں گم ہو گئی،کیسے ادھوری رہ گئی۔

ایک آنسو بھی جو ٹپکا ہو۔بس آنکھوں کے سامنے منظر تھا جو دھندلا گیا تھا۔

جب سعد گیا تھا تو لگتا تھا سب کھو گیا ہو، سب جیسے چھن گیا ہو۔ خوشیاں، رونقیں۔ "

میں نے آپ سے دعائیں کی۔ آپ سے سب مانگا۔ جو لا حاصل تھا، یا جو حاصل ہو کر

بھی لاحاصل تھا. سب مانگا... بس آپ کی ہدایت نہیں مانگی۔ آپ کے نور کا راستہ

نہیں مانگا۔ اور آہستہ آہستہ میری زندگی میں سب آتا گیا، خوشیاں، کامیابیاں....

اور آپ چھوٹ گئے، آپ کی ہدایت چھوٹ گئی۔

میں سمجھتی تھی کے غم کا وہ ایک حصہ تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا، مگر

".. نہیں... یہ دنیا سے، گمراہی سے، اور چمکتی نعمتوں سے محبت تھی جو بڑھتی گئی

اب آنسو بہے تور کے ہی نہیں۔

غم دل کی کسی کونے میں گم ہوتا گیا اور دل کی ہی ایک چیز کھو جانے پر وہ غم واپس"

وہیں آ کھڑا ہوا ہے، میں نے آپ سے سکون نہیں مانگا، میں نے آپ سے خوشی مانگی

اللہ تعالی. سکون مل جاتا تو آپ مل جاتے، خوشی مل گئی تو دنیا مل گئی، آپ نہیں

ملے۔

آج لگتا ہے کہ سکون اور خوشی میں فرق پتا چل گیا ہو۔ خوشی ہر چیز سے مل جاتی

ہے، رشتوں سے، چیزوں سے، کامیابی سے۔ جو آپ کی زندگی کو نکھار دے وہ

خوشی کا ذریعہ بنتی ہے، مگر سکون آپکی رضامندی سے ملتا ہے اللہ، سکون غم اور

مشکلات میں بھی ملتا ہے، اگر آپ راضی ہوں، آپ خوش ہوں۔

آپ کی خوشی ہوتی ہے سکون،اور میری خوشی تباہی۔ان دو سالوں میں لمحہ بالمحہ خوشی ملتی گئی،اور سکون مٹتا گیا۔آپ سے سکون مانگا ہی نہیں تو آپ نے دیا بھی نہیں۔آپ سے جو مانگا وہ دیا آپ نے

وہی غلطی بن گئی میری،پچھتاوا بن گیا.

غم تازہ ہوا ہے تو یادیں بھی تو تازہ ہوئی ہیں...ان ہی یادوں نے مجھے ایک موقع دیا ہے،آپ کی طرف آنے کا،آپ کی ہدایت کی رسی تھامنے کا۔

آج وہ غلطی نہیں کروں گی،آج خوشی نہیں سکون

مانگتی ہوں اللہ۔آپ کی رضامندی اور ہدایت مانگتی ہوں۔سارہ میری زندگی سے چلی گئی، مگر وہ دوستی، وہ رشتہ دل کے کسی کونے میں آج بھی بستہ ہے، بستہ رہے گا۔ مگر آپ کھو جائیں گے اللہ، اگر آج دعا میں آپکو نہیں مانگا تو ابلیس پھر دل سے آپ کی اہمیت کم کر دے گا۔آپ سے گفتگو کرنے کو بھلاوا دے گا۔

سارہ کی اصل زندگی کی آسانی، اور میری دنیاوی زندگی میں نور، مانگتی ہوں اللہ تعالیٰ۔آپ کی راہ سکون مانگتی ہوں۔آپ سے محبت، آپ کا تقویٰ میرے دل میں اجاگر ہو جائے۔آپ سے آپ کی ہدایت مانگتی ہوں۔

آمین۔"

چہرے پر ہاتھ پھیرتے اس نے آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے۔ جائے نماز کو تہہ کیا اور زمین پر پڑے اخبار کو چارپائی پر اچھال دیا۔ اسے بھی پتا تھا کہ وہ اخبار کبھی نہیں پڑھا جانا تھا۔ یہ اخبار شامی کباب اور پکوڑوں کے تیل کو جذب کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ساتھ ہی چارپائی پر خود بیٹھ گئی اور تسبیح اٹھالی، اس کی آنکھوں میں شدید درد ہو رہا تھا جبکہ قرآن پڑھنے کا دل اتنا ہی تھا۔ اس تعلق میں مبتلا وہ ابھی ہی ہمت نہیں چھوڑنا چاہتی تھی تو تسبیح اٹھالی، اب وہ یا علیم کی تسبیح زیر لب دہرا رہی تھی۔ جب آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں تو نظریں اس لپٹے اخبار پر جا ٹھہریں جسے کچھ دیر پہلے اس نے چارپائی پر پھینکا تھا۔ اس نے اخبار اٹھایا اور اس کے اوپر

لگے ربڑ بینڈ کو اتارنے لگی۔ تسبیح ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھی، کلام اب بھی زبان

پہ تھا۔

اخبار کھولا تو ایک کے اندر ایک تہہ شدہ کاغذ اڈتے گئے، نظروں کو سب سے پہلے

رنگین کاغذ نے بھایا تو اس نے باقی حصوں کو پرے کیا اور اسے کھولنے لگی، (تسبیح

اب انگلیوں سے مٹھی میں قید ہو چکی تھی، زبان نے کلام اللہ کا تعاقب چھوڑ دیا تھا،

دل ایک بار پھر دنیا میں بھٹک چکا تھا۔)

اخبار کھولا تو پہلے کاغذ کی خوشبوناک کی نتھنوں میں بس گئی، اور پھر نظر اوپری جانب

کی ایک خبر پر پڑی، خبر کراچی کے مشہور شاپنگ سینٹر ہارون میں ہوئی ایک

واردات کی کہانی سنا رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی تو اس نے پایا کہ وہ خبر ایک

بلبلے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔اخبار سے نکلتا وہ بلبلہ اب ہوا میں ادھر ادھر منڈلا رہا تھا، لمحے بعد وہ بلبلہ اپنے اندر ایک منظر پیش کر رہا تھا، ایرج کی آنکھوں نے اس منظر کا تعاقب کیا اور اس ننھے بلبلے نے اسے تین سال قبل، ہارون کی سڑکوں پر چلتی تین لڑکیوں پر لا کر کھڑا کر دیا، منظر کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے چلتا گیا۔

(حال سے تین سال قبل)

وہ ننھا سا بلبلا سارا کی ناک پر آ کے پھٹا تو اس کے کیمیکل کی وجہ سے سارا کی آنکھ میں ہلکی سی جھجھلاہٹ ہوئی۔

ایک آدمی اپنے ہاتھ میں بلبلے والی پستول سے بلبلے ہوا میں اڑاتا اپنے سامان کو بیچنے کی کوشش میں تھا۔ان بلبلوں سے وہ بچوں کی توجہ حاصل کرتا اور پھر بچہ اپنی ماں سے ضد کر کے اس سے وہ مشین گن لے لیتا۔

یہ حیدری کی مصروف سڑک تھی جس پر وہ تینوں واپسی کے قدم دھرتے حیدری مارکیٹ سے نکل رہے تھے۔حیدری مارکیٹ کراچی کی سب سے مشہور لوکل مارکیٹ میں سے ایک مانی جاتی ہے۔یہ مارکیٹ دو حصوں میں تقسیم شدہ تھی جس کا دوسرا حصہ اسی مارکیٹ کے برابر میں مدنی مال کے نام سے جانا جاتا ہے۔

چل بھائی یہاں سے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا مجھے"۔وہ جو تین اب ایرج کی گاڑی کی" طرف بڑھ رہی تھیں،ان میں سے ایک نے کہا۔

میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا لکی ون چل لو۔اب کرواؤ گے میری خواری تم لوگ"۔"

اب کی بار ایرج نے کہا تو اس کے چہرے پر کوفت کے آثار نظر آتے تھے۔جینز کی نیلی پینٹ ہلکے اور پیلے رنگ کی کرتی زیب تن کئے ہوئے۔اسے ان کپڑوں میں بھی گرمی لگ رہی تھی۔اس پیلی قمیض پر لال رنگ کا دوپٹہ اوڑھے اسے گردن پر پسینہ آرہا تھا۔کراچی کی گرمی کا واقعی کوئی جواز نہیں تھا۔

حیدری میں سونے کی فروخت سے لے کر کتابوں کی فروخت تک سب ہوتا تھا۔کیا نہیں تھا جو وہاں ملتا نہ ہو؟ حد سے زیادہ رش میں بھی لوگ اس مارکیٹ کی خریداری کرنے ضرور آتے،کیونکہ سستے دام میں ملتی چیزیں کس کو نہیں پسند؟

حیدری پار وہ تینوں ایرج کی گاڑی کی طرف آچکی تھیں۔یہ بقرہ عید کے قریب کا وقت تھا۔ایرج، سارہ اور سارہ کی دوست سجل آج کراچی کی تپتی دھوپ میں بقرہ عید کی چھوٹی موٹی شاپنگ کرنے آئے تھے۔ایرج کو دوپٹے کا پیکو کروانا تھا جس کا شاپر لے کر وہ ادھر ادھر پھرتی جا رہی تھی۔

لکی ون سے واپسی میں ہارون چلیں گے،ویں ہی دو سو بیس کا پیکو کرواؤں گی جب" ایک سو ساٹھ کا ہارون میں ہو جاتا ہے"۔وہ ایک ہاتھ سے آنکھوں کے اوپر چھجا بنائے دوسرے ہاتھ بیگ میں ڈالے گاڑی کی چابی نکال رہی تھی۔

ہاں تو وہ بقیہ ساٹھ روپے جن کو بچانے کے لئے تم لکی ون سے ہارون جاؤ گی،" پٹرول میں خرچ ہو جائیں گے"۔سارہ اب گاڑی سے اپنی پشت جمائے کہہ رہی

تھی۔آج اس نے بھورے رنگ کی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔کندھے کے نیچے آتے بال کس کے چوٹی میں بندھے ہوئے تھے اور ہمیشہ کی طرح دوپٹہ سر پہ ٹکا ہوا تھا۔کراچی کی گرمی میں کوئی تناؤ نہیں آیا تھا اور ہوا کے نام پر گرم لو کے جھونکے سجل کے چہرے کو لال کر رہے تھے۔وہ پٹھان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور کراچی پڑھنے آئی تھی۔سارہ کے ساتھ ہی اس کی کافی بات چیت تھی اور گزرتے لمحوں کے ساتھ ایرج سے بھی کم مگر بات ہوتی رہی۔

لکی ون کی پارکنگ میں گاڑی پارک کرتے ہوئے وہ اب مال کی طرف آرہے تھے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور آج لوگوں کی چہل پہل کم تھی۔چند مشہور برانڈز میں ہی جم غفیر کی حد محسوس ہو رہی تھی۔

لکی ون مال کراچی کے ساتھ ساتھ پورے پاکستان کا سب سے بڑا مال تھا. تین سے چار منزلوں پر مشتمل یہ مال ہر طرح کے برانڈز سے سجا تھا۔اوپر فوڈ کورٹ تھا جہاں کھانے پینے کے مشہور برانڈز موجود تھے۔نارنجی اور سبز کرسیوں سے سجا وہ کورٹ کافی وسیع تھا۔

فوڈ کورٹ سے ایک منزل نیچے آئیں تو وہ تینوں الکرم کے آؤٹ لیٹ پر کپڑوں کی چھان بین کر رہے تھے۔کپڑوں کو چھوتے، مہنگائی پر طعنہ دیتے اور ایک آؤٹ لیٹ سے دوسرے آؤٹ لیٹ بھاگ جاتے۔

تھوڑی بہت خریداری کے بعد اب وہ کچھ کھانے کے لئے اوپری منزل کو چلے آئے تھے۔سارہ تو فوراً

Del frio

کی طرف بھاگی کہ اپنے من پسند ڈونٹ اور کافی لے سکے (چونکہ یہ لائن نمرہ احمد

کے مالا کی ہے،

ورنہ میں ضرور کہتا کہ "ڈونٹ کے لیے کچھ بھی!")۔ایرج اور سجل اب

Gin soy

پر کھڑے اپنا آرڈر نوٹ کروا رہے تھے۔فوڈ کورٹ میں آج رش کافی کم تھا۔وہ

دونوں ایک

خالی میز کے قریب آکر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔دس منٹ تک انتظار کرنا تھا۔

مجھے سارہ نے تمہارے بنائے گئے لوگوز دکھائے تھے۔مجھے تو یقین نہیں آتا تم" نے لوگو ڈیزائننگ اتنی جلدی سیکھ کر شروع بھی کر دی ہے۔واؤ!"اچانک ہی سجل نے اس کو مخاطب کیا اور وہ جو فون پر جھکی کچھ دیکھ رہی تھی اس کے اچانک مخاطب کرنے پر چونکی اور پھر مسکرا دی۔ٹرانسپیرنٹ گول چشمہ ہمیشہ کی طرح ویسے ہی اس کی ناک پر ٹکا ہوا تھا البتہ اس کے بال قدرے لمبے تھے۔ان دونوں کے بیچ پھر خاموشی چھا گئی کہ اسی وقت سارہ ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ایرج اور سجل کے درمیان سارہ سے بات بنتی تھی۔چپڑ چپڑ کرتی سارہ ایرج کی قباحت ہوتی کیفیت میں کمی لا رہی تھی۔

(حال)

یادوں کا وہ ننھا بلبلا پھٹ پڑا۔ماضی ماضی میں رہ گیااور حال کی چنگھاڑتی دھوپ اس

کی آنکھوں کو چندھیانے پر مجبور کر گئی۔ صبح کا سورج مکمل طور پر نکل چکا تھا۔آسمان

بادلوں سے صاف تھا۔سارہ اور اس کی زندگی کا یہ باب اب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا

تھا۔اور اس بات میں اب کوئی کھوٹ نہیں بچا تھا۔

☆=☆=☆

جوتے کے تسمے باندھنے کے لیے میں بستر پر بیٹھا تو گبی کمرے کے اندر آتے ہی

میرے پاؤں سے چپک گیا۔

صبر کر لو تھوڑا، تمہارا کھانا تو میری جیب خالی کر دیتا ہے،اب میچ سے واپسی پر لے"

".کر آؤں گا میں کیٹ فوڈ،جب تک پیالے میں رکھے دودھ سے گزارا کرو۔

گبی میرا وہ بلا تھا جس کا ساتھ بہت پرانا تھا، ہاں کبھی کبھی اس کی حرکتیں ناگوار لگتی

ہیں مگر انسانی رشتوں سے تو بہتر ہی تھا۔

جوتے کے تسمیں باندھ کر اٹھا اور تن پر نیلے رنگ کی پوری آستینوں والی جرسی

پہنی، گبی اب بھی گڑگڑ کی آواز کرتا پاؤں کے آس پاس منڈلا نا رہا تھا۔ کمرے سے

باہر آتے ہوئے وہ اب بھی میاؤں میاؤں کی آواز نکالتا ساتھ باہر آگیا تھا۔

میں ٹھہرا۔ نیچے جھک کر اسے اٹھایا اور اپنی آنکھوں کے قریب لے آیا۔ وہ اب

گردن کبھی ادھر گھمارہا تھا تو کبھی ادھر۔

یہ آخری دفعہ دے رہا ہوں اس کے بعد تمہارا کھانا ختم ہے۔ یہ کھا کر چپ چاپ" سو جانا اور خبر دار مجھے آنٹی نے پھر آ کر بولا کہ تم نے ان کا گملہ گندا کیا ہے، آوارہ "بلے نہیں ہو تم۔ تمہارا پوٹ گیلری میں رکھا ہوا ہے۔

میں اس کو ایسے نصیحت کر رہا تھا جیسے وہ بڑا کوئی میری بات کو غور و فکر سے سن رہا ہو۔ بھورے رنگ کا وہ بلا مجھے اس دنیا میں واحد اپنا لگتا تھا۔ ہاں شاید وہ میری باتوں کو نہیں سمجھتا تھا۔ شاید اس کو پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ کون انجان مجھ سے بات کرتا ہے، مگر ایک احساس تھا کہ کوئی تھا۔ کوئی تھا جو دروازے کو کھولتے ہی لپٹ جاتا تھا، کوئی تھا جو میرا انتظار کرتا تھا، کوئی تھا جو اپنے مطلب کے لئے ہی سہی، مگر میرے ساتھ تھا۔

اس کا کھانا پیالے میں ڈالتے میں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔وہ مزے سے اپنا کھانا کھاتا مجھ سے بے نیاز لگتا تھا۔میں اس کے برابر دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔سامنے دیوار پر لٹکی گھڑی پر نظر دورائی تو وہ ساڑھے تین بجا رہی تھی۔ ابھی میچ کو شروع ہونے میں ایک گھنٹہ تھا۔میں نے آنکھیں موند لیں اور مجھے پتہ تھا میری آنکھیں بند کرنے کے بعد میرے سامنے کس کا چہرہ آنا تھا۔۔۔وہ چہرہ جو پچھلے چند گھنٹوں۔۔۔بلکے چند دنوں سے آنکھوں کے بند پردوں پر چھا جاتا تھا۔اور مجھے لگتا تھا کہ میں ایسا کرنا چاہتا تھا۔میں اسے دیکھنا چاہتا تھا؟

اس لڑکی نے صرف ایک لفظ بولا تھا۔جب میں نے اس کو دیکھا تھا تو اس کا چہرہ الجھا سا معلوم ہوتا تھا۔اس کے بال کافی چھوٹے تھے۔گلابی رنگ کی فراک نما شرٹ،

سب ویسا ہی تھا۔ آنکھوں پر گول سا چشمہ۔اس کا چشمہ بالکل میرے جیسا تھا۔اس کی شکل ویسے ہی تھی۔۔۔

اور تم نے اس کو نہیں بچایا۔ تم نے اس کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا"۔ کہیں دور" میرے ذہن میں ایک آواز گونجی۔

ایک دم سے میری آنکھیں کھل گئیں۔یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ حقیقت پھر نظروں پر چھا گئی۔ گبی میرے ساتھ آکر بیٹھ گیا اور اب اپنے آپ کو صاف کر رہا تھا۔

میں نے غلط نہیں کیا، میں نے اس کو بچانے کی کوشش کی تھی، وہ تمہاری وجہ سے" مری ہے، یہ سب تم نے کیا ہے۔گاڑی سے جو ٹکرائی تھی وہ سب تم نے کیا ہے،

سب تم نے کیا ہے، تم نے مجھے اس سے ملوایا، تم نے اس کو مروایا، تم ہو قاتل، مجھے

"الزام مت دو۔

ایک دم سے اٹھتے ہی میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ سنگھار میز پر رکھی وہ

منحوس چیز اٹھائی اور دیوار پر کھینچ ماردی۔ دیوار سے ٹکرا کر وہ زمین پر گر گئی، میں

اس کے قریب گیا اور جوتوں کے ذریعے اس کو کچلنے لگا۔

تم نے کیا ہے سب، تم نے میری زندگی تباہ کی ہے، تم جاؤ میری زندگی سے دفع "

ہو جاؤ، میں تمہارے چنے ہوئے راستے پر نہیں چلوں گا۔ تم نے مجھے پھنسا دیا ہے،

تمہاری باتوں پر عمل نا کروں تو میں مر جاؤں گا۔ مجھے جینے دو۔ میں جینا چاہتا ہوں۔

میرے ساتھ مت کرو یہ۔ تم میری زندگی کو میرا ہونے دو۔ میری زندگی میں بچا

"ہی کیا ہے جو تم چھین رہے ہو مجھ سے ؟ مجھے تمہاری قید میں نہیں رہنا۔

پاؤں سے بار بار کچلنے کے بعد بھی اس سنہری گھڑی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ جبکہ اس کا

اوپری شیشہ مکمل طور پر چوڑ چوڑ ہو گیا تھا۔اس کو اور کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔

تھک ہار کے میں نے اپنا پاؤں روک دیا اور پھر اس کو ایک زور کی لات مار کر کمرے

سے باہر نکال دیا۔

وہ انجان لڑکی اپنے ذہن پر سوار نہیں کرنی تھی۔۔۔ مگر کاش وہ اس گاڑی سے

ٹکرائی نہ ہوتی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایک واقعہ تھا اور اب یہ یاد کہ سوا کچھ نہ

تھا۔وہ لڑکی میری زندگی میں داخل ہو کر کچھ تبدیل نہیں کر سکتی اور اس کے

بارے میں سوچنا وقت کا ضیاع تھا۔

مگر ہاں،دل سے پہلی دفعہ ایک پکار نکلی تھی کہ کاش وہ زندہ ہو۔۔۔کیونکہ وہ مرنا

ڈیزرو۔۔نہیں کرتی تھی۔

میں کمرے سے باہر نکل رہا تھا،

ایموشنز فیل نہیں کر وار مغان۔ تم نے جان لی ہے۔ تم نے انسانیت کے ناتے بھی" کسی کو نہیں بچایا۔ تم۔۔۔ قاتل۔۔۔ ہو"۔ دماغ ایک سوئی پر اٹک گیا تو نکل ہی نہیں رہا تھا۔

دیوار کو دیکھا تو وہاں گھڑی لگنے کی وجہ سے اس جگہ کا پینٹ اتر گیا تھا۔ اس کو نظر انداز کرتے میں کمرے سے باہر آیا اور فون پر بائیکیا بک کرتے ہوئے گھر کی چابی اٹھانے لگا۔

دور بیٹھے اس بلے پر نظر پڑی، اس کے کان کھڑے تھے اور چوکنا تھا یا سہما ہوا تھا؟ میں اندازہ نہ کر پایا۔ چابی اٹھاتے میں نے اسپورٹس جیکٹ پہنی اور چابی کو اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈالتے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"I'll try to be better, I promise you that,

اور شرارتیں نہیں کرنا زیادہ۔ بائے۔"

جاتے جاتے گبی کو ایک نظر دیکھا، پھر اس سے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور

اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دروازے کا ہینڈل کھینچنے لگا کہ اس کو میری بات

سمجھ نہیں آئی تھی۔

مگر کاریڈور پار کرتے ارمغان کو کیا معلوم تھا کہ اس کی بات دل میں کہہ دینے (

سے پہلے ہی سن لی گئی تھی اور اس بات کا اندازہ ارمغان مطاہر علی کو جلد ہونے والا

تھا۔)

☆=☆=☆

صبح کی دھوپ اور گرمی کی شدت میں دوپہر تک تھوڑی ہی سہی مگر کمی آگئی تھی۔

مگر اس تپش کا کیا جو فاطمہ منزل کے مکینوں کے دلوں کو ڈھا رہی تھی، جلا رہی تھی؟

یہ دن کے پورے پونے چار بج رہے تھے۔آج فاطمہ منظر سنسان لگتا تھا کہ جیسے زندہ لوگوں کا کوئی قبرستان ہو۔یہ وہی گھر تھا جہاں آج کے دن پھولوں کی خوشبو، مٹھائیوں کے انبار اور خوشیوں کے آمد و رفت ہونی تھی۔ مگر قسمت کیسی بساط پلٹ دیتی ہے ناں! آج اگربتیوں کی اجڑی مہک، سوکھے مرجھائے چہرے اور تعزیت کرتے لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔آج صحن میں لال چادر کے بجائے سفید چاندی بچھی تھی۔آج گلاب کی پتیوں کی جگہ تسبیح کے دانے اور کھجور کے بیج

بکھرے پڑے تھے۔ سارہ کے نکاح کا دن کس کو اندازہ تھا کہ اس کی موت کا دن مقرر کردہ ہونا تھا۔

صحن میں رکھی چارپائی پر لمبے پاؤں کیے بیٹھی مریم بیگم کے ہاتھ میں ایک سپارہ تھا۔ وہ زیر لب قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ عموماً وہ چشمہ نہیں لگایا کرتی تھیں مگر کبھی کبھی قریب سے پڑھنے یا دیکھنے کے لیے وہ چشمہ لگاتی تھیں۔ سفید شلوار قمیض پر انہوں نے بھورے رنگ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ جس چہرے کو آج لوگوں کی مبارک وصول کرتے مسکرانا چاہیے تھا، وہ چہرہ آج آنسو سے بھیگا اور رندھی آواز کے ساتھ لوگوں کی تعزیت قبول کر رہا تھا۔

مریم اب اپنے پاؤں سمیٹ رہی تھیں۔ سارہ کے سسرال سے آنے والے سارہ کی ساس اور سارہ کا منگیتر ارسلان گھر کے صحن سے اندر داخل ہو چکے تھے اور جاوید سے مل رہے تھے۔ باہر بیٹھی مریم اب بھی قرآن پڑھ رہی تھیں مگر اب آواز مدھم ہو گئی تھی، رفتار تھم گئی تھی۔ آنکھیں بہت نم تھیں۔ شاید پچھلے دو دنوں میں بہت رو لیا تھا۔۔۔ کیا وہ ماں، جو اپنی اولاد سے بے حد پیار کرتی ہو، اس کے بچھڑ جانے پر روئے بھی نا؟ نہیں، وہ رو سکتی ہے وہ رو رو کر نڈھال ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔

مگر مریم ان میں سے کچھ نہیں کر رہی تھیں، ہاں ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ زمانہ بتا سکتا تھا کہ وہ "ٹھیک" نہیں۔ مگر وہ ماں سب سے عظیم ہوتی ہے جو اپنی

اولاد کے لئے رونے کے بجائے دعا کرتی ہے، بے حد دعائیں، بے تحاشہ۔ایک اولاد ماں باپ کے پاس امانت ہوتی ہے۔اولاد وہ زندگی جیتا ہے جو اس کے ماں باپ جیتے ہیں۔وہ کھاتا ہے جو اس کے ماں باپ کھاتے ہیں۔وہ سنتا ہے، وہ کہتا ہے، وہ کرتا ہے جو ماں باپ کہتے، سنتے اور کرتے ہیں۔ایک اولاد اپنے والدین کی زندگی کو مثال کی طرح دیکھتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے، کیا نہیں۔والدین کی پرورش میں کھوٹ ہو تو اولاد کی شروعاتی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔والدین کی پرورش لازوال ہو تو اولاد کا زوال نہیں آتا۔ہر زندگی ماں باپ سے جڑی ہوتی ہے اور اولاد ماں باپ کا عکس ہوتا ہے۔

مریم نے قرآن کو آہستہ سے بند کر دیا۔اب انہوں نے اپنے ہاتھ میں یاقوت کے رنگ کی تسبیح اٹھالی۔ایک ایک کر کے دانے گرتے گئے۔اب ان کی آنکھیں بند تھیں،بس ایک آواز تھی،اللہ کی بڑائی بیان کرتی اندرونی آواز۔دعائیں کرتی ماں کی بے زبان سسکیوں سے لپٹی آواز۔وہ دعائیں کر رہی تھیں،کیا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا؟کیا کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا تھا؟کیا چھن گئی چیز واپس نہیں مل سکتی تھی؟کیا حقیقت خواب اور خواب حقیقت نہیں بن سکتا تھا؟

وہ زیر لب پڑھ رہی تھیں کہ ایک آواز کانوں کو چھو گئی۔اندھیر آنکھوں سے نہیں مگر کھلے کانوں سے سنی ہوئی آواز غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ان کے ہونٹ تھم گئے۔

آنکھیں اب بھی نہیں کھولیں۔ یہ آواز چارپائی کے بالکل سامنے موجود سیڑھیوں سے چڑھتے ہوئے اس کے قدموں کی آواز تھی۔

ہاں! یہ سارہ کی انہیں چپلوں کی آواز تھی جس کو صرف وہی پہینتی تھی۔ سفید رنگ کی بڑی بڑی گھر والی چپلیں جن کو پہن کر چلنے سے ایک عجیب کھو کھلی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔

انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں. یہ ڈر بھی کتنا پر سکون کر دیتا تھا۔ یہ ڈر کہ آنکھ کھلے اور وہ آوازیں جھوٹی ثابت ہو جائیں، حقیقت یا خواب کچھ باقی نہ بچے، خوش فہمی ہی سہی مگر کتنی پر سکون کر دینے والی خوش فہمی تھی۔

سارہ؟"۔ان کے لب بے اختیار ہلے، شاید آواز حلق سے خود نکلی، ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی، وہ ایک مرتبہ کوشش کرنے کے باوجود بھی بول نہیں پائیں۔

وہ آواز اب کانوں کے قریب آتی جارہی تھی، تمام شور تھم گیا تھا، اور اب بس ایک وہی آواز تھی۔ وہ آواز اب کانوں کے بالکل قریب آکر ٹھہر گئی۔ آواز کا سلسلہ ختم ہو گیا، سکوت چھا گیا۔ مریم کو الجھن سی ہوئی، کیا ہوا؟ اچانک وہ آواز کدھر غائب ہو گئی؟ انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

آنکھوں کے سامنے ایک دھندلا منظر چھایا ہوا تھا، کچھ بھی نہیں دکھ رہا تھا۔ آنسوں کے قطرے آنکھوں کے پردوں پر جیسے ٹھہر گئے تھے۔ بس سامنے کسی کا دھندلا وجود دکھ رہا تھا۔ تسبیح والا ہاتھ اٹھا کے انہوں نے اپنی دونوں آنکھوں کو رگڑا۔

عجیب سی کیفیت تھی، ڈر تھا، خوشی تھی، غم تھا۔ آنکھیں صاف کی تو منظر واضح ہوا، منظر واضح ہوا تو دنیا رنگین ہوئی۔

اپنی آنکھوں کے سامنے ان کو ایک دھندلا سا وجود نظر آیا, آنکھیں ایک مرتبہ پھر بند کر کے کھولیں تو کونوں میں اٹکی آنسو کی بوندیں چہرے پر لڑک گئیں، منظر نہایت صاف ہو گیا، آنکھوں کے بالکل سامنے ہلکے آسمانی رنگ تن کیے کوئی وجود نظر آیا، انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا، دل جہاں دھڑک رہا تھا، وہیں ٹھہر سا گیا۔ سانس ساکن ہو گئ، مگر سانس اکھڑنے کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ وہ چہرہ واپس گرا نہ سکیں، بس نم بے تاثر مگر امید سے بھری آنکھیں سامنے نمودار چہرے کو دیکھتی رہیں۔ اور امید ٹوٹ گئی۔

ایرج نے ان کے دونوں ہاتھوں کو تھاما اور چارپائی پر ان کے برابر آکے بیٹھ گئی. اس کو دیکھ کر اور اس کے وجود کی حرکت کے ساتھ ساتھ ان کا چہرہ، ان کی آنکھیں بھی ہل رہی تھیں۔

پریشان نہ ہوں مریم چاچی، پلیز ایسے مت روئیں۔۔۔" سارہ کی سفید چپلیں اتار" کر اس نے چارپائی پر پاؤں سمیٹے اور ان کی طرف چہرہ کیے بیٹھ گئی۔

سارہ کیوں نہیں ہے ایرج؟ سارہ کہاں ہے؟۔۔۔۔مجھے اس کی آواز سنائی دی" تھی ابھی، وہ یہیں تھی، یہ میری غلط فہمی تو نہیں تھی۔۔۔۔سارہ تو ایسے نہیں جا سکتی۔۔۔دیکھو فریج میں اس کے منگوائے ڈونٹ اب بھی ویسے ہی پڑے ہوئے

ہیں، دیکھوناں اس نے خود منگوائے تھے۔اب اسکی منگوائی، اسکی سجائی، اسکی منتخب

"کردہ ہر شے اس گھر میں ہے۔۔۔۔ مگر وہ کیوں نہیں ہے ایرج؟

آنکھیں سے نکلتے آنسو بہتے جارہے تھے۔ایرج اب ان کا سر اپنے کندھے پر رکھتے

ہوئے ان کو بہلا رہی تھی۔

اس حادثے کے بعد سے زندگی اتنی برق رفتاری سے دوڑا اٹھی تھی کہ اسے سمجھ ہی

نہیں آرہا تھا زندگی میں جو کچھ چند دنوں پہلے ہوا وہ حقیقت تھا یا فریب؟ ایرج اور

تمام گھر کا ماحول کافی عجیب ہوتا جارہا تھا، وہ دو دن سے کمرے سے نہیں نکلی تھی، وہ

اس روز گھر کیسے پہنچی تھی اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔اس نے سارہ سے آخری بات

بھی اس کو دیکھتے ہوئے نہیں کہی تھی، اس نے آخری بار بھی سارہ کی بات کو ان سنی

کر دیا تھا۔وہ نا چاہتے ہوئے بھی خود کو قصور وار ٹھہرا رہی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ وہ دن گزرے رات کے خواب ہوں۔

ہر بار کی طرح وہ پھر سے غائب الذہنی کا شکار ہو گئی تھی۔ماحول سے بے نیاز اپنے خیالوں میں گم،کچھ سوچتا ہوا چہرہ۔اس کے گیلے بالوں کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا وہ چند لمحے پہلے ہی نہا کہ آئی تھی۔آسمانی رنگ کی قمیض،سفید پجامہ اور دوپٹہ اوڑھے۔

اس کے خیالوں سے پردہ ہٹانے والی وہ آواز تھی جو صحن سے تھوڑے فاصلے پر گیٹ سے اندر داخل ہوتے شخص کے سوٹ کیس سے آرہی تھی۔وہ شخص اپنی گردن ترچھی کرتے ہوئے،جھکتے ہوئے چھوٹے سے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

اس کے ایک ہاتھ میں رینگتا ہوا درمیانے سائز کا ایک سوٹ کیس تھا اور دوسرے ہاتھ سے گود میں لی ہوئی ایک تین یا چار سالہ بچی تھی۔

اس شخص نے سفید رنگ کی ڈریس شرٹ اور سیاہ رنگ کی ڈریس پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ شرٹ کی آستینیں اوپر تک سلیقے سے موڑی ہوئی تھیں۔

وہ شخص اب دروازہ پار کرتے صحن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی رنگت گندمی سی تھی، بال البتہ بکھرے ہوئے تھے. چہرے پر فیڈ ڈ کٹ کی گئی داڑھی تھی جس میں تھوڑے بہت ہی سہی مگر سفید بال واضح تھے۔ آنکھوں پر لگائے سن گلاسز کو اتارتے ہوئے وہ شخص اب فریم لیس چشموں کو آنکھوں پر ٹکا رہا تھا۔ شرٹ کے سامنے کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے جس میں سے گردن سے لپٹی سلور لاکٹ نظر

آرہی تھی۔ہاتھ میں اٹھائے اس بچی کو اب وہ زمین پر اتار رہا تھا اور سوٹ کیس کو سائڈ کرتا چارپائی کی طرف بڑھتا گیا۔

وہ چھوٹی سی بچی مسکراتے چہرے کے ساتھ ایرج کے پاس پہنچ گئی تھی۔ایرج بے یقینی سے نیچے اس بچی پر نظر جمائے اس کو دیکھ رہی تھی۔ ننھی سی بچی اب ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے ایرج کو کچھ بتا رہی تھی مگر شاید ایرج اس کی بات کو صحیح سے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اپنی کن اکھیوں سے وہ دیکھنے لگی تھی کہ وہ دراز قد شخص ان دونوں کے سامنے کھڑا تھا۔وہ اب ان کے قریب آرگیا تھا اور اپنی ماں سے ملنے لگا تھا۔ایرج جھٹکے سے کھڑی ہو گئی تو ارحم اچانک سے اس کے چہرے کو دیکھتا۔

السلام علیکم "۔ایک دھیمی،اداس سی نظروں سے وہ ایرج سے کہا۔اس کے " نا مسکرانے کے باوجود بھی اس کے چہرے کے گرد دوڈمپلز دکھائی دے رہے تھے۔

وعلیکم السلام "۔ایرج نے ہکلاتے ہوئے سلام کا جواب دیا،اب وہ بالکل جامد" کھڑی تھی،وہ ننھی بچی اب مسکراتے ہوئے اپنے بابا کے پاس جارہی تھی۔

کیسی ہو۔۔۔ایرج؟"۔اب کی بار وہ بہت دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایرج" سے پوچھا اور ایرج کو لگا تھا کہ اس کی دنیا وہی تھم گئی ہو۔یہ وہی بھاری آواز تھی جو بہت سال پہلے بھی یونہی اس کا حال احوال پوچھا کرتی تھی۔مگر آج نہ وہ آواز ویسی اپنی اپنی لگتی تھی نہ وہ شخصیت۔سب بہت انجان لگنے لگا تھا۔

میں ٹھیک ہوں۔۔۔آپ کیسے ہیں ؟۔۔۔بھابھی کیسی ہیں ؟"۔پتا نہیں کیسے مگر"

اس نے لفظوں کو جوڑتے ہوئے جواب دیااور اس کے ساتھ سوال کیا۔

"پر فیکٹلی فائن،اور حانا نہیں آسکی،اس کو آنا تھا مگر یو نو بزنس ٹرپس۔۔۔۔"

ارحم اب اپنی بیوی کے بارے میں بتارہا تھا،کچھ عرصہ پہلے ہی اس نے ایک

(converted muslim)

سے شادی کرلی تھی. شادی کے بعد اس کی بیوی ایک بار ہی کراچی آئی تھی اور اس

وقت ان کی بیٹی زویا ایک ڈیڑھ سال کی تھی۔حانا کافی خوش اخلاق سی لڑکی تھی،

دیکھا جائے تو وہ پر فیکٹ کپل لگتے تھے،شاید تھے بھی۔

ایرج اب مریم چاچی سے مخاطب ہو گئی تھی اور ان سے کہنے لگی تھی کہ وہ اوپر جا رہی ہے۔امی اسکا پوچھیں تو بتا دیجیے گا۔وہ اب ارحم کی گود میں بیٹھی زویا کو ہاتھ پکڑے اوپر لے جا رہی تھی۔

تم کہیں نہیں ہو ایرج، تم نا ہی کبھی کہیں تھی۔اس نے تم سے زیادہ پڑھی لکھی، "خوبصورت اور میچیور لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔اور یہ اس کا حق تھا ایرج۔اس کو واپس اپنی زندگی پر اثرانداز ہونے سے روکو، دنیا بڑھ چکی ہے آگے، تم بھی پڑھ چکی ہو آگے، پھر سے ماضی میں مت جاؤ"۔اس کے ذہن میں ابھرتے خیالات اس کو دوبارہ وہ برسوں بیتی کہانی یاد دلانے کی کوشش سے روک رہے تھے۔

☆=☆=☆

"His finishings are mind blowing"

فیلڈ کے اوپری منزل پر بیٹھے دو افراد آپس میں مسلسل بات کر رہے تھے جبکہ گراؤنڈ پر فٹ بال کا میچ شروع ہوئے پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ بلو ٹیم دو گول کی لیڈ سے ریڈ ٹیم سے آگے تھی۔ دس ماہ بعد ہونے والے ٹورنامنٹ کی تیاری آج سے شروع ہو چکی تھی۔

☆=☆=☆

سوئم عصر کے وقت رکھا گیا تھا۔ یہ سوئم تو نہیں تھا بس گھر کے ہی کچھ افراد آئے تھے جن کو چائے اور بسکٹ کھلایا جانا تھا۔

☆=☆=☆

ایگل میموریل فٹ بال کلب میں آئے اس کو تقریباً تین سال ہونے کو آئے تھے

اور اس نے اپنا نام بطور بیسٹ اٹیکر وہاں بنوالیا تھا۔آج کا یہ میچ بھی بہت عام سا تھا۔

مگر وہ ارمغان تھا۔ہر چھوٹی چیز اس کے لئے ایک جنگ ہوتی تھی جس کا فاتح وہ خود

کو جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی ٹھہرا چکا ہوتا تھا۔

☆=☆=☆

ایرج اب سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، ساتھ ساتھ زویا بھی قدم بڑھاتے اس کے

ساتھ چڑھ رہی تھی۔عقب میں مریم چاچی اور ارحم کی آواز آ رہی تھی۔لگتا تھا کہ

مریم چاچی پھر رو رہی تھیں اور ارحم ان کو بہلا رہا تھا۔

☆=☆=☆

گیلی گھاس پر گرتے قدم, بھاگتے وجود اور چیختی آوازیں اس بات کو واضح کر رہی تھی

.کہ ٹیم ریڈ کے کھلاڑی مسلسل گول کی کوشش میں چلا رہے تھے

فٹ بال مدثر کے پاؤں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔اس کے لمبے بال پیچھے

کو مین بن میں بندھے ہوئے تھے۔وہ ٹیم ریڈ کا اٹیکر تھا۔وہی جس کا ارمغان کے

ساتھ مقابلہ ہمیشہ رہتا تھا، جن کی بات ایک گھوسے، تھپڑ یا گالم گلوچ پر ختم ہوتی

تھی۔

☆=☆=☆

اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا اور جلدی سے زینے چڑھنے لگی۔دوسری منزل تک

جب وہ دونوں پہنچے تو گھر کا وہ حصہ سنسان لگنے لگا تھا۔جیسے وہاں کبھی کوئی بستا ہی

نہیں تھا۔وہ قدم بڑھاتے گئی۔سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا، شام کی وہ روشنی ہی کچھ حد تک اس اندھیرے کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔اس نے زویا کا ہاتھ تھام لیا اور سارہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆=☆=☆

سورج کی تپش میں خاصی کمی آگئی تھی مگر وہاں دوڑتے بھاگتے لوگوں کا پسینے سے براحال تھا, مگر جنون سا جنون تھا, شوق سا شوق تھا، فٹبال کے لئے تو پھر ہمت آہی جاتی تھی.

مدثر گول پوسٹ کی کافی قریب آگیا تھا.ارمغان بہت پیچھے کھڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ایک لمحے بعد ٹیم ریڈ کا پہلا گول ہو گیا تھا۔

اب اسکور تھا؛ دو۔ایک

☆=☆=☆

وہ دونوں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اب سارہ کے کمرے کے بلکل سامنے پہنچ گئے تھے۔سارہ کے کمرے کا دروازہ بند تھا،البتہ اس پر گلٹر حرف سے بڑا بڑا

"SARAH"

لکھا ہوا تھا۔ایرج نے دروازے کا ہینڈل گھماتے ہوئے دروازے کو دھکیلا تو وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔کمرے کی دیواریں ہلکے گلابی رنگ سے رنگوائی گئی تھیں۔

کمرے کی ایک دیوار پر سارہ کی کچھ پسندیدہ موویز کے پوسٹر چسپاں تھے۔ایک بڑا

ساپوسٹر اس کے پسندیدہ اداکار "کرس ایونز" کا بھی تھا۔ سارہ مارولز کی موویز بہت

دیکھا کرتی تھی۔

☆=☆=☆

بال پھر سے میدان میں اتر گئی تھی اور بلو ٹیم کے ایک کھلاڑی کے پاس تھی۔

حذیفہ! پاس کر!"۔ اپنے پاؤں کے انگوٹھے والے حصے سے اس نے بال کو زور"

سے اپنے سے کافی دور ایک کھلاڑی کو شوٹ کیا، بال ہوا میں اترتے اس کے پاس

جانے لگی کہ بیچ میں کسی نے ایک لمبی چھلانگ مار کر بال کی رفتار کو کم کر دیا اور بال

ٹیم ریڈ کے کھلاڑی کے قدموں میں آ گری۔

وہ شخص قد میں تھوڑا لمبا تھا اور اب فٹبال کو مختلف سمت کی طرف لے جا رہا تھا۔

بال اب بھی ٹیم ریڈ کے حصے میں تھی۔وہ تیز رفتاری سے اندھا دھند وقفے وقفے

سے بال کو مارتے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا کہ کسی نے اس کے قدموں سے بال

چھین لی،وہ بدحواس سا رکا اور مڑ کر دیکھا۔

وہ ارمغان تھا۔چہرے پر گیلے بال سامنے کو آئے ہوئے تھے،اس کی آنکھوں پر اس

وقت چشمہ نہیں تھا۔جرسی کی پوری آستینوں کو گرمی کے باعث کہنیوں تک

چڑھایا ہوا تھا اور داڑھی سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔

"It's all about pefect timing"

وہ مخالف ٹیم کے بندے جس سے اس نے بال چھینی تھی،اس کو کہتے آگے بھاگتا

گیا۔اب وہ بال کو

zig-zag

کٹنگ کے ساتھ دوسروں سے بچاتے ہوئے مخالف ٹیم کے گول پوسٹ کے قریب

لے آیا تھا۔

☆=☆=☆

ایرج اب کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھی۔کمرے میں لکڑی کی مہک آرہی

تھی۔دائیں طرف الماری تھی جو کافی نئی نئی سی لگتی تھی،دوسری طرف سنگل بیڈ

تھا۔سامنے کی طرف ایک کھڑکی تھی جس سے بالکونی کا منظر اور بالکونی میں موجود

پودے نظر آتے تھے اور کھڑکی کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی اسٹڈی ٹیبل اور ایک کرسی بھی تھی۔

☆=☆=☆

کیا بات ہے اس لڑکے کی کامران، کب سے آیا ہوا ہے یہ تمہارے کلب؟"۔"

اوپری منزل پر بیٹھے وہ دو لوگ اب بھی ارمغان کی ہی بات کر رہے تھے۔ان میں سے ایک ٹیم ٹرینر تھا اور دوسرا کلب انچارج جوان کا میچ دیکھنے آیا تھا۔

اسکور اب 1۔3 ہو چکا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ہاف ٹائم کی سیٹی ان کے کانوں میں بج چکی تھی، میدان میں بھاگتے تمام کھلاڑی اب رک گئے تھے۔

☆=☆=☆

وہ اب اسٹڈی ٹیبل کی طرف آگئی تھی جبکہ زویا بستر پر پڑے بڑے سے بھالو سے کھیلنے لگی تھی۔ایرج نے ٹیبل کا پچھلا دراز کھولا تو فون کے چار جرز، ہینڈ فریز اور پتا نہیں کیا کیا ابل کے باہر آنے لگے۔اس نے دراز کو بند کر دیا۔اب وہ بستر پر آ کر بیٹھنے لگی تھی کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ایرج نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہاں دانیال کھڑا تھا۔وہ سعد جتنے قد کا تھا البتہ گھر کے ہر افراد کی طرح اس کو بھی چشمہ لگا ہوا تھا۔گھر میں واحد فرد جو چشمہ نہیں لگاتا تھا وہ سعد ہی تھا۔

☆=☆=☆

ہالف ٹائم کے بعد میچ شروع ہوئے کچھ وقت ہو چکا تھا۔سائڈز ادل بدل ہو گئیں تھیں مگر کھلاڑی اب بھی ویسے ہی ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔

اسکور اب 3-2 ہو چکا تھا۔

بال مڈ فیلڈر کے پاس تھی جس نے لونگ پاس کر کے بال ارمغان کے ساتھ دوسرے اٹیکر کو دے دی تھی۔اب ارمغان اور دوسرا اٹیکر ایک لمبے فاصلے پر تھے مگر برابر قدم ملاتے ٹیم ریڈ کے گول پوسٹ کے قریب آ رہے تھے۔ارمغان نے اپنی رفتار تیز کر دی جبکہ دوسرا اٹیکر ایک جگہ ٹھہر گیا۔اب دونوں آمنے سامنے مگر (ترچھے) کھڑے تھے۔

☆=☆=☆

ارحم آگیا ہے، جاؤ دانیال، اس سے مل لو۔" ایرج کے اندر اب سکت ہی نہیں بچی تھی کسی سے کوئی بھی بات کرنے کی۔ وہ بس چاہتی تھی کہ سب اس کے ذہن سے نکل جائے، جو ہوا وہ بھی اور جو ہو رہا ہے وہ بھی۔ کاش سب کچھ ایک خواب ہو، کچھ حقیقت نہ ہو، سب جھوٹ ہو۔

☆=☆=☆

دوسرے اٹیکر نے بڑی مشکلوں سے بال اپنے پاس سنبھال کر رکھی اور مناسب موقع ڈھونڈ کر بال ارمغان کو لونگ پاس کر دی۔ بال ہوا میں تیز رفتار سے ارمغان کے پیروں کی جانب جا رہی تھی۔ اب یا تو وہ بال ارمغان کے پاس جاتی تھی، یا ٹیم ریڈ کا کوئی بندہ اس بال کو اپنی ٹانگ اڑا کہ روک لیتا۔ اگر اب بال ٹیم ریڈ

کے پاس آتی تو ان کو گول کرنا آسان ہو جاتا کیونکہ بلو ٹیم کے ڈفینڈرز اچھے نہیں تھے اور اگر ان کا گول ہو جاتا تو کھیل میں اسکور برابر ہو جاتا جو کہ کھیل کو اور سنگین بنا دیتا۔ بال اب بھی ہوا میں تھی۔ مگر وہ جس رفتار سے آرہی تھی ارمغان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بال اس تک کبھی نہیں پہنچنے والی۔ جو توں کو زمین میں گاڑے وہ بے حد تیز دوڑا اٹھا تھا۔

☆=☆=☆

آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟" اس کو دانیال کی آواز سرد لگی تھی، جیسے کوئی انجان" اس سے مخاطب ہوا ہو۔ ایرج نے اپنا چہرہ اٹھایا اور دانیال کو دیکھا۔ وہ چبھتی نگاہوں

سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ دروازے سے ٹک کر ہاتھ باندھے وہ کھڑا تھا۔ جب اس

نے آگے کچھ نہیں بولا تو ایرج اس کے سوال کا جواب تلاش کرنے لگی۔

مطلب ؟ میں سارہ کی چیزیں دیکھنے آئی تھی دانیال۔۔۔۔کیا ہوا؟"۔اس نے"

سوال کیا تھا جس کا جواب وہ خود ڈھونڈنے لگی۔

☆=☆=☆

اس کے سامنے اب ریڈ ٹیم کا بندہ تھا اور ارمغان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جو نہیں ہونا

چاہیئے تھا وہ ہونے لگا ہے۔اس کے چھلانگ لگانے سے پہلے ہی ٹیم ریڈ کے بندے

نے چھلانگ لگادی۔ بال اس کے سامنے گر گئی اور وہ بنا وقت ضائع کیے مخالف

سمت میں بھاگ اٹھا تھا۔ جاتے جاتے اس نے ارمغان سے زور سے کہا تھا

"It's all about perfect time you know"

ارمغان نے اس بندے کو دیکھا۔یہ وہی بندہ تھا۔

جس کو ارمغان نے یہی فقرہ کچھ وقت پہلے کہا تھا۔اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ آگے جا چکا تھا اور اس نے بال کسی اور کو پاس کر دی تھی۔ارمغان واپس اپنی جگہ پر آنے لگا تھا۔اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آستین کی مدد سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا اور پھر آنکھ ملی۔اس کو امید تھی کہ گول نہیں ہو گا مگر اسکور چند منٹ بعد ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ٹیم ریڈ اپنا کم بیک دے رہی تھی۔

اسکور اب 3-3 ہو چکا تھا۔

☆=☆=☆

بہت جلدی خیال آگیا آپ کو آپی کا اور ہمارا"۔اب کی بار دانیال نے طنز کرتے "
ہوئے کہا اور اس بار ایرج بلکل چونک گئی تھی،دانیال اتنے اکھڑے لہجے میں بات
کیوں کر رہا تھا؟ پیچھے کھیلتی زویا بھی رک کر دانیال کو دیکھنے لگی تھی۔

کیا ہوا ہے دانیال ؟میں نے کچھ غلط کیا ہے ؟ مجھے پتا ہے تم سارہ کی ڈیتھ پر افسردہ "
ہو، مگر کیا تم میرے حال کو جان سکتے ہو؟ میں تم سے زیادہ ٹوٹی ہوئی ہوں دانیال،
میں سب ٹھیک کرنے کی کوشش میں ہوں۔۔۔ تم ایسے بات کیوں کر رہے
ہو؟"۔ایرج نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا،وہ جانتی تھی دانیال کی حالت اس
وقت کیا تھی۔

☆=☆=☆

کھیل کچھ منٹوں میں ختم ہونے والا تھااور اب بھی اسکور وہی تھا۔ کبھی ٹیم بلو، ٹیم ریڈ سے بال چھینتے تو کبھی ٹیم ریڈ، ٹیم بلو سے بال چھینتے، یہ سلسلہ کچھ وقت تک چلتا رہا۔

کھیل کے آخری دو منٹ رہ گئے تھے۔ان دو منٹوں میں جس کا گول جلد ہو جاتااور وقت ختم ہو جاتاوہی فاتح ٹھہرتا۔ بال ٹیم بلو کے دوسرے اٹیکر، حسنین کے پاس تھی اور وہ اب پھر سے وہی طریقہ استعمال کر رہا تھا۔وہ اور ارمغان پھر سے آمنے سامنے بھاگ رہے تھے۔ حسنین اب بھی بال بچاتا گول پوسٹ کے قریب آرہا تھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر وہی کوشش کرنے جارہے تھے۔

☆=☆=☆

ایرج آپی آپ کو پتا بھی ہے اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ آپ مذاق کر رہی ہیں کیا؟"

"ہو کیا گیا ہے آپ کو؟ پتا ہے آج کس کا سوئم ہے؟

دانیال کے چہرے کے تاثرات وہ پڑھ نہیں پا رہی تھی۔ اسے اچانک سب کچھ عجیب لگنا شروع ہو گیا تھا۔ جیسے وہ اس گھر سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی ہو۔۔ جیسے صرف وہ ہی اس گھر کے حالات سے ناواقف ہو۔

"دا۔۔نیال۔۔۔آج۔۔۔سا۔۔رہ کا سوئم۔۔ہے نا؟"

☆=☆=☆

جب وہ دونوں گول پوسٹ قریب آ گئے تو حسنین رک گیا۔ اس کے سامنے ٹیم ریڈ کے کھلاڑی دیوار بنا کر کھڑے تھے۔ سب لوگ بکھرے ہوئے تھے، انتظار میں کہ

وہ کب بال کو شوٹ کرے گا۔اس نے ارمغان کو لانگ پاس دینے کے لئے پاؤں اٹھایا۔اس نے ارمغان پر نظر ڈالی اور وہ جو اسے ہی دیکھ رہا تھا،اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اپنی انگلی سے "نہیں" کا اشارہ،ایک اور اشارہ کیا۔

اور حسنین جو بال شوٹ کرنے کے لئے اپنے پیر اٹھا چکا تھا،اس نے رفتار کم کردی، اس نے بال کو ہلکے سے چھوا اور شوٹ کرنے کے بجائے بال کو اچانک بھاگتے ہوئے آگے لیکر چلا گیا۔دو سیکنڈ کے لئے تمام لوگ ساکت ہوگئے، مگر جیسے ہی انہیں ہوش آیا کہ انہوں نے اپنی پرانی ٹیکٹک استعمال نہیں کی تو تمام لوگ حسنین کے پیچھے بھاگے۔

اب وہ دونوں گول کے نہایت قریب تھے۔ارمغان بھی اتنا قریب تھا کہ اس کو

ہلکی پاس کرنے پر بھی بال مل جاتی۔

پاس کر!"۔ارمغان کے کہنے پر اس نے بال جو پاس کرنے کے لئے پاؤں بڑھایا"

مگر تب ہی مخالف ٹیم کے ڈیفینڈر نے بال کو ٹانگ اڑا کر ارمغان کے پاس جانے

سے روکا۔بال دوسرے ڈیفینڈر کے پاؤں میں گئی جس نے اس کو لونگ پاس

کر کے مڈ فیلڈر کو پہنچا دیا۔پورا گیم الٹنے والا تھا۔جو جیت رہا تھا وہ ہارنے والا تھا۔

☆=☆=☆

ایرج کو اپنی آواز حلق میں اٹکتی محسوس ہوئی۔اس نے بہت مشکل سے اپنا جملہ مکمل کیا۔اس کو محسوس ہوا تھا کہ دنیا پلٹ رہی ہے،اس کو اپنا آپ کمزور ہوتا محسوس ہوا۔

آج ابو کا سوئم ہے ایرج آپی،آپ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں کیا؟سارہ آپی "تو ابھی تک ملی ہی نہیں ہیں تو ان کا جنازہ کیسے ہو سکتا ہے؟سارہ آپی تو اغوا ہو گئ ہیں۔۔اور آپ ہیں۔۔(انگلی ایرج کی جانب اٹھاتے ہوئے)اس سب کی ذمے دار۔میں نہیں ہوں،آپ ہیں!"

☆=☆=☆

ٹیم ریڈ کے مڈ فیلڈر نے بال ٹیم کے اٹیکر کو پاس کر دی اور اس نے دو کھلاڑی کو ڈریبل کر کے بال کو نیٹ کے اندر ڈال دیا۔ ٹیم ریڈ کا گول ہونے کے ساتھ ہی ریفری نے سیٹی بجادی اور یوں ٹیم ریڈ آخری وقتوں میں کھیل کی بساط پلٹ کر اس میدان کے فاتح ٹھہرے۔

ٹیم ریڈ ایک گول سے جیت گئی تھی اور ٹیم بلو پریکٹس کا پہلا میچ ہی ہار گئی تھی۔

☆=☆=☆

دانیال نا چیخا، نا ہی چلایا، بس حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایرج کو دیکھتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

اور بستر کے برابر جو وہ کھڑی تھی، زویا اس کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ آج

اس کو سمجھ آگیا تھا کہ سارہ نے ٹھیک کہا تھا، اسے اپنے

Hallucinations

کا علاج کروا دینا چاہیئے تھا، ورنہ دنیا اسی طرح سر پر آکر گر جایا کرتی ہے۔

☆=☆=☆

ارمغان تو ہر چیز میں جیت جاتا ہے، "

Always the winner"

ارمغان کے برابر سے گزرتے مدثر نے طنزیہ کہا تھا مگر ارمغان نے کچھ نہیں بولا، چپ چاپ گھاس پر بیٹھا رہا۔اس کو کسی نے پانی کی بوتل لا کر دی تھی جس سے اس نے ایک دو گھونٹ پانی پیا تھا۔آج سے کچھ عرصہ پہلے ہونے والے واقعات ذہن میں دوبارہ آتے جا رہے تھے۔اور وہ کوشش کے باوجود بھی ہار تسلیم نہیں کر پا رہا تھا۔

(کچھ عرصہ پہلے)

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب مدثر کو ٹیم بلو کے لیے کھیلنا تھا۔مدثر اور ارمغان دو اٹیکرز تھے۔مگر مسئلہ وہاں پیش آیا تھا جب مدثر ٹیم بلو کی جگہ ٹیم ریڈ کے لئے ہی کھیل رہا تھا،ایک دھوکے باز کی طرح۔وہ باآسانی گول کر سکتا تھا مگر نہیں کر رہا

تھا۔ہالف ٹائم ہوا تھا جب کوئی بھی ارمغان کو دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں تپش لمحہ بالمحہ بڑھتی جارہی تھی۔

"تم ہوش میں بھی ہو؟ یا نشے کر رہے ہو؟اوپن گول مس کر رہے ہو، تم پاگل ہو؟ میں اکیلا ہوں آگے کم از کم پاسز تو لو"۔اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں،اس کے طرز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے مدثر سے مخاطب ہوا ہو۔

میں "اپنی" ٹیم کے لیے ہی تو کھیل رہا ہوں! تم بھی اپنا منہ بند کر کے کھیلو۔بہت" بن رہے تھے تم "بیسٹ اٹیکر"۔تو جاؤ! اپنے آپ کو ثابت کرو، میں تو تمہیں لائم لائٹ میں آنے کا موقع دے رہا ہوں، ضائع نہ کرو،اس موقع کو ضائع کرنے والا تم "جیسے پاگل کے سوا ہو گا بھی کون؟

اوکے, پھر ایک فیڈر پکڑو, منہ میں ڈالو اور جا کر اوڈ ینس میں بیٹھ کر اسکو چوسو۔"

اور مجھے دیکھ کر سیکھو کہ فٹبال کھیلتے کیسے ہیں، بلکہ محلے کے بچوں کے ساتھ پکڑم

" پکڑائی، چھپن چھپائی کھیلو، فٹبال تمہارے بس کا کھیل نہیں ہے۔

اور اس کے بعد تو پتہ ہی ہے کہ کیا ہوا ہو گا۔ایپیسوڈ لمبی ہو جائے گی اسی لیے)

.واپس حال میں آتے ہیں)

(حال)

گھانس پر پاوں لمبے کیے بیٹھا وہ شخص اب اپنا چشمہ اور جیکٹ اٹھا رہا تھا۔

ارمغان! زندگی میں تو تم ہارتے رہے ہو، فٹ بال میں بھی پہلی مات مبارک "

ہو۔"

وہ زیر لب بڑبڑاتا فون پر بائکیا بک کرنے لگا۔

☆=☆=☆

لیپ ٹاپ تکیے پر رکھا ہوا تھا اور وہ کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ماؤس پیڈ پر بار

بار انگلیاں چلاتے وہ متلاشی نظروں سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہا تھا جب

اس کو فون پر پیغام موصول ہوا۔اس نے فون کو دیکھا،اور لیپ ٹاپ کو ڈھک دیا۔

اب کمرے میں گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔اس نے موبائل کو کھولا۔کمرے میں وہ

واحد روشنی تھی جو اندھیر کمرے میں اس کے چہرے کو جگمگا رہی تھی۔

اس نے سرمئی ہوڈی پہن رکھی تھی۔ہوڈی کی ٹوپی سر پر تھی اوراس کے بال اس کے چہرے کو چھپا رہے تھے۔باقی کا وجود کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔فون کھولتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

اس نے میسج پڑھتے ہی ایک پن کوڈ ڈالا،فون کو کنیکٹ کیا اور کال ملائی۔دوسری طرف سے فون پہلی گھنٹی پر ہی اٹھالیا گیا۔

"یہ کیا کیا تم نے؟یہ پرسنل کام تھا جاہل،تم نے ویڈیو اپلوڈ کیوں کر دی؟"

دوسری طرف سے کسی نے بے حد طیش کے عالم میں بات کی شروعات کی تھی۔وہ اس کی بات کو تحمل سے سنتا گیا۔

"تو کیا ہوا؟ تھوڑے سے اور پیسے کما لئے میں نے تو کیا مسئلہ ہو گیا؟ تم نے مجھے ویڈیو ریکارڈ کرنے سے نہ منع کیا تھا نا اجازت دی تھی، تو اس کا مطلب تھا میں جو کروں میری مرضی!"۔ وہ پر سکون مگر تلخ لہجے میں کہتا گیا۔

"تمہیں بس اس کو مارنا تھا، پچھلی بار تو نہیں کیا تھا تم نے ایسا، اب کیوں کیا؟ بات سنو دوروس! اگر کسی نے مجھے پکڑ لیا یا گرفتار کیا تو اچھا نہیں ہو گا۔" دوسری طرف سے اب بھی اسی انداز میں بات کی گئی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میرے ساتھ اچھا یا برا نہیں کر سکتے۔ پیسے تم نے مجھے دیئے ہیں، کام میں تمہارا کر رہا ہوں مگر غلام تم میرے ہی ہو۔ میں جو ہوں تم اسے نہیں جانتے۔ میں چاہوں تو تمہاری ویڈیو کو بھی ریڈ روم میں ڈال کر پیسہ کما لوں مگر

ایسا کروں گا نہیں۔دوسری بات،وہ "لڑکی" تھی اور لوگوں کو لڑکیوں کی چیخیں

پسند ہیں، مگر یقین کرو، میں نے اس کے ساتھ "ایسا ویسا" کچھ نہیں کیا ".

اپنی بات مکمل کر کے اس نے فون ترک کر دیا۔فون کو بستر پر اچھال دیا اور خاموش

سا قہقہا لگانے لگا۔

وہ پھر سے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔دو قتل ہو گئے تھے۔اب کچھ اور رہتے

تھے۔وہ لیپ ٹاپ پر سر جھکاتے ہوئے بھی اس واقعے کو سوچتے ہوئے مسکرا رہا تھا

جو اس نے دو دن پہلے انجام دیا تھا۔

(دو دن پہلے)

کمرے کی بتی جلائی تو کمرہ سرخ ہو گیا۔اس کی آنکھیں لمحے بھر کے لیے چندھیا گئیں مگر وہ تیز تیز قدموں سے سامنے رکھے کمپیوٹر کی طرف بڑھتا گیا۔

کمرے میں کچھ نہ تھا، نا کوئی بستر، نا الماری، نا کوئی میز۔ہاں بس کمرے کے بیچ و بیچ ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جو زمین کے ساتھ مضبوطی سے جڑی ہوئی تھی۔کمرے کی ہر دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھا ہوا تھا مگر پڑھنے کے لائق نہ تھا۔ہر جگہ خون کے دھبے بھی نمایاں تھے۔

کوئی بھی اس کمرے کو ایک بار دیکھتا تو وہ پہچان جاتا کہ یہ انٹرنیٹ کے خطرناک ترین کمروں کا حصہ تھا، یہ ریڈ روم تھا۔

کمرے کے دوسرے حصے پر کچھ عجیب و غریب ہتھیار بھی پڑے تھے اور ان کے برابر کسی کا وجود تھا۔

وہ لڑکا جس کا آدھا چہرہ لال پٹی سے چھپا ہوا تھا اور آدھا کالی ٹوپی سے، وہ کمپیوٹر کے قریب آیا اور اسے کھولنے لگا، دو مونیٹر لگے تھے جن میں سے ایک پر کچھ کوڈز لکھے آ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہوئے وہ دوسرے کمپیوٹر پر ان کوڈز کو ڈال رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے فائلز کھلتی جا رہی تھیں۔ لمحے بعد ہی کمپیوٹر کنیکٹ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ٹھک۔۔ ٹھک۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی کمپیوٹر کوڈز ڈالتا، پیجز کھولتا۔ بند کرتا اور بالآخر وہ وہاں پہنچ ہی گیا۔

دس منٹ بعد وہ لائیو جانے والا تھا۔لوگ انتظار والے خانے میں آنا شروع ہو گئے

تھے۔وہ اب کمپیوٹر سے ہٹ گیا۔اب وہ کنارے میں پڑے اس وجود کی طرف

قدم بڑھا رہا تھا۔وہ وجود ویسے ہی بے جان لگتا تھا جیسے مر گیا ہو۔

وہ اس کے قریب آیا۔اس کے بندھے ہاتھوں سے اس کو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اس

کرسی کے قریب لے آیا۔ابھی بھی لائیو شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔

اس نے اس وجود کو پکڑا اور تھوڑی زحمت کر کے کرسی پر ڈال دیا۔اس نے اس

شخص کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے لے جا کر کرسی سے ہی باندھ دیا۔وہ کوئی لڑکی

تھی۔اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس کو اس نے بندھے رہنے دیا۔

اب وہ اس کے دونوں پاؤں کرسی سے باندھ رہا تھا۔وہ لڑکی اب بھی ویسے ہی بے ہوش تھی۔وہ اس کے دونوں پاؤں باندھ کر واپس کمپیوٹر کی طرف آیا۔لائیو شروع ہونے میں تیس سیکنڈ رہ گئے تھے۔اس نے جلدی جلدی کیمرہ صحیح کیا،کیمرہ اب اس لڑکی کی طرف مرکوز کیا گیا تھا۔

لائیو شروع ہو گئی تھی۔وہ مانیٹر کے سامنے اس طرح آیا تھا کہ کیمرے میں اس کی شکل نہیں دیکھ رہی تھی۔وہ اب بے تحاشہ آنے والے میسیجز کو پڑھ رہا تھا۔لوگ اس کو کرپٹو کے ذریعہ پیسے بھیج کر اپنا من پسندیدہ کام کرنے کی التجا کر رہے تھے۔وہ ساتھ ساتھ سب کے گزارش پڑھتا

جاتا۔اسے سب سے زیادہ پیسے دینے والے کی بات پر عمل کرنا تھا۔اس نے سب سے زیادہ پیسے دینے والے کو ڈھونڈا اور اس کا میسج پڑھا۔

"Rape her"

اسکرین پر اس شخص کا میسج اب بھی جگمگا رہا تھا۔اس پیغام کا مختلف رنگ تھا جو اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ اس شخص نے سب سے زیادہ پیسے بھیجے تھے۔دوروس نے بیزاری کا اظہار کیا۔

"اس میں اب مزہ نہیں آتا۔بہت کر لیا ہے یہ۔"

اس کی بے زار نظریں اب دوسرے پیغامات کی جانب متوجہ ہو گئیں۔کچھ ہی لمحے بعد اسکی نظریں ایک پیغام پر ٹھہر گئیں۔

"Make her eyes bleed"

ہاں یہ مزے کا ہے!"۔زیر لب کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔وہ بے دل تھا۔کسی جانور سے" بھی زیادہ حیوان۔

وہ بڑے بڑے قدم چلتے، مسکراتے ہوئے کمرے کے اس کنارے پر پہنچ گیا جہاں عجیب و غریب ہتھیار پڑے تھے۔دوروس وہاں جھکا اور کچھ تلاش کرنے لگا۔

چند سیکنڈز بعد اس نے ایک چشمہ اٹھایا اور اس کو دیکھتے ہوئے اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔وہ کالے رنگ کا چشمہ تھا۔وہ اب کرسی کی طرف بڑھ گیا۔پہلے

کیمرے کو چیک کیا کہ وہ چل رہا ہے یا نہیں، پھر اس لڑکی کے قریب آیا اور اس کے چہرے کے قریب جھک کر اس کو غور سے دیکھا۔اس لڑکی کی شکل سانولی سی تھی۔ وہ نا موٹی تھی نا زیادہ پتلی۔

وہ اس لڑکی پر جھکا رہا. اس زنجیر سے قید لڑکی کے قریب اب وہ چشمہ لے کر جا رہا تھا۔وہ لڑکی اب بھی بے ہوش تھی۔چشمہ والا ہاتھ اس کے چہرے کے قریب لے کر گیا اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اس کی بند آنکھیں کھولیں۔اس کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر کی طرف تھیں، وہ اب بھی بے ہوش تھی۔

وہ کیمرے سے تھوڑا ہٹا تاکہ لوگوں کو صاف دکھ سکے. وہ چشمہ اُس کی آنکھوں کے نہایت قریب لے کر گیا۔

بہت آہستہ سے مگر سخت ہاتھوں سے اس نے اس لڑکی کو وہ چشمہ پہنادیا۔ چشمہ بڑی مشکلوں سے اس کی آنکھوں میں دھنستا گیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو کی صورت میں رسنے والا گرم خون دوروس کی انگلیوں سے پار ہو کر اب اس کی ٹھوڑی سے اس کی گود پر ٹپک رہا تھا۔ آنکھوں کے پھٹے ٹکرے لڑکی کی آنکھ سے نکل گئے تھے۔ وہ وجود تڑپ اٹھا۔ اسکی آنکھوں سے نکلتا خون اس بات کو واضح کر رہا تھا کہ وہ چشمہ صرف "چشمہ" نہیں تھا۔اس چشمہ کے اندرونی حصے پر دو کیلیں لگی تھیں جنہوں نے اس لڑکی کی آنکھوں کو پھاڑ دیا تھا اور اب وہ اس لڑکی کے چہرے کے اندر گھس چکی تھیں۔ آنکھوں میں سوراخ ہو گیا تھا۔اس کی آنکھوں

سے نکلتا خون اس کے پورے چہرے کو سرخ کرتا جا رہا تھا۔دو تین چھینٹے دوروس

کے چہرے پر بھی لگے جس کو اس نے اپنی ٹی شرٹ کی مدد سے صاف کیا۔

دوروس نے اپنے ہاتھ اس لڑکی سے ہٹا لیے۔لڑکی بھی اب تڑپنا بند کر چکی تھی۔

کمرے میں ہولناک سی خاموشی چھا گئی تھی۔دوروس اب اپنے ہاتھ لڑکی کے

چہرے تک لے کر جاتا ہے۔اس کے چہرے سے اس پر لگا خون پوچھنے لگتا ہے۔

چہرہ خون سے ڈھکا ہوا ہے،اب بھی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے

تھے۔اب وہ اپنے ہاتھ سے اس کے چہرے کو چھو رہا تھا،اس کے انگوٹھے پر خون لگتا

ہے۔

وہ اپنے ہاتھ کو اپنے لبوں کے قریب لے کر گیا اور اپنے ہاتھ کو اپنے لبوں پر رکھ دیا۔ انگلیوں پر لگا خون اس کے لبوں تک منتقل ہو گیا ہے جس کو وہ زبان کی مدد سے چاٹتا ہے۔

"This vibrant taste"

وہ زیر لب کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تھا ہے اور واپس مانیٹر تک آنے لگا تھا کہ جب اس کے پاؤں سے کچھ ٹکرایا۔ اس نے ہزمین کی طرف دیکھا تو وہاں کسی قسم کا کارڈ پڑا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کارڈ اٹھایا۔ وہ کوئی اسٹوڈنٹ کارڈ لگتا تھا۔

کارڈ پر لگے خون کے قطروں کو اس نے اپنی انگلیوں کی مدد سے صاف کیا اور زبان لگا کر چکھا اور آنکھیں بند کر کے مسکرایا۔

"Why does blood taste so good?"

اس نے کہتے کہتے کارڈ پر لکھے نام کو پڑھا، یقیناً وہ کارڈ اسی لڑکی کا تھا۔ نام پڑھ کر اس نے ایک بے زبان سا قہقہہ لگایا ہے اور کارڈ کو زمین پر اچھال دیا۔ اب اس نے اپنے قدم کمپیوٹر کی جانب بڑھا دیے تھے۔

اب باری تھی دوسرے اور آخری ٹارچر کی۔

☆=☆=☆

زویا کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ اب وہاں واحد وجود اسی کا تھا۔ وہ جسے اپنا آپ، اپنا وجود خود ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ زندگی نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ جو کچھ اس نے اپنے دل و دماغ میں جھوڑنے کی کوشش کی تھی وہ سب واپس تہس نہس ہو گیا تھا۔

وہ سر پکڑے بستر پر آ بیٹھی تھی۔ زمین پر نظر گاڑے وہ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دو دن سے وہ جس خوابیدہ بلبلے میں اپنی زندگی گزار رہی تھی، وہ لمحے پہلے کوئی پھوڑ کر گیا تھا۔ اور اب۔۔۔ اب ہر بات معنی بنا رہی تھی۔ جو سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ بالآخر آپس میں جڑنے لگا تھا۔

(دو دن پہلے)

گاڑی کی بتیاں اس کی آنکھوں کو دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ بے دماغی میں وہ اس ہجوم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مغرب کی اذانیں ختم ہو چکی تھیں اور آسمان سرمئی سے سیاہ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

لوگوں کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔اس کے قدم دھیمی رفتار سے بڑھتے گئے اور دل تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔بالآخر وہ ہجوم کے قریب پہنچ گئی تھی۔اس کے سامنے کوئی شخص کھڑا تھا جو اس کی آنکھوں سے وہ منظر ڈھک رہا تھا۔

ایرج نے اپنے ہاتھ اٹھا کر اس کو کسکنے کا کہا تو وہ بنا کچھ بولے اس کے سامنے سے ہٹتا چلا گیا۔منظر صاف ہوتا گیا،دل ڈوبتا چلا گیا۔

اس نے دیکھا کہ کوئی عورت اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی اور ایرج اس کی قمیض کو دیکھ کر جان گئی تھی کہ وہ عورت سارہ نہیں تھی۔ایرج کی اٹکی سانسیں بحال ہوئی اور پھر۔۔۔۔۔

مگر۔۔۔۔۔

اس کا ذہن ایک بار پھر الجھتا گیا۔

اگر سارہ یہاں نہیں تھی تو کہاں تھی؟

وہ بے جان قدموں سے تقریباً بھاگتی ہوئی اس کیفے میں داخل ہوئی۔

سارہ وہاں بھی نہیں تھی۔

وہ باہر آگئی۔اس نے سارہ کو ہجوم میں تلاشنے کی کوشش کی۔

سارہ وہاں بھی نہیں تھی۔

اس نے سارہ کو اور جگہوں میں تلاش کیا مگر اس کو سارہ کہیں بھی نہیں ملی۔ ایرج کے کانوں میں ایمبولینس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یا پھر وہ پولیس کی تھی۔ اس نے اپنے چھوٹے سے پرس سے فون نکالا، فون پر گھر سے دو تین کال آئی ہوئی تھیں۔ یقیناً ایرج کے گھر والے اس کی اور سارہ کی واپسی کے منتظر تھے۔ وہ اب ان کو کیا بتائے کہ سارہ۔۔۔۔۔

(حال)

ایرج کو اس کے آگے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ وہ اس کے بعد کہاں گئی تھی؟ اس کے ساتھ آگے کیا ہوا تھا، وہ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں میں رکھ کر ان کو ڈھک دیا۔ آنکھوں کے سامنے

اندھیرا چھاتا گیا۔اسے اب کوشش کرنی تھی،اب اسے اور کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا تھا۔اب حقیقت سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

(دو دن پہلے)

اس نے پرس سے فون نکالا۔ابو کی کال آرہی تھی۔اس کا دل بھاری ہونے لگا،وہ ان کو کیا کہے گی؟ وہ ان کو کیا بتائے گی؟ غائب دماغی سے اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے جاوید کی آواز آئی۔

"سارہ کہاں ہے ایرج؟ سارہ تمہارے ساتھ گئی تھی، کہاں ہے وہ؟"

اور وہ آگے سے کچھ نہ کہے پائی،اس کے قدموں سے جان نکلنے لگی تھی۔وہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی،فون اب بھی ویسے ہی تھاما ہوا تھا۔

ابو، ابو۔۔وہ۔۔۔۔"وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔"

"ایرج گھر آؤ فوراً، جلدی گھر آؤ۔ کہاں ہو تم؟"

وہ ان کی بات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ کیا کہہ رہے تھے؟ کیا سارہ گھر پہنچ گئی تھی۔

ابو کیا ہوا ہے؟ سارہ گھر پہنچ گئی ہے؟"اس کے لبوں سے بس اتنا ہی نکل سکا۔"

یعنی سارہ تمہارے ساتھ نہیں ہے، یا خدا۔۔۔۔ایرج۔۔ابھی کسی نے بھائی جان" کو ایک تصویر بھیجی ہے اور وہ شخص کہہ رہا ہے کہ وہ بدلہ لینے واپس آ گیا ہے۔ سارہ

کواس نے اغوا کر لیا ہے۔ایرج تم گھر آؤ جلدی، نسیم کو دل کا دوڑا پڑا ہے میں اور

"دانیال ہسپتال جا رہے ہیں۔تم گھر پہنچو جلدی۔

ابا اس تصویر میں کیا۔۔۔"اس سے پہلے وہ ان سے پوچھتی کہ اس شخص نے"

تصویر میں کیا بھیجا تھا، کال کٹ گئی۔موبائل اس کی گود میں آ گرا۔اس نے دونوں

ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں مسلیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے، ابھی تو سب ٹھیک تھا، یہ میں نے کیا کر دیا اللہ! سارہ میرے

"ساتھ تھی۔۔۔اب کہاں ہے وہ۔۔۔

اس کو اپنے قریب سے گزرتا سایہ محسوس ہوا۔اس نے یکدم سر اٹھا کر دیکھا۔

پولیس کے دو اہلکار ایک نوجوان کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔

اور وہ نوجوان ایرج کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔اس کے پیلے دانت باہر کو نکلے ہوئے

تھے۔یہ وہی شخص تھا جس کی گاڑی سے وہ عورت تک ٹکرائی تھی۔

ایرج کو uncomfortable

سا احساس ہوا۔وہ فٹ پاتھ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔بے دماغی سے وہ قریب کھڑے

رکشے کو اپنے گھر کا پتہ بتا رہی تھی۔

سارہ مر گئی ہے،چاچو کو ہارٹ اٹیک آیا ہے۔وہ بچ گئے تھے۔سارہ مر گئی"

ہے۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔چاچو کا انتقال۔۔۔۔نہیں سارہ۔۔۔سارہ میری کی غلطی

"سے۔۔۔

وہ اپنا سر پکڑ کہ بیٹھ گئی تھی۔اس کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ہوا کیا تھا۔وہ ایک ٹائم پر

وقت کے phase کہی دو باتوں کو ایک

میں گڈمڈ کر دیتی تھی۔۔۔

(حال)

اس نے اپنی آنکھوں پر رکھے ہاتھ باہر ہوتی اذان کی وجہ سے ہٹائے۔اس کے ہاتھ

بھیگ گئے تھے۔اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا.بے یقینی میں وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سارہ کہاں تھی؟

ایک سوال اس کے ذہن کو الجھاتا جا رہا تھا، جہاں بہت الجھی باتیں سلجھنے لگی تھیں

وہاں نئی باتیں، نئے سوالات ذہن کو واپس سے الجھانے لگے تھے۔

وہ آنسو صاف کرتے اٹھ کھڑی ہوئی اور اب سارہ کے کمرے سے باہر نکلنے لگی تھی۔

اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔وہ سونا چاہتی تھی۔سب سے پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آیا تھا وہ یہ تھا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیئے۔اس کو اپنا مکمل چیک اپ کروانا تھا کیونکہ ایک غلطی وہ کر چکی تھی، جس نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔

وہ دروازہ بند کرتے وہاں چپکے ان حروف کو دیکھنے لگی۔

"SARAH"

۔"سارہ نسیم صدیقی، تم کہاں ہو؟"

ایک سوال تھا،اور جواب کوئی نہیں تھا۔کم از کم اس کو اب دنیا کی دکھائی اور بتائی کسی بات کا یقین نہیں رہا تھا۔اس کو تو اپنا بھی یقین نہیں رہا تھا۔

☆=☆=☆

بے جان ہاتھوں سے اس نے چابی گھمائی۔بوجھل قدموں کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوا۔سامنے ہی گبی اس کا منتظر تھا۔اسے دیکھ کرار مغان کو یاد آیا تھا کہ وہ اس کا کھانا پھر سے لانا بھول گیا تھا۔آج بھی ڈرگ مارٹ(میڈکل اسٹور یا پارمیسی)میں اس کی رات کی شفٹ تھی اور اس وقت مغرب کا وقت ہونے لگا تھا۔

کمرے میں آکر اس نے گھر کی چابی اور فون ایک طرف اچھال دیا اور خود بستر پر گر پڑا۔اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔مگر اس کو کوئی غصہ نہ تھا۔بس ۔۔۔اسے دنیا بری لگ رہی تھی۔پہلے بھی لگتی تھی مگر آج کے بعد اور بری لگنے لگی تھی۔

"آج میں اس جگہ ہار گیا جہاں میں اپنوں سے جیت کر آیا تھا۔آج پہلی مرتبہ یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہار کیا ہوتی ہے، ہار تکلیف دہ ہوتی ہے، پتا ہے گبی آج مجھے اتنا افسوس کیوں ہے؟ کیونکہ آج مجھے لگتا ہے کہ مجھ پر کی گئی مار پیٹ، میری محنت اور میرا اچنا گیا راستہ، سب رائیگاں چلا گیا ہے۔آج لگ رہا ہے کہ ماں باپ نے صحیح کہا تھا۔جن کو میں نے جیت جانے کی دھمکی دی تھی، آج تو وہ میری ہار دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔"اس کے سینے پر بیٹھا وہ بلا اس کی باتوں کو غور سے سن رہا تھا۔ سمجھ میں آ رہی تھی یہ پتا نہیں مگر ہاں اس کو غور سے ضرور دیکھ رہا تھا۔وہ اپنے پورے دن کی داستان اس کو سنا دیتا تھا۔

ارمغان نے اس بلے کے سر کو سہلاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، اس کی آنکھوں

میں درد ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند کرنے کے باعث آنکھوں کے کنارے پر اٹکا آنسو

اس کے چہرے سے گر کر بستر کی چادر میں جذب ہو گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس

نے اپنی آنکھیں ملیں۔ اس کا دماغ خیالوں کے انبار میں ڈوبتا چلا گیا اور ایک اچھی یاد

اس کے ذہن کے پردے پر آکر کسی فلم کی طرح چلنے لگی۔ اور یہ پہلی بار تھا کہ اسے

اس انجان لڑکی کے علاوہ بھی کوئی یاد آئی تھی۔

(کئی سال پہلے)

آپی یہ تو فٹ بال نہیں ہے،اس سے کیسے کھیلوں گا میں، یہ تو بہت چھوٹی ہے۔۔""

اس کی بہن اور وہ چھت پر کھڑے تھے جب اس کی بہن نے اپنے دوپٹہ سے ایک

گیند نکال کر اس کے حوالے کی تھی۔

پاگل بڑی والی بہت مہنگی تھی اور ابا دیکھ لیتا تو اسی بال کی طرح ہم دونوں کو بھی"

فٹبال بنا دیتا۔" وہ کہتے کہتے کھلکھلائی اور وہ جو افسردہ تھا اس کے چہرے پر بھی ایک

مسکراہٹ نمودار ہو گئی

اس چھوٹی سی بال سے وہ دونوں روز چھت پر آتے اور کھیلتے۔ہادیہ کو اپنا ایک بھائی

ہی اس گھر میں اپنا لگتا تھا۔اس کا گھر سے باہر جانا منع تھا تو اس کا بھائی ہی اس کا

دوست تھا۔وہ اپنی تمام باتیں اسے بتاتی تھی۔وہ بھی اپنی تمام باتیں اسے ہی بتاتا

تھا۔ہادیہ کو پتا تھا کہ اسے فٹ بال کھیلنے کا کتنا شوق تھا۔اس لئے وہ بے حد مشکلوں سے اس کے لئے فٹ بال خریدنے کے پیسے جمع کر رہی تھی۔وہ دونوں پڑھائی کا بہانہ بنا کر چھت پر آتے اور مغرب ہوتے ہی گھر میں چلے جاتے۔ان کی زندگی نہایت مشکل تھی، مگر ان مشکلوں میں بھی وہ دونوں بھائی بہن اپنی زندگیوں میں گم خوشیوں کے ٹکرے ڈھونڈ ہی لیتے تھے۔

مگر یہ خوشی بھی زیادہ دن نہیں ٹکی تھی۔ایک دن ایسے ہی وہ دونوں چھت پر کھیل رہے تھے کہ ان کا باپ اچانک چھت پر آگیا۔ہادیہ کو چوٹی سے پکڑ کر نیچے لے کر گیا اور خود واپس چھت پر آگیا جہاں وہ ڈرا سہما بچہ بے جان کھڑا تھا۔چھت کے ادھر ادھر کے گھر سے لوگ بھی اپنی اپنی چھتوں پر دیکھنے آ گئے کہ شور کیوں ہو رہا ہے۔

انہوں نے دیکھا کہ بچے کا باپ اس کو بیلٹوں سے مار رہا تھا،اس کی ماں اور اس کی بہن اسکو روک رہے تھے مگر وہ ان کو جھٹکتا رک نہیں رہا تھا۔جب وہ تھک گیا تو اس زمین پر پڑے اپنے بیٹے کو پاؤں میں پہنی پشاوری چپل کھینچ کے ماری اور چلا گیا۔

اور بچہ رو رہا تھا۔اس کے جسم سے خون نکل رہا تھا اور وہ بلک رہا تھا۔اس کی بہن اس کی مرہم پٹی کر رہی تھی اور اس کی ماں اسے روتے روتے چپ کروانے کی کوشش میں تھی۔وہ ننھا بچہ کچھ بولنے کی کوشش میں تھا۔وہ مسلسل اپنی ماں سے کچھ کہہ رہا تھا۔

مجھ سے غلطی ہو گئی ابا۔نا مارو مجھے۔۔۔امی ابا مجھے کیوں مارتا ہے۔۔۔میں نے تو" کچھ نہیں کیا تھا۔۔۔ابا مجھ سے ناراض ہے امی؟مجھے بتائیں نا میں کیا کروں کہ ابا مجھ

سے خوش ہو جائے اور مجھے کبھی نا مارے۔۔۔امی بتائیں ناں۔۔"۔وہ چھوٹی چھوٹی سانسوں کے بیچ کہتا جا رہا تھا۔اس کی بہن اپنی ماں کو کہہ رہی تھی کہ وہ اس جانور سے طلاق لے لے مگر اس وقت تو طلاق کو چہرے پر لگی کالک سے تشبیہ دی جاتی تھی۔

(حال)

ایک دم ارمغان کی آنکھیں کھلیں۔گی اب جا چکا تھا۔اس نے سر اٹھا کر گھڑی کو دیکھنے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے۔اس نے آنکھوں کو ملا، پھر گھڑی خود دیکھا تو آٹھ بج گئے تھے۔وہ ایک گھنٹہ سو گیا تھا؟وہ اٹھا

اور فون ہر نظر دوڑانے کے بعد بے دلی سے فون بند کر دیا، اپنی چابی اور والٹ جیب میں ڈالا اور اپنے بلے کا کھانا لینے باہر چلا گیا۔

اس کا ذہن اب بھی اس "اچھی" یاد کے حصار میں تھا مگر پتا نہیں کیوں اس کی اچھی یادوں میں بھی بری یادوں کا شامل ہونا ضروری ہوتا تھا؟

وہ مارکیٹ سے گھر واپس آیا اور گبی کا کھانا بنانے لگ گیا۔ اس کی شفٹ شروع ہونے میں ابھی دو تین گھنٹے تھے اور وہ اس وقت سونا چاہتا تھا۔ گبی کو کھانا دے کر اس نے اپنے فٹ بال کی کپڑوں کو تبدیل کیا اور نہا دھو کر ایک سفید شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں سونے چلا گیا۔ کمرے کو بالکل اندھیر کر دیا۔ اب وہ صرف خاموشی اور سکون چاہتا تھا۔

☆=☆=☆

(حال سے دو سال پہلے)

اسکول میں اسمبلی کا وقت ہونے لگا تھا۔ طلبات گراؤنڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ بھی اپنا بیگ اتارتے ہوئے اسمبلی ہال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے راستے میں ہی

اپنے دوست مل گئے۔ وہ ان سے باتیں کرتا گراؤنڈ میں داخل ہونے لگا تھا۔

☆=☆=☆

وہ قدم بڑھاتے کمپیوٹر کی طرف واپس بڑھ گیا. اسٹوڈنٹ کارڈ اب بھی زمین پر

ویسے ہی پڑا ہوا تھا۔ مانیٹر کے قریب آتے ہی وہ متلاشی نظروں سے زیادہ رقم والا

پیغام تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پیلے رنگ میں ایک پیغام جگمگایا۔اس کے

چہرے پر خوشی بھر آئی۔

"Sew her"

اس کو ایک لمحے کے لئے عجیب محسوس ہوا مگر اس کے لئے پیسے معنی رکھتے تھے۔

"!انسانیت سے پہلے پیسہ"

وہ واپس کمرے کے کنارے میں چلا گیا اور کچھ ڈھونڈنے میں مصروف ہو گیا۔

☆=☆=☆

گراؤنڈ میں اب قومی ترانے کی آواز گونج رہی تھی۔ تمام اسکول وہاں قطاروں میں جمع تھا۔ سب ایک ساتھ قومی ترانہ پڑھ رہے تھے۔ سعد بھی ہلکی آواز سے قومی ترانہ پڑھ رہا تھا۔ اس کے آگے اس کے دوست حارث اور انس کھڑے تھے۔ وقفے وقفے سے وہ دونوں کو دیکھتا، وہ مسلسل کسی سوچ میں گم تھا۔ قومی ترانہ تھوڑی دیر بعد ختم ہو گیا اب سارے بچے قطار میں ہی اپنی اپنی کلاسز میں جانے لگے تھے۔

☆=☆=☆

تھوڑی دیر ڈھونڈنے کے بعد اس کو ایک لمبی اور موٹی سوئی مل گئی۔ ساتھ ہی کافی تیز مانجھا بھی تھا۔ وہ اس کو اٹھاتے اس کرسی پر مری پڑی لڑکی کے پاس لے آیا تھا۔

وہ مر چکی تھی۔اس کی سانسیں رکی ہوئی تھی مگر اس کی اور لوگوں کی حوس ابھی کہاں ختم ہوئی تھیں۔وہ اس کے سامنے گھٹنے کے بل بیٹھ گیا۔سرخ خون چہرے پر سوکھ چکا تھا۔اس کو پتا تھا کہ جو وہ کرنے والا تھا اس سے خون نہیں نکلے گا مگر وہ بند اور سلے ہونٹوں کے ساتھ اور بھی اچھی لگنے والی تھی۔

☆=☆=☆

جب اس کی قطار چلنے لگی تو سعد کو متلی سی ہوئی۔وہ سہارے کے بل جھکا، بھاگتے ہوئے پاس ہی بنے غسل خانے کی طرف گیا۔اس کے دوست بھی اس کے پیچھے بھاگے تھے۔

وہ بیسن پر جھکا ہوا تھا، مگر اس کو متلی نہیں ہوئی تھی۔

پہلا مرحلہ تو پار ہوا، اس کو کال ملاؤ یا میسج کرو جلدی"۔ آہستگی سے انس نے کہا تو"

وہ واش روم میں داخل ہوا اور اس کو اندر سے بند کر دیا۔

اب وہ اپنے جوتے میں چھپے بٹن والے چھوٹے سے فون پر اس کا نمبر ملا رہا تھا۔

☆=☆=☆

وہ اب مانجھے کو اس موٹی سوئی سے باندھنے لگا تھا۔ کیمرہ اب بھی ویسے ہی کھلا تھا مگر وہاں بس دوروس کی پشت نظر آرہی تھی۔ بلآخر تھوڑی دیر بعد جب وہ مانجھے کو سوئی پر باندھنے میں کامیاب ہو گیا تو اس لڑکی کے چہرے پر جھک گیا۔ وہ اتنا قریب تھا کہ اس کے سر پر جمی ٹوپی لڑکی کے ماتھے سے ٹکرا رہی تھی۔ اب وہ تھوڑا سا کھسکا تا کہ کیمرے میں منظر صاف ہو جائے۔ وہ اب سوئی کی نوکیلی طرف کو اس کے

ہونٹوں تک لے کر جا رہا تھا۔اس نے دوسرے ہاتھ سے اس لڑکی کے چہرے کو ذرا اوپر کی طرف کیا ہوا تھا۔وہ کالا چشمہ اب بھی ویسے ہی اس کی آنکھوں میں دھنسا ہوا تھا۔

☆=☆=☆

اس نے بار بار کال کرنے کی کوشش کی مگر کوئی جواب موصول نہیں ہوا.اس کو ذرا سی پریشانی ہوئی۔وہ اب کیا کرے؟

کچھ سوچتے ہوئے اس نے فون پر پیغام لکھنا شروع کیا اور لکھ کر بھیج دیا۔دو سیکنڈ بعد ہی جواب آگیا تھا جس کو دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔

اس نے جواب کھولا اور پڑھا۔

کال مت کرنا آئندہ، اسکول کی پچھلی طرف، ہرے رنگ کے گھر کے برابر۔"

"جلدی آؤ۔

جواب پڑھ کر اس کی امید بندھ گئی۔اب دوسرے مرحلے کو پار کرنے کی باری تھی۔

☆=☆=☆

اس نے سوئی اس کے لبوں میں چبھوئی، تھوڑی سی جان لگانے سے سوئی اندر کی طرف سے باہر نکل آئی۔پہلا ٹانکا لگ گیا تھا۔ایسے ہی اس نے اوپری ہونٹ کو بھی پرو دیا، مانجھا اب دونوں ہونٹوں کے بیچ سل گیا تھا۔ہونٹ جامنی ہو گئے، اس کا چہرہ ٹھنڈا ہو گیا تھا

ایسے ہی دو تین بار اس نے سوئی کے ذریعے اس لڑکی کا منہ مکمل طور پر سل دیا۔

اس کے ہونٹ آڑھے ترچھے طریقے سے مانجھے سے سلے ہوئے تھے۔اب اصل کام کی باری تھی۔

☆=☆=☆

وہ واش روم سے نکلا تو حارث اور انس اسی ہی کا انتظار کر رہے تھے.

"وہ باہر ہی کھڑے ہیں. وہ مجھے پولیس تک اور شیلٹر تک پہنچا دیں گے."

وہ کہتے کہتے رکا۔ان دونوں کے چہرے پر فکر مندی تھی۔حارث اپنی جیب سے کچھ رقم نکالنے لگا۔

سعد، میں تمہاری جتنی مدد کر سکتا تھا، میں نے کی، میں چاہتا ہوں کہ تمہیں"

انصاف ملے۔ کیا تم واقعی یوں کسی انجان پر بھروسہ کر لو گے؟ کیا تم واقعی اپنا گھر

"چھوڑنا چاہتے ہو؟

وہ اب پریشانی سے اسے رقم تھما رہا تھا۔ اسکول میں اس کے بھاگنے کے بعد ان

دونوں کی شامت آنی تھی مگر جو سعد کے ساتھ ہوا تھا اس کے لیے وہ کسی بھی طرح

اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔

حارث جو میرے ساتھ ہوا ہے وہ ایسا کچھ ہوا ہے جس کو سمجھنے میں میں نے پہلے "

ہی بہت دیر کر دی ہے۔ میری زندگی یہاں آکر رک گئی ہے۔ اب یا تو میں اس

اسکول کو پار کر کے زندگی میں جیت جاوں یا پھر سب واپس سے کھو دوں۔ میں

دانیال پر بھروسہ کرتا ہوں، وہ سب جانتا ہے اور اسی نے مجھے ان بھائی کا پتا بتایا ہے۔

"وہ میری مدد ضرور کریں گے۔

☆=☆=☆

ہونٹ سل گئے تھے اور اس نے اب مانجھے اور سوئی کو الگ کر دیا تھا۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔وہ کمپیوٹر کے قریب آیا اور ایک پیغام لکھنے لگا۔

"Should i do it?"

☆=☆=☆

حارث کے ہاتھ سے رقم تھماتے وقت اسے محسوس ہوا تھا کہ کوئی ٹیچر واش روم کی طرف آرہی تھیں۔اس نے جلدی سے رقم تھامی اور واپس واش روم میں گھس

گیا۔وہ کموٹ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا اور وہاں ہلکی رفتار سے چلتے پنکھے کو ہاتھ سے روکا اور اسے اکھاڑنے لگا۔وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ لینے لگا تھا۔وہ اپنا سیوئیر خود تھا۔اسے خود پر بھروسہ تھا۔چند منٹوں بعد وہ پنکھا اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا مگر اب بھی اس میں پنکھے کے ٹکرے باقی تھے۔وہ اتنی جگہ تھی کہ اس میں سے سعد مشکل سے ہی صحیح مگر نکل جاتا۔اب وہ ہاتھوں سے اس کھڑکی میں اٹکے ٹکروں کو نکالنے لگا تھا۔

☆=☆=☆

جب اس کے سوال کے جواب پر سب نے "ہاں" لکھا تو وہ کمپیوٹر سے ہٹ کر واپس اسی کرسی تک آیا۔ وہ واپس اس لڑکی پر جھکا اور کیمرے پر پانچ انگلیاں دکھانے لگا

ایک ایک کر کے وہ انگلیاں بند کرتا گیا اور بالآخر اس کی آخری انگلی بند کرنے پر اس نے باہر نکلے مانجھے کو کس کر پکڑا، اس کو ڈرل مشین سے باندھا اور ڈرل مشین کو چلا دیا۔

اس کا ہاتھ مکمل طور پر مڑ گیا تھا۔ اس نے ڈرل مشین کی رفتار کم کر دی اور پھر اس کو روک دیا۔

اس لڑکی کا ہونٹ اور اس کے چہرے کا مکمل نچلا دھڑ چہرے سے جدا ہو گیا تھا۔

اس کے بچے کچھے دانت دکھنے لگے تھے۔ سکن لٹک گئی تھی۔ خن بھی تھاڑا بہت

نکل رہا تھا۔

وہ اب قدم بڑھاتے کیمرے کو بند کرنے لگا تھا۔

☆=☆=☆

جب سعد نے مکمل طور پر وہ ٹکڑے نکال لئے تو اس نے سب سے پہلے اپنے پاؤں کو

اس کھڑکی نما سوراخ سے باہر نکالنے کی کوشش کی، پاؤں تو مکمل باہر نکل گئے۔

اپنے اوپری جسم کو باہر نکالنے کے لیے اس نے ایک لمبی سانس اندر کو کھینچی اور خود

کو باہر دھکیلنے گا۔ تب ہی اس کو واش روم کا دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس کو

بہت سی خراش آنے لگی تھیں۔اس کو پتہ تھا کہ اگر وہ چند منٹ میں نا نکلا تو اسکول

والے اس کی طرف گارڈ بھیج دیں گے۔واش روم کے اندر سے ہاتھ پر جان لگاتے

وہ خود کو نکالنے لگا۔بے تحاشہ خراشوں کے ساتھ وہ مٹی پر گر پڑا تھا۔جسم کے ہر

حصے میں ٹھیس اٹھ رہی تھی۔وہ اسکول سے نکل گیا تھا۔اس کے چہرے پر شیشہ

چبھا ہوا تھا مگر وہ اب اسکول سے دور بھاگ رہا تھا۔اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔اسے

بس اس ہرے گھر کی تلاش تھی۔

☆=☆=☆

وہ لڑکی کرسی پر اب بھی ویسے ہی آدھے چہرے کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔اسکا باقی

آدھا چہرہ اسکی گود میں تھ۔دوروس نے اس کے ہاتھ پاؤں نہیں کھولے اور کمرے

سے باہر نکلنے لگا کہ اس کی نظر اس اسٹوڈنٹ کارڈ پر پڑی، اس کو جیسے کچھ یاد آیا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ واپس کمرے میں آیا اور اس اسٹوڈنٹ کارڈ کو اٹھا کر فون سے اس کی تصویر بنانے لگا۔ اس کے چہرے پر اب نہ کوئی مسکراہٹ تھی، نہ کوئی سنجیدگی، اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ تصویر لینے کے بعد اس نے کارڈ پر لکھے نام کو پڑھا۔

"سارہ نسیم صدیقی"

بہت افسوس سارہ، مگر یہ میرا کام ہے، اور مجھے میرا کام اس دنیا میں بستے لوگوں سے لاکھ گناہ پسند ہے"۔ بے نیازی سے کہتا وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کارڈ اپنی جیب میں ڈال دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ تصویر اب کسی کو بھیج رہا تھا۔

☆=☆=☆

سعد کو ہرا گھر بہت جلد ہی مل گیا تھا۔وہ گھر سے کافی نزدیک تھا۔اس نے

لڑکھڑاتے قدم گھر کی طرف قدم بڑھادیئے اور سعد کو وہ وہاں ہی کھڑا مل گیا۔

سعد اس کے قریب آیا اور اس کے ہاتھ کو چھوا تو وہ یک دم پلٹا، پھر مسکرایا، اس کے

چہرے پر سرجیکل ماسک تھا۔اس نے میرون رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔

آپ ہیں وہ؟"اس نے پریشانی سے پوچھا۔"

جی میں ہوں 'وہ' مگر اس 'وہ' کا بھی ایک نام ہے۔دانیال نے نہیں بتایا؟"وہ"

مسکراتے ہوئے تیز قدموں سے چل رہے تھے

جی اس نے آپ کا نام بتایا تھا، مگر وہ نام تو بہت عجیب تھا، ایسا نام تو میں نے کبھی "

"نہیں سنا۔

اچھا، تو اس نے میرا کیا نام بتایا تھا؟"۔اس کی بات پر وہ ہنس اٹھا تھا۔اب کی بار اس "

نے سوال کیا۔

"دوروس، یہ کیسا نام ہوا بھلا؟ اس نام مطلب کیا ہے؟"

یعنی صحیح نام بتایا اس نے تمہیں، دوروس عجیب نام لگتا ہے تم کو؟ دوروس کا"

مطلب ہوتا ہے خدا کا تحفہ! لیکن اگر تمہیں یہ عجیب لگتا ہے تم مجھے ایک اور نام

سے بھی پکار سکتے ہو"۔اب اس کی مسکراہٹ پھیکی ہوئی

اور وہ نام کیا ہے؟"سعد نے سوال کیا۔وہ دونوں سامنے کھڑی سیاہ رنگ کی "

'Porsche 356A'

کی طرف بڑھ رہے تھے۔انصاف کی طرف بڑھتے قدم۔۔۔

ارمغان۔۔۔۔تم مجھے ارمغان کہہ کر بلا سکتے ہو،مزے کی بات یہ کہ اسکا"

مطلب بھی دوروس جیسا ہی ہے! یہ نام تو عجیب نہیں ہو گا نا؟"اس کے چہرے پر

مسکراہٹ طاری ہو گئی۔وہ اب گاڑی میں بیٹھنے لگے تھے۔

اوکے۔۔۔یہ صحیح ہے۔ارمغان بھائی۔۔دانیال نے کہا تھا کہ آپ میری مدد"

"کریں گے،آپ میری مدد کریں گے ناں؟

بلکل،میں تمہاری مدد کرنے کے لیئے ہی تو آیا ہوں سعد۔آخر ہم دونوں کی کہانی"

"!بھی تو ملتی جلتی ہے

سیاہ پور سے اب کراچی کی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ وہ اب پولیس اسٹیشن جارہے تھے۔۔۔۔ مگر ایسا سعد کو لگتا تھا۔ کیا وہ واقعی پولیس اسٹیشن جارہے تھے؟

☆=☆=☆

جرح

قسط نمبر تین

کچھ ملاقاتیں، چند سوالات

"پچھلی قسط میں ہم نے پڑھا تھا کہ۔۔۔!

(از قلم تحریم علی)

یادوں میں اور بری یادوں میں ہم ساتھ رہیں گے."

اخبار کھولا تو نظر اوپری جانب کی ایک خبر پر پڑی، خبر کراچی کے مشہور شاپنگ سینٹر ہارون میں ہوئی ایک واردات کی کہانی سنا رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی تو اس

نے پایا کہ وہ خبر ایک بلبلے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔اختبار سے نکلتا وہ بلبلہ اب ہوا میں ادھر ادھر منڈلا رہا تھا، لمحے بعد وہ بلبلہ اپنے اندر ایک منظر پیش کر رہا تھا، ایرج کی آنکھوں نے اس منظر کا تعاقب کیا اور اس ننھے بلبلے نے اسے تین سال قبل، ہارون کی سڑکوں پر چلتی تین لڑکیوں پر لا کر کھڑا کر دیا، منظر کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے چلتا گیا۔

****

جوتے کے تسمے باندھنے کے لیے میں بستر پر بیٹھا تو گبی کمرے کے اندر آتے ہی میرے پاؤں سے چپک گیا۔گبی میرا وہ بلا تھا جس کا ساتھ بہت پرانا تھا، ہاں کبھی کبھی اس کی حرکتیں ناگوار لگتی ہیں مگر انسانی رشتوں سے تو بہتر ہی تھا۔ بھورے رنگ کا وہ بلا اس دنیا میں واحد اپنا لگتا تھا۔ہاں شاید وہ میری باتوں کو نہیں سمجھتا تھا۔

شاید اس کو پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ کون انجان مجھ سے بات کرتا ہے، مگر ایک احساس تھا کہ کوئی تھا۔

کوئی تھا جو دروازے کو کھولتے ہی لپٹ جاتا تھا۔ کوئی تھا جو میرا انتظار کرتا تھا، کوئی تھا جو اپنے مطلب کے لئے ہی کسی، مگر میرے ساتھ تھا۔

اس کا کھانا پیالے میں ڈالتے میں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ مزے سے اپنا کھانا کھاتا مجھ سے بے نیاز لگتا تھا۔

ابھی میچ کو شروع ہونے میں ایک گھنٹہ تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور مجھے پتہ تھا میری آنکھیں بند کرنے کے بعد میرے سامنے کس کا چہرہ آنا تھا۔۔۔ وہ چہرہ جو پچھلے چند گھنٹوں۔۔۔ بلکہ چند دنوں سے آنکھوں کے بند پردوں پر چھا جاتا تھا۔ اور مجھے لگتا تھا کہ میں ایسا کرنا چاہتا تھا۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا؟

اس لڑکی نے صرف ایک لفظ بولا تھا۔جب میں نے اس کو دیکھا تھاتو اس کا چہرہ الجھا سا معلوم ہوتا تھا۔اس کے بال کافی چھوٹے تھے۔گلابی رنگ کی فراک نما شرٹ، آنکھوں پر گول ساچشمہ۔اس کا چشمہ بالکل میرے جیسا تھا۔

"اور تم نے اس کو نہیں بچایا۔تم نے اس کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا"۔کہیں دور میرے ذہن میں ایک آواز گونجی۔

ایک دم سے میری آنکھیں کھل گئیں۔یادوں کا تسلسل نوٹ گیا۔حقیقت پھر نظروں پر چھا گئی۔

!:میں نے غلط نہیں کیا۔میں نے اس کو بچانے کی کوشش کی تھی وہ تمہاری وجہ سے مری ہے، یہ سب تم نے کیا ہے۔گاڑی سے جو ٹکرائی تھی وہ سب تم نے کیا ہے،سب تم نے کیا ہے، تم نے مجھے اس سے ملوایا، تم نے اس کو مروایا، تم ہو قاتل، مجھے الزام مت دو۔

ایک دم سے اٹھتے ہی میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ سنگھار میز پر رکھی وہ منحوس چیز اٹھائی اور دیوار پر کھینچ ماردی۔ دیوار سے ٹکرا کر وہ زمین پر گر گئی، میں اس کے قریب گیا اور جوتوں کے ذریعے اس کو کچلنے لگا۔

تم نے کیا ہے سب، تم نے میری زندگی تباہ کی ہے، تم جاؤ میری زندگی سے دفع ہو جاؤ، میں تمہارے چنے ہوئے راستے پر نہیں چلوں گا۔ تم نے مجھے پنسا دیا ہے، تمہاری باتوں پر عمل نا کروں تو میں مر جاوں گا۔ مجھے جینے دو۔ میں جینا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ مت کرو یہ۔ تم میری زندگی کو میرا ہونے دو۔ میری زندگی میں بچا ہی کیا ہے جو تم چھین رہے ہو مجھ سے۔

پاؤں سے بار بار کچلنے کے بعد بھی اس سنہری گھڑی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ جبکہ اس کا اوپر ہی شیشہ مکمل طور پر چوڑ چوڑ ہو گیا تھا۔اس کو اور کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ تھک ہار کے میں نے اپنا پاؤں روک دیا اور پھر اس کو ایک زور کی لات مار کر کمرے سے باہر نکال دیا۔

"I'll try to be better, I promise you that."

جاتے جاتے گبی کو ایک نظر دیکھا، پھر اس سے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور اس بات کو نظرانداز کرتے ہوئے دروازے کا ہینڈل کھینچنے لگا کہ اس کو میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

مگر کاریڈور پار کرتے ارمغان کو کیا معلوم تھا کہ اس کی بات دل میں کہہ دینے سے پہلے ہی سن لی گئی تھی اور اس بات کا اندازہ ارمغان مطاہر علی کو جلد ہونے والا تھا۔

*****

!: آج فاطمہ منظل سنسان لگتا تھا کہ جیسے زندہ لوگوں کا کوئی قبرستان ہو۔ یہ وہی گھر تھا جہاں آج کے دن پھولوں کی خوشبو، مٹھائیوں کے انبار اور خوشیوں کے آمد و رفت ہونی تھی۔ مگر قسمت کیسی بساط پلٹ دیتی ہے۔ نہیں! آج اگربتیوں کی اجڑی مہک، سوکھے مرجھائے چہرے اور تعزیت کرتے لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ آج صحن میں لال چادر کے بجائے سفید چاندی بچھی تھی۔ آج گلاب کی پتیوں کی جگہ تسبیح کے دانے اور کھجور کے بیج بکھرے پڑے تھے۔ سارہ کے نکاح کا دن کس کو اندازہ تھا کہ اس کی موت کا دن مقرر ہونا تھا۔

***

اس حادثے کے بعد سے زندگی اتنی برق رفتاری سے دوڑا ٹھی تھی کہ اسے سمجھ ہی نہیں آرہا تھا زندگی میں جو کچھ چند دنوں پہلے ہوا وہ حقیقت تھا یا فریب۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی خود کو قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دن گزری رات کے

خواب ہوں۔ہر بار کی طرح وہ پھر سے غائب الذہنی کا شکار ہو گئی تھی۔ماحول سے بے نیاز اپنے خیالوں میں گم، کچھ سوچتا ہوا چہرہ۔

***

"السلام علیکم!" ایک دھیمی، اداس سی نظروں سے اس نے ایرج سے کہا۔اس کے نا مسکرانے کے باوجود بھی اس کے چہرے کے گرد ڈمپلز دکھائی دے رہے تھے۔

"وعلیکم السلام!" ایرج نے ہکلاتے ہوئے سلام کا جواب دیا، اب وہ بالکل جامد کھڑی تھی۔

کیسی ہو۔۔۔ایرج؟"۔اب کی بار اس نے بہت دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایرج سے پوچھا اور ایرج کو لگا تھا کہ اس کی دنیا وہیں تھم گئی ہو۔یہ وہی بھاری آواز تھی جو بہت سال پہلے بھی یونہی اس کا حال احوال پوچھا کرتی تھی۔مگر آج نہ وہ آواز ویسی اپنی لگی تھی، نہ وہ شخصیت۔سب بہت انجان لگنے لگا تھا۔

ایگل میموریل فٹ بال کلب میں آئے اس کو تقریباً تین سال ہونے کو آئے تھے اور اس نے اپنا نام بطور بیسٹ اسٹرائیکر وہاں بنوالیا تھا۔ آج کا یہ میچ بہت عام سا تھا۔ مگر وہ ارمغان تھا۔ ہر چھوٹی چیز اس کے لئے ایک جنگ ہوتی تھی جس کا فاتح وہ خود کو جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی ٹھہرا چکا ہوتا تھا۔

گیلی گھاس پر گرتے قدم، بھاگتے وجود اور چیختی آوازیں اس بات کو واضح کر رہی تھی کہ ٹیم ریڈ کے کھلاڑی مسلسل گول کی کوشش میں چلا رہے تھے۔

بال اب بھی ٹیم ریڈ کے حصے میں تھی۔ وہ تیز رفتاری سے اندھا دھند وقفے وقفے سے بال کو مارتے اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا کہ کسی نے اس کے قدموں سے بال چھین لی، وہ بدحواس سا رکا اور مڑ کر دیکھا۔ وہ ارمغان تھا۔ چہرے پر گیلے بال سامنے کو آئے ہوئے تھے، اس کی آنکھوں پر اس وقت چشمہ نہیں تھا۔ جرسی کی پوری آستینوں کو گرمی کے باعث کہنیوں تک چڑھایا ہوا تھا۔

"It's all about pefect timing."

دو سیکنڈ کے لئے تمام لوگ ساکت ہو گئے۔ مگر جیسے ہی انہیں ہوش آیا کہ انہوں نے اپنی پرانی ٹینک استعمال نہیں کی تو تمام لوگ بھاگے

"پاس کر!"۔ارمغان کے کہنے پر اس نے بال کو پاس کرنے کے لئے پاؤں بڑھایا مگر تب ہی مخالف ٹیم کے ڈیفینڈر نے بال کو ٹانگ اڑا کر ارمغان کے پاس جانے سے روکا۔ بال دوسرے ڈیفینڈر کے پاؤں میں گئی جس نے اس کو لونگ پاس کر کے نہ فیلنڈر کو پہنچا دیا ہے راہیم الٹنے۔ بال دوسرے ایلینڈر کے پاؤں میں گئی جس نے اس کو لونگ پاس کر کے مڈ فیلڈر کو پہنچا دیا ہے۔ پورا گیم الٹنے والا تھا۔ جو جیت رہا تھا وہ ہارنے والا تھا۔

*****

ٹیم ریڈ کا گول ہونے کے ساتھ ہی ریفری نے سیٹی بجادی اور یوں ٹیم ریڈ آخری وقتوں میں کھیل کی بساط پلٹ کر اس گیم کی فاتح ٹھری۔ ٹیم ریڈ ایک گول سے جیت گئی تھی اور ٹیم بلو پریکٹس کا پہلا میچ ہی ہار گئی تھی۔

**

گھانس پر پاؤں لمبے کیے بیٹھا وہ شخص اب اپنا چشمہ اور جیکٹ اٹھا رہا تھا۔

"ارمغان! زندگی میں تو تم ہارتے رہے ہو، فٹ بال میں بھی پہلی مات مبارک ہو۔"

*****

اس نے سرمئی ہوڈی پہن رکھی تھی۔ ہوڈی کی ٹوپی سر پر تھی اور اس کے بال اس کے چہرے کو چھپا رہے تھے۔ باقی کا وجود کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ فون کھولتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے میسج پڑھتے ہی ایک پن کوڈ ڈالا، فون کو کنیکٹ کیا اور کال ملائی۔ دوسری طرف سے فون پہلی گھنٹی پر ہی اٹھا لیا گیا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟ یہ پرسنل کام تھا جاہل، تم نے ویڈیو اپلوڈ کیوں کر دی؟" دوسری طرف سے کسی نے بے حد طیش کے عالم میں بات کی شروعات کی تھی۔

"تمھیں بس اس کو مارنا تھا، پچھلی بار تو نہیں کیا تھا تم نے ایسا، اب کیوں کیا؟ بات سنو دورس! اگر کسی نے مجھے پکڑ لیا یا گرفتار کیا تو اچھا نہیں ہو گا۔" دوسری طرف سے اب بھی اسی انداز میں بات کی گئی۔

"تو کیا ہوا؟ تھوڑے سے اور پیسے کما لئے میں نے تو کیا مسئلہ ہو گیا؟ تم نے مجھے ویڈیو ریکارڈ کرنے سے نہ منع کیا تھا نہ اجازت دی تھی، تو اس کا مطلب تھا میں جو کروں میری مرضی!"۔ وہ پر سکون مگر تلخ لہجے میں کہتا گیا۔

اپنی بات مکمل کر کے اس نے فون ترک کر دیا۔ فون کو بستر پر اچھال دیا اور خاموش سا قہقہے لگانے لگا۔ اب وہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیپ ٹاپ پر سر جھکاتے ہوئے بھی اس واقعے کو سوچتے ہوئے مسکرا رہا تھا جو اس نے دو دن پہلے انجام دیا تھا

(دو دن پہلے)

کوئی بھی اس کمرے کو ایک بار دیکھتا تو وہ پہچان جاتا کہ یہ انٹرنیٹ کے خطرناک ترین کمروں کا حصہ تھا۔ یہ ریڈ روم تھا۔ وہ لڑکا جس کا آدھا چہرہ لال پٹی سے چھپا ہوا تھا اور آدھا کالی ٹوپی سے، وہ کمپیوٹر کے قریب آیا اور اسے کھولنے لگا دو مونیٹر لگے تھے جن میں سے ایک پر کچھ کوڈز لکھے آ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہوئے وہ دوسرے کمپیوٹر پر ان کوڈز کو ڈال رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے فائز کھلتی جا رہی تھیں۔ لمحے بعد ہی کمپیوٹر کنیکٹ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ٹھک ٹھک۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی کمپیوٹر کو ڈز ڈالتا، پیجز کھولتا بند کرتا، اور بالآخر وہ وہاں پہنچ ہی گیا۔

دس منٹ بعد وہ لائو جانے والا تھا۔ لوگ انتظار والے خانے میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اب کمپیوٹر سے ہٹ کے کنارے میں پڑے اس وجود کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس کو اس نے بندھے رہنے دیا۔

لائیو شروع ہو گیا تھی۔ وہ کیمرے کے سامنے اس طرح آیا تھا کہ کیمرے میں اس کی شکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بے تحاشہ آنے والے میسیجز کو پڑھ رہا تھا۔ لوگ اس کو کہہ کر دس منٹ بعد وہ لائیو جانے والا تھا۔ لوگ انتظار والے خانے میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اب کمپیوٹر سے ہٹ کے کنارے میں پڑے اس وجود کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس کو اس نے بندھے رہنے دیا۔

کو شروع ہو گئی تھی۔ وہ انٹر کے سامنے اس طرح آیا تھا کہ کیمرے میں اس کی شکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بے تحاشہ آنے والے میسیجز کو پڑھ رہا تھا۔ لوگ اس کو کریپٹو کے ذریعہ پیسے بھیج کر اپنا من پسندیدہ کام کرنے کی التجا کر رہے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ سب کی گزارش پڑھتا جاتا۔ اسے سب سے زیادہ پیسے دینے والے کی بات پر عمل کرنا تھا۔ اس نے سب سے زیادہ پیسے دینے والے کو ڈھونڈا اور اس کا مسیج پڑھا۔

"Rape her"

دورس نے بیزاری کا اظہار کیا۔

"اس میں اب مزہ نہیں آتا۔ بہت کر لیا ہے یہ۔"۔

کچھ ہی لمحے بعد اسکی نظریں ایک پیغام پر ٹھر گئیں۔

"Make her eyes bleed"

"ہاں یہ مزے کا ہے!"۔ زیر لب کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں وہ بے دل تھا۔ کسی جانور سے بھی زیادہ حیوان۔

چند سیکنڈز بعد اس نے ایک چشمہ اٹھایا اور اس کو دیکھتے ہوئے اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔ چشمہ والا ہاتھ اس کے چہرے کے قریب لے کر گیا اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اس کی بند آنکھیں کھولیں۔ بہت آہستہ سے مگر سخت ہاتھوں سے اس نے اس لڑکی کو وہ چشمہ پہنا دیا۔ چشمہ بڑی مشکلوں سے اس کی آنکھوں

میں دھنستا گیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو کی سورت میں رسنے والا گرم خون دورس کی انگلیوں سے پار ہو کر اب اس کی ٹھوڑی سے اس کی گود پر ٹپک رہا تھا۔

——---------------

قسط نمبر تین:

میں اس سنگم پہ ہوں اپنے قدم دھرے

میں ہوں اس مسکن کے انتظار میں

جو ہم دونوں کو ملائے گا،

مجھے معلوم ہے تمہارے پاس ہیں

سوالات کے انبار بڑے

مگر اس بار۔۔۔

میں ہوں اس ایک ملاقات کا منتظر

اور اب کی بار۔۔۔

میرے پاس ہیں تمہارے سوالوں کے جواب

مجھے ایک داستان ہے سنانی تمہیں

کبھی آو تو ذرا تم۔۔۔

مل بیٹھ کہ باتیں کریں گے

کیونکہ اس بار۔۔۔ میں ہوں مکمل تیار،

لیکن تم پہ ہوں منحصر کہ،

کیا تم چند سوالات کے چکر میں،

کچھ ملاقاتوں کے بدلے،

اپنی زندگی کی بازی کھیل سکتی ہو؟

کیونکہ بلآخر۔۔۔ہم ایک ہی تو ہیں،

ہم ایک ہی منزل کے مسافر ہی تو ہیں،

بس ہمیں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنا ہے

کیونکہ ہمیں جدا،

بھلا کون کر سکتا ہے، ایکویرس؟

☆☆☆

سارہ کے کمرے سے اپنے کمرے تک سفر کے درمیان کیا ہوا تھا، ایرج کو کچھ ہوش نا تھا۔ جیسے آنکھوں پر پٹی بندھی ہو اور قدم بادلوں کے مانند۔ سیڑھیاں اترتے اسے احساس ہو گیا تھا کہ حنا اسکے پیچھے آئی تھیں۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بجے کے قریب وہ اٹھا تو اس کی آنکھیں اب بھی اتنی ہی سرخ تھیں۔ چہرہ تکان زدہ لگتا تھا اور جسم میں میچ کے باعث ہلکا ہلکا درد تھا۔ کمرے کے گھپ اندھیرے میں اس نے اپنا موبائل دیکھا تو تیز روشنی سے اسکی آنکھیں چندھیا گئیں۔ مزمل کے پانچ میسجز اور دو وائس میسجز موصول ہوئے تھے۔ اس نے میسجز کو کھولا تو ان میں بتایا گیا تھا کہ اس کی تھیراپسٹ کل سے مختلف وقت پر آیا کریں گی۔

اس نے موبائل بند کر کے اپنے برابر بستر پہ اچھال دیا۔ خود اٹھا اور الماری سے اپنا یونیو فارم (جو کہ آسمانی رنگ کی ٹی شرٹ تھی) نکالا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ ایک بات ذہن نشین کر لی تھی کہ شفٹ پہ جانے سے پہلے اسے ایک اہم کام کرنا تھا۔

☆☆☆

مردوں کو باہر اور عورتوں کو اندر بیٹھایا گیا تھا۔ حنا ارحم سے کچھ پوچھنے ہی باہر آئی تھیں کہ دونوں کی نظر تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتی ایرج پر پڑی۔

حنا اور ارحم اس کے پیچھے آئے تھے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ایرج نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ بند دروازے کو حنا نے کھٹکھٹایا مگر جواب ندارد۔ دور کھڑے کریم رنگ کے کرتا شکوار میں ملبوس ارحم کو پریشان نظروں سے دیکھا۔ اسنے اشاروں میں کہہ دیا تھا کہ وہ اس سے بات کرے گا کہ کیا ہوا ہے۔

وہ گھر آنے کے ساتھ ہی نہا یا دھویا اور شلوار قمیض میں تیار ہوا تھا۔ یہ اسکے باپ کا جنازہ تھا، مگر وہ کچھ محسوس نہ کر پایا تھا۔

"اسے ہمیشہ کمتر، لوزر، نا قابل اور ڈی گریڈ کرنے والا اسکا باپ آج مر گیا تھا، وہ اپنے باپ کے لیے اپنے آنسو ضائع کیوں کرتا۔" اس نے سوچا تھا۔

آنکھوں پر چشمہ اس وقت نہ تھا، چہرے پہ ہر دم سکون تھا، مسکراہٹ نہ تھی۔ وہ لوگوں کو پر سکون کرتا تھا، خود کیسے پریشان ہوتا؟

☆☆☆

وہ واش روم سے باہر آیا تو سوا گیارہ بج رہے تھے۔ سیاہ ٹراوزر پہ اس نے وہی نیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اب سر پہ پی کیپ جماتے جوتوں کو شو ریک سے نکال رہا تھا۔ جوتوں کے تسمے باندھتے اسے احساس ہوا تھا کہ اس کا آوارہ بلا گھر سے پھر باہر تھا۔ جوتے پہنتے ساتھ ہی اس نے فون اٹھایا اور مزمل کو میسج لکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

ایرج اور ایرج کا اندھیر کمرہ اس بات سے بے نیاز تھا کہ کب سورج ڈھلا اور چاند آسمان پہ آ بسا۔ رات کے کچھ گیارہ بج رہے تھے جب اس نے فون دیکھا۔ کمبل ہٹا کر اس نے اٹھنا چاہا مگر کندھے، ہاتھ، پاؤں اور کمر نے ساتھ نہ دیا۔ وہ روئی نہیں تھی مگر جسم گرم اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کیا اسے بخار ہو گیا تھا؟

آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ کمرے میں عجیب سی گھٹن اور حبس چھایا ہوا تھا۔ بستر کے ساتھ ہی سوئچ پہ ہاتھ مارا تو کمرے کی ایک بتی جل اٹھی۔ کمرے کی حالت کو

دیکھا جاتا تو کہیں سے ایرج کا لگتا نہیں تھا۔ جگہ جگہ چیزیں بکھری تھیں۔ کپڑے، تصویریں، سارہ کی چیزیں... وہ شاک اور دکھ کے اسٹیج سے باہر آرہی تھی۔ وہ قبولیت کی منزل پہ آرہی تھی۔

اس نے فون اٹھایا، مزمل کے چند فارورڈ میسجز اور وائس میسجز آئے ہوئے تھے۔ اسکی چیٹ کھول کر اس نے پیغام لکھنا شروع کیا۔

قبولیت کی منزل پہ یہ اسکا پہلا قدم تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نوشین کا کمرہ جتنا چھوٹا تھا، اتنا ہوادار بھی تھا۔ لکڑی کے بنے پٹ ہوا سے آر پار جھول رہے تھے اور اپنے آفس میں بیٹھی ڈاکٹر نوشین کا سر کاغذات کے پلندے میں تھا۔ چشمہ آنکھوں پہ جمائے وہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھیں کہ دستک پہ سر اٹھایا، سامنے ان کا مینیجر (کمپاونڈر) مزمل کھڑا تھا۔

سپاٹ مگر نرم چہرے سے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو مزمل نے چند منٹ قبل موصول ہوئے پیغام ان کے سامنے کیے۔

وہ پیغام پڑھ رہی تھیں جبکہ ان کے سامنے کھڑا مزمل اسی پیغام کو دہراتے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر نوشین سے تھیراپی لینے والا ان کا ایک مریض ارمغان مطاہر علی واپس ایک بریک لینا چاہتا ہے۔

"ہر دو مہینے ایسا کیوں کرتا ہے یہ؟" افسوس سے کہتیں ڈاکٹر نے فون واپس مزمل کو تھما دیا۔

مزمل نے دوسرا پیغام کھولا اور واپس موبائل انہیں تھمایا۔

"اچھی خبر یہ ہے کہ مس ایرج واپس آرہی ہیں تھیراپی کے لیے۔" ساتھ ساتھ وہ کہہ رہا تھا۔

"چلو گڈ، ایرج سے ڈیٹیلز اور ٹائمنگز کا پوچھ لینا۔ باقی اور کوئی خبر مزمل؟"

ان کے سوال پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"او کے۔میں اب آف کر کے جا رہی ہوں، تم بھی چلے جانا، خدا حافظ۔"

انہوں نے اٹھتے ہوئے اپنا بیگ اور باقی چیزیں تھامیں اور آفس سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

پیغام پر نیلے رنگ کا نشان دکھائی دے رہا تھا کہ پیغام موصول ہو چکا تھا اور پڑھ بھی لیا گیا تھا۔ایرج نے فون اپنے برابر بستر پر ڈال دیا۔اس کی آنکھیں سیاہ حلقوں سے ڈھک چکی تھیں۔ سر بھاری ہو رہا تھا مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔

اس نے چپل پاؤں میں پہنی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔سٹڈی ٹیبل سے سامان سمیٹتے اسے کمرے کے دروازے کے پاس کچھ دکھائی دیا۔

وہ دروزے کے قریب آئی اور جھک کر زمین سے اٹھایا۔وہ چاندی کی رنگ کا لاکٹ کا پینڈینٹ تھا۔اس تکون نما پینڈینٹ پر کچھ ابھرے ابھرے سے حروف واضح تھے۔وہ اسے اور اس سے جڑی یادوں کو آج تک بھلا نہیں پائی تھی۔وہ جانتی تھی

کے یہ پینڈینٹ کس کا تھا۔اسکو مٹھی میں دباتے وہ بستر کے قریب آئی اور فون سے وقت دیکھا

گیارہ بج کے بیس منٹ۔

وہ کچھ نہیں بھولا تھا،نہ وہ بھولی تھی..بس حالات بدل گئے تھے،

وہ حالات ہماری اچھی یادوں کو مٹا تو نہیں پائے مگر ان یادوں کو دھندلا کر دیا تھا۔

ان ہی حالات نے ایرج کو بسمل بنادیا تھا.

جرح زدہ بسمل۔

مگر وہ اس کے سامنے سب بھول جاتی تھی۔اس کے سامنے اس کے ساتھ گزری بری یادوں کا پردہ گر جاتا تھا. کیونکہ اگر دل ودِماغ میں اس کے لیے کوئی خانہ خالی تھا بھی تو اُس میں صرف اچھی یادوں کا بسیرا تھا۔کہتے ہیں نا کہ جب کوئی رشتہ ٹوٹ جائے تو ان لمحوں کو یاد کرو جب وہ رشتہ بنا تھا۔کیونکہ اچھی یادیں ہی انسان کو سنبھالتی اور سہارا دیتی ہیں۔

ایرج بھی وہی کرتی تھی... کزن اور دوستی سے ہٹ کہ بھی ایک رشتہ تھا ارحم سے... یک طرفہ سا۔

اُس نے دروازہ کھولا اور صحن پار کر کے زینے چڑھنے لگی۔ ماضی تھا جو بھی سب تھا۔ مگر آج... آج ذہن اور دل آزاد لگتے تھے۔ آج ارحم پہلی بار اُس کے لیے حال والا ارحم تھا۔ شادی شدہ، ایک بچی کا باپ، اور ایرج نامی لڑکی سے کوئی واسطہ نہ رکھنے والا ارحم۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کے آئی تو آسمان پر ستاروں کی چمک کم مگر واضح تھی۔ ایک پر غور کرو تو دوسرا مل جاتا۔ ایسے ہی پورا آسمان روشن لگنے لگتا۔

وہ گیلری کے پاس آئی تو سامنے ہی ارحم بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں ہونٹوں پہ رکھ کے وہ دوسرے ہاتھ سے موبائل دیکھ رہا تھا۔ ایرج کو آتا دیکھ کہ مسکرایا، فون کی روشنی بجھا کر فون ٹیبل پر رکھ دیا اور ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"آؤ ایرج، بیٹھو"۔رات کو کراچی کی سردی عروج پہ تھی۔ایرج نے دوپٹے کی جگہ اسکارف نما مفلر گلے کے گرد بندھا ہوا تھا،وہ اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

اسکے بیٹھنے کے ساتھ ہی ارحم نے ہتھیلی آگے کو کی۔"میری چیز؟"۔

ایرج نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ پر اس کے لاکٹ کا پین ڈینٹ رکھ دیا۔

ارحم کرتا شلوار سے اپنے انگریز روپ میں آتے ہوئے ابھی سیاہ جینز اور سفید ٹی شرٹ کے اوپر بھورے رنگ کے لونگ کوٹ میں ملبوس وہاں بیٹھا ہوا تھا۔پین ڈینٹ کا ہُک کھولتے ہوئے اس نے گلے کی چین سے اس کو جوڑ دیا،وہ چین اب لاکٹ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

"آج آسمان پر ستارے کم ہیں، نہیں؟"۔اُس نے بات کا آغاز کیا،ایرج نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

"غور کرو ارحم، اور بھی ستارے مل جائیں گے.."

"مگر میں جو ستارہ ڈھونڈ رہا تھا، وہ تو مجھے مل گیا"۔ ارحم نے آسمان سے چہرہ ہٹا کے ایرج کو دیکھا، اسکے چہرے پر دھیمی اور نرم مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی۔

"تم جانتی ہو ایرج کہ میں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں کہ تم کس ستارے جیسی ہو؟"۔ ایراج کا جواب نہ آنے پر اس نے الٹا سوال کیا۔

"نہیں... تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا... کونسا ستارہ ہے وہ؟"۔ ایرج کے چہرے سے مسکراہٹ ڈھلتی اور پھر اس کی پر سکون آواز سن کے واپس چہرے پر طاری ہو جاتی۔ "الثئیر.. تم الثئیر ہو ایرج... زمین سے سب سے قریب ستارہ.. مگر سب سے بلند ستارہ۔"۔

"الثئیر... اس کا کیا مطلب ہوا؟"۔ اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ارحم نے اس کی بات پر آسمان سے واپس نظریں ہٹائیں اور حیرانی سے اسے دیکھا... پھر میز پر پڑے موبائل کو کھولتے کچھ ڈھونڈنے لگا۔

"اکیس اگست، آج سے تقریباً چار سال پہلے میں نے تمہیں ہر ستارے کا نام اور اس کے مطلب بتائے تھے۔ ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ستارہ کہاں سے سب سے زیادہ آسانی سے دکھ سکتا ہے۔ شاید تم بھول گئی"۔

وہ اپنے موبائل کی سکرین اس کے سامنے کیے بول رہا تھا، فون پر کیلنڈر کھلا ہوا تھا کو چار سال پہلے اگست کی اکیسوی تاریخ کو نشان زدہ دیکھا رہا تھا اور ساتھ ہی اس دن کا عنوانِ گفتگو لکھا تھا۔

ارحم نے بولنا بند کیا اور فون واپس رکھ دیا... اور ایرج بس اسے دیکھے گئی...

"تو پچھلے گزرے عرصے میں جو ہماری معمولی باتیں ہوتی تھیں۔۔۔ وہ معمولی نہیں تھیں؟ ارحم ہر رات کے لیے الگ سے موضوع تلاش کرتا تھا۔۔۔"

ارحم کی مسکراہٹ گھمبری ہوتی گئی، پھر اس نے ایک سانس لی۔

"جو میرے دل و دماغ کے سب سے قریب ہوتے ہیں ایرج۔ میں اُن کی باتوں کو یہاں (انگلی کی مدد سے ماتھے کو چھوا) اور یہاں (اُسی اُنگلی سے سینے پر دل کی جگہ

چھوا) محفوظ رکھا ہوا ہے۔اور میری زندگی میں ایسے صرف چھے لوگ ہیں، تم، سعد، دانیال، سارہ، حانا اور زویا"۔

اسنے بولنا بند کر دیا۔اب وہ بس ایرج کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"یہیں رکو، میں تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔وہ لے کر آتا ہوں"۔وہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور گیلری سے اپنے کمرے تک چلتا چلا گیا۔

اور ایرج...ایرج جسمانی طور پر تو اس ہی گیلری میں رہ گئی تھی مگر ذہنی طور پہ وہ زمین سے کہیں بہت دور کا سفر کر چکی تھی...آسمانوں پہ، بادلوں کے قریب، التئیر کے پاس۔

کوئی ارحم نسیم سے محبت کیسے نہیں کر سکتا تھا؟اس کو کیسے پتا ہوتا تھا کہ کس انسان کو کس وقت کس چیز کی ضرورت ہے...کیسے؟

چند منٹ بعد ارحم واپس گیلری میں آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک ڈبہ تھا، آتے ساتھ ہی اس نے ڈبہ ایرج کی طرف بڑھایا اور سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈیڑھ گھنٹہ انہوں نے ایسے ہی باتیں کی۔کچھ اس نے اپنی سنائی، کچھ ایرج نے اپنی۔

اس کا اصل مقصد ایرج کو کالم ڈاؤن کرنا تھا شاید وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

ایرج نے وہ تحفہ نہیں کھولا تھا۔شاید وہ کبھی کھولے بھی نہیں۔شاید وہ تحفہ کسی کو دے دے۔شاید وہ ان "تحائف" سے موو آن کرنا چاہتی تھی۔ان تحائف کو دینے والے سے بھی۔وہ ان دلاسوں میں آ جائے، محبت میں نہیں، پھر سے بالکل نہیں۔

----x------

آسمان اور ارمغان کی آنکھوں کے رنگ میں کوئی فرق نہ تھا۔سیاہ آسمان تلے روشن شہر کی سڑک پر ان کی بائیک ایک ڈرگ مارٹ کے سامنے آکر رک گئی تھی۔

ڈرگ مارٹ کی بتیاں ہی وہ واحد بتیاں تھیں جو اس ویران سڑک پر تھوڑی بہت روشنی پہنچا رہی تھیں۔

اس نے بائک سے اترتے ہوئے بائیکر کو پیسے تھمائے اور مارٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ آج پھر سے وہی معمول تھا۔ انہی دوائیوں سے مہکتی روشن دیواروں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ویسے ہی سیٹ ہوئی ریکس، دوائیں، فریج میں رکھے جوسز کے ڈبے۔

ارمغان نے اپنے پیچھے دروازہ بند ہوتے ہوئے محسوس کیا، اور اس کے بعد اس کی نظر واصف پر پڑی۔

واصف انیس بیس سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا جو اس وقت ارمغان سے دور رکھے ایک ریک میں دواؤں کو ترتیب دے رہا تھا۔ جب اسے ارمغان کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرایا نہیں۔

بس اسے چبھتی نظروں سے دیکھا۔

نہ ہی اس نے سلام کیا تھا۔فضا میں تناؤ بڑھ سا گیا تھا۔کچھ تھا جو بہت گھٹن دینے لگا تھا۔ارمغان نے اپنی شرٹ کا اوپری بٹن کھول دیا۔دونوں کی نظریں صرف ایک لمحے کے لیے ملی تھیں۔اس کی نظروں میں کچھ بہت چبھتا ہوا سا تھا،کچھ ایسا جو ڈرا رہا ہو۔

ارمغان نے نظریں پھیرتے ہوئے قدم مخلتف جانب بڑھا دیے۔واصف کو کیا ہوا تھا وہ نہیں جانتا تھا مگر اسے کچھ یاد آ رہا تھا۔

"واصف کے سامنے کیا ہوا تھا؟"اس نے پچھلی رات کے منظر کو یاد کرنا چاہا جو اس کے دماغ میں بس ایک مدھم سے داغ کی صورت رہ گیا تھا۔دھندلا،مٹا ہوا،انجان۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ریک کے پار اسے واصف پھر نظر آیا۔ وہ اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ارمغان ریک کے پیچھے اس طرح چھپا تھا کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا مگر ارمغان اسے دیکھ سکتا تھا۔

اس نے ایک ریک کے شیشے سے بنے پٹ سے اپنی پشت ٹکائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے گردن پر آتے پسینے کو پونچھا اور تبھی اسے محسوس ہوا کہ اس کے سامنے کوئی وجود آ کھڑا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ ہوا میں بھاری تناؤ محسوس کر چکا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

اس کے سامنے واصف کھڑا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ واصف کو دھکا دیتے دوسری طرف کو بھاگا تھا۔

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ واصف سے کیوں بھاگ رہا تھا؟ واصف اس کا دوست نہیں تھا مگر اس نے ایسا کیا کیا تھا کہ اس کو بھاگنا پڑ رہا تھا؟ اس کے اور واصف کے

درمیان کیا ہوا تھا؟ وہ پتا نہیں کیوں بھاگ رہا تھا اور واصف اس کے پیچھے کسی جانور کی طرح کیوں پڑا ہوا تھا؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ اسے بس واصف کی موجودگی سے ایک احساس ہوا تھا۔۔ڈر کا احساس۔ اسے واصف سے خوف محسوس ہو رہا تھا اور انسان کے لیے ایک احساس ہی کافی ہوتا ہے، کوئی رد عمل دینے کے لیے۔

وہ بڑے سے مارٹ میں ایک ریک کے پیچھے چھپ گیا۔ واصف

کہاں تھا اُسے اندازہ نہیں تھا۔ جیسے وہ دونوں کسی maze کا حصہ ہوں۔ جیسے وہ کسی بُھول بھلیاں میں چوہے بلی کا کھیل، کھیل رہے ہوں۔

ارمغان کو اپنے سے پیچھے والی قطار میں کسی کے قدموں کی آہٹ کا احساس ہوا۔

اور یہ وہی لمحہ تھا۔۔۔

جب ارمغان کی یاداشت بدلنا شروع ہو گئی تھی۔

اس کا روپ پہلے جیسا ہی تھا مگر اس کا دماغ۔۔۔

اسکا دماغ بدل رہا تھا۔

اُس کے ہاتھوں کی رگیں اُبھرنے لگیں تھیں۔اُس کی آنکھیں اس قدر سُرخ تھیں کہ جیسے آنکھوں میں خون اُتر آیا ہو۔

بس ایک لمحہ لگا تھا۔۔۔

ارمغان کو دوروس بننے میں۔

رات کے بارہ بج چکے تھے اور سب کچھ ایک سا ہونے کے باوجود بھی ایک سا نہیں رہا تھا، کم از کم دوروس کے لئے نہیں۔

کل رات کیا ہوا تھا، وہ سب اُسے یاد آتا جارہا تھا۔کیونکہ اُس کی یاداشت اور شخصیت بدل رہی تھی۔

دوروس نے اپنی جیب سے پاکٹ نائف نکالی تھی اور اب وہ قدم آگے کی جانب بڑھا رہا تھا۔

(چوبیس گھنٹے پہلے)

چاقو کی نوک کتنی مرتبہ اس کے پیٹ کے آر پار ہو چکی تھی، وہ گنتی خود بھی بھول گیا تھا۔

دوروس تقریباً اُس مردہ شخص کے اُوپر بیٹھا ہوا تھا۔اُس کا چہرہ سامنے تھا، ایسے کہ وہ اُس انسان کو تڑپتا ہوا باآسانی دیکھ سکے۔اس نے ایک بار پھر چاقو اُس کے سینے میں گھونپ دیا۔خون کا بہنا رفتہ رفتہ مدہم پڑتا جارہا تھا۔دوروس کی سفید شرٹ اب خون سے رنگ گئی تھی۔اُس کا چہرہ مشکل سے ہی واضح تھا، وہ مکمل خون میں نہا گیا تھا۔

"مجھے انکار اچھے نہیں لگتے۔" اس نے بہت ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا جیسے اپنے کسی دوست سے مخاطب ہو۔اور تبھی اُسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

پرائیویٹ واشروم کے دروازے کے پاس واصف کھڑا تھا۔

(حال)

اُسکے دماغ کے پردوں پر پچھلی رات کے واقعات لہرا رہے تھے کہ اُس کے سامنے واصف کھڑا دیکھائی دیا۔ واصف کے ہاتھوں میں بھی ایک پاکٹ نائف تھی جسے اُسنے دوروس کے سامنے کیا ہوا تھا۔

دونوں آمنے سامنے تھے۔ ایسے کہ ان میں سے کسی ایک کی لاش یہاں سے رخصت ہو گی۔

"میرا بھائی کہاں ہے؟" واصف کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے، لہجہ بھی کمزور۔

"چھری نیچھے کر----"۔

دوروس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی مارٹ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ مارٹ کے اندر داخل ہوئی۔

دوروس کے وحشت ناک چہرے پر ایک یارانہ مسکراہٹ طاری ہوتی چلی گئی۔ اُس نے اپنے چاقو کو نیچے کیا اور ایک اُنگلی اپنے ہونٹ پر رکھی۔

"تم مجھے قتل کرو گے واصف؟ یوں ایک عورت کی موجودگی میں؟ دوروس مسکراہٹ دبائے کہہ رہا تھا۔

"جاو شاباش جا کر دیکھو وہ عورت کیا خریدنے آئی ہے، ارے چُھری تو نیچے کرو یار۔" دوروس نے واصف کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

واصف نے ایک قدم پیچھے لیا۔

"تمھیں پتا ہے تم۔۔۔۔" دوروس کی مسکراہٹ اور اُس کے لہجے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسکے لہجے میں گرمائش تھی جو ماحول میں مزید گھٹن پیدا کر رہی تھی۔

"ایکسکیوز می؟ کوئی ہے یہاں؟"

دوروس عورت کی آواز سُنتے ہی واصف سے پیچھے ہوا۔ اُنگلی کے اشارے سے جانے کا کہا۔

"مُنہ نہیں کھولنا واصف، ورنہ تمہارے ساتھ وہی ہو گا جو پچھلے دن ہوا۔ یاد ہے ناں جب تمہارے بھائی۔۔۔۔چپ۔ بلکل چپ رہنا ورنہ۔۔۔"

اس سے پہلے دوروس جملہ مکمل کرتا، واصف وہاں سے تقریباً بھاگتا ہوا گیا تھا۔

دوروس کو اُس کے تھرتھراتے ہونٹوں اور کپکپاتے جسم سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی کے سامنے مُنہ نہیں کھولے گا۔

مگر اُس کا زندہ رہنا دوروس کی موت بن سکتا تھا۔

دوروس نے اپنی جیب سے وہی گھڑی نکالی جس کا سامنے والا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اُس نے گھڑی کے کانٹے بارہ کے ہندسے پر لا کر روک دیئے اور گھڑی وہاں ریک پر چھوڑ دی۔ اسکا کام ہو گیا تھا۔ کل اس گھڑی کے مطابق، اسی وقت پر اس کے ساتھی ایک حادثے کے طور پر واصف کو قتل کر دیں گے۔ سمپل۔

---------x---------

(سات مہینے بعد)

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر چل رہا تھا اور وہ اس منظر کو ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے نظر بند کر رہی تھی۔ کچھ نہیں کر رہی تھی اور نہ کر سکتی تھی۔ بس جو ہو رہا تھا اُسے دیکھ اور قبول کر سکتی تھی۔

ایک گھڑی کی سنہری چمک نے اُسے جھنجھلایا تھا۔ مگر وہ اُٹھ نہیں پائی تھی۔

وہ کہاں تھی؟ کیا جو وہ دیکھ رہی تھی حقیقت تھی یا ایک سراب؟

اُسکے سامنے ایک عورت اُوندھے مُنہ لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے بال خون کی وجہ سے اُس کے چہرے سے چپک رہے تھے۔

ایرج اُس عورت کے پاس گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے؟

ایرج نے اُسکے کندھے پر اپنے ہاتھ رکھے۔

وہ ایرج کی ہمشکل تھی۔ وہ چلا رہی تھی اور ایرج بھاگ رہی تھی۔ اُس کے پیچھے اب وہ وجود بھی بھاگ رہا تھا جو ایرج جیسا دکھتا تھا مگر اس کے چہرے پہ بہت زخم تھے، چہرہ سرخ خون میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ وہ اُسے اپنا ہم شکل نہیں مان سکتی تھی۔ وہ ایسی

نہیں تھی۔ مگر وہ اس کے جیسے دکھتی تھی۔اس کے بال بھی ایرج جتنے چھوٹے تھے۔ چہرے کے زاویے بھی تقریباً مترادف۔

اور پھر ایرج کو احساس ہوا کہ وہ اُونچائی سے گر رہی ہے۔

یہ وہی پل تھا جب اُسکی آنکھ کُھلی تھی۔

تاریک رات کے سائے تلے وہ اُس کے گھر کے عقب میں کسی سائے کی طرح کھڑا تھا۔

کسی حفاظت کے سائے کی طرح۔

اُس نے کھلی کھڑکی کے پار سے ایرج کو اُٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔اُسکا دل چاہا تھا وہ فوراً اُس کے کمرے میں اُس کے پاس پہنچ جائے۔وہ ایرج کو ایسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ڈری ہوئی، سہمی ہوئی۔ مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سوائے اُسے دیکھنے کے، اُسکی حفاظت کرنے کے۔

"اگر ایرج جان گئی تو وہ تم سے محبت کیا، نفرت بھی نہیں کرے گی۔"

وہ جب اُس سے ملنے کی اور اسے سب بتانے کی کوشش کرتا تھا تب یہ سوچیں اُس کے قدم زنجیر کر دیتے تھے۔

"دنیا کے لئے ایک داغ ہی ہوں۔۔۔اگر ایک لڑکی کے لئے بھی ہو جاؤں گا تو کیا ہی فرق پڑے گا؟" وہ کھڑکی سے سہمی ہوئی ایرج کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"ساری دنیا نفرت کرتی ہے، لیکن اگر وہ نفرت کرے گی تو فرق پڑے گا۔ مجھے پڑے گا۔" ایک اور سوچ۔

"ایک دن ایرج۔۔۔جب میری اچھائی میری ذات کی غلاظت پہ حاوی ہو جائے گی۔ایک دن میں تمہاری اچھائی کے قابل ہو جاؤں گا۔میں دُنیا کے لئے بُرا بننے کو تیار ہوں، مگر میں تمہارے لئے ایک بُرا انسان بننے کو تیار نہیں ہوں۔ تم میری زندگی سے نہیں نکل پائیں اور نہ میں تمہیں نکال پایا اپنی زندگی سے۔اور اب۔۔۔۔مجھے تم سے فرق پڑتا ہے"۔

وہ یہ الفاظ خود سے کہہ رہا تھا۔ جیسے خود سے ایک وعدہ کر رہا ہو۔

"اور تب۔۔۔میں تمہارا انتظار نہیں کروں گا۔ اور پھر میں یوں رات کو نہیں آیا کروں گا، کیوں کہ صبح و شام پھر تم ساتھ ہو گی۔"

وہ اُس کے گھر سے پلٹ گیا تھا۔ وہ تکلیف میں تھی لیکن محفوظ تھی۔ اُسے اطمینان نہیں ہوا تھا لیکن دل کو بہلانے کے لیے خیال کافی تھا۔

آج چھے ماہ ہو گئے تھے۔ ارمغان روز اس کے گھر کے باہر کھڑے کھڑے رات گزار دیتا تھا، اُسے پریشان کیئے بغیر کسی اپنے کی طرح اُس کی حفاظت کرتا تھا۔

کیونکہ جس گھر میں وہ رہتی تھی۔

وہاں اُس سے بھی بڑے حیوان رہتے تھے۔

"ایرج مجھے لازمی انفارم کرنا اگر پھر سے وہی وژن واپس آئیں۔ تمہیں سات ماہ سے وژن میں اپنی ہمشکل دکھ رہی ہے۔اگر اب واپس وہی خواب آئے تو بلا جھجک مجھے ٹیکسٹ کرنا۔اپنی زندگی سے اسٹریس ختم کرنا ہے اب تمہیں،اوکے؟زندگی میں ماضی کو سوچنے کے علاوہ اور بھی بہت سرگرمیاں ہیں۔تم لوگو ڈیزائننگ دوبارہ شروع کرو۔۔۔"

ڈاکٹر نوشین گھر کے خارجی دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتی ایرج کو مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہیں تھیں،ایرج سر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی تھراپسٹ کو دیکھ رہی تھی۔

اپنی ڈاکٹر کو خدا حافظ کہتے ہوئے وہ سیدھا اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

گھر عجیب ہو گیا تھا۔یا شاید اب گھر کہلانے کے قابل نہیں رہا تھا۔وہ اب بس چلتے پھرتے بے جان لوگوں کا مکان بن گیا تھا۔مسکراہٹ تو اس گھر سے جیسے عرصہ پہلے ہی رخصت ہو گئی تھی۔

سارہ کے گُم جانے کے چار ماہ بعد اُس کی لاش کی ہڈیاں تین مختلف گٹر کے نالوں سے برآمد ہوئیں تھیں۔ سارہ کی زندگی کی اُمید ختم ہو چکی تھی۔ اب اس گھر سے رونقیں اٹھ چکی تھیں۔ کوئی خوشی آتی تھی تو گھر کی فضاؤں میں موجود غم اُن خوشیوں کو دبا دیتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے مکین زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے لیکن اب بھی ایک جگہ خالی خالی سی تھی جسے کوئی بھی خوشی پُر نہیں کر سکتی تھی۔

آج ایرج کو تھراپی لیتے ہوئے سات ماہ ہو گئے تھے۔ سارہ کے غائب ہونے کے بعد تھراپی کے ذریعے جتنا وہ زندگی کی طرف واپس آئی تھی، اُسکی لاش ملنے کے بعد اُتنی ہی جلدی اور بُری طرح بکھر گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی جیسے جی کے آئی تھی کہ اُسے لگتا تھا کہ اس سے زیادہ کٹھن زندگی کیا ہی ہو گی۔

وہ بولنے لگی تھی۔

بہت مدھم سا مسکرانے بھی لگی تھی، مگر ماضی کی یادیں اب بھی دل ودماغ میں بہت جاندار تھیں۔

اُسے بہت عرصہ لگ گیا تھا یہ یقین کرنے میں کہ سارہ مر گئی ہے۔

مگر۔۔۔

وہ بھول گئی تھی کہ سارہ مری کیسے تھی۔

اُسے تمام واقعات کسی بُجھتی روشنی کی طرح یاد تھے۔وہ بھول گئی تھی کہ۔۔۔اُس دن کیا ہوا تھا۔اُس کے ساتھ بھی اور سارہ کے ساتھ بھی۔

بلکل سعد کی موت کی طرح وہ سارہ کی موت بھی بھول گئی تھی۔

وہ زندگی کی طرف آ رہی تھی مگر دماغی طور پر وہ اب بھی ماضی اور حال کے بیچ کسی جھولے کی طرح اٹک گئی تھی۔

مگر ایرج بدلی ضرور تھی۔ان گزرے سات مہینوں میں اُسے ایک فن آ گیا تھا۔

قبول کرنے کا فن۔

حقیقت مان جانے کا فن، ہنستے ہوئے یا روتے ہوئے۔۔۔ مگر زندگی کو جینے کا فن۔

فجر کا وقت گزرے کافی وقت ہو گیا تھا۔ سورج اپنی تپش برسا رہا تھا۔

وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اپنے بلے کو دیکھا۔ اسے گود میں اُٹھائے بالکنی کی طرف آیا اور پردے ہٹائے۔ دھوپ چھنتی ہوئی اُس کے چہرے پر پڑی تو اُس نے نظریں پھیر لیں۔ ٹو سیٹر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے گبی کو گود میں بٹھایا اور میز پہ پی کیپ رکھتے ہوئے گھر کی چابی ٹیبل پر اُچھال دی۔ اب وہ اپنے بلے کا سر سہلا رہا تھا۔

"آج سات ماہ ہو گئے گبی۔۔۔ تم ہی بتاؤ مجھے اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟" وہ اپنے بلے کے ساتھ اس طرح مخاطب تھا جیسے گبی ابھی اُس کو جواب دینے لگے گا۔

"انتظار تھکا دیتا ہے۔۔۔ تم تو ہو ہی آوارہ، تم نے کی ہے کسی سے محبت ؟"اس کے کہنے پر گبی نے اسے بے تاثر نظروں سے دیکھا، تھا تو وہ بھی جانور ہی،اُسے کیا معلوم تھا انسانوں کی زندگی اور جذبات کا۔

"میں جتا نہیں رہا، مگر میری اُمید بھی تو کمزور پڑ رہی ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ انتظار رائیگاں نہیں جائے گا،اس کے لئے انتظار کرنا آسان لگتا ہے مجھے،اس کی حفاظت کے لئے اذیت جھیلنا مشکل نہیں لگتا۔"

وہ ماتھا صوفے سے ٹکائے اُداسی سے کہہ رہا تھا۔ہاتھ ہنوز اپنے بلے کے سر پر تھا۔

"سات ماہ پہلے میں نے ہار مان لی تھی اُس کے آگے، مگر مجھے کیا اندازہ تھا ان آزمائشوں کا۔"ارمغان کے لبوں پر ایک مسکراہٹ آئی تھی،ایک اُداس مسکراہٹ۔

"مجھے پتا ہے کہ وہ آئے گی۔ میں سات ماہ سے اس ایک ملاقات کے لئے خود کو تیار کر رہا ہوں، مگر کیا میں اُسے یاد بھی ہوں گا؟" وہ ایک بار پھر گبی کی طرف متوجہ تھا
۔

"پتا نہیں میں خود کیوں اپنے قدم اُس کی طرف نہیں بڑھا پا رہا، میں اُس کا انتظار کیوں کر رہا ہوں؟" اُس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"شاید اس لئے کہ مجھے معلوم ہے۔۔۔ اس کے لئے انتظار ورتھ اٹ ہو گا"۔اب وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گبی کو اُس نے زمین پر اتار دیا تھا۔

سات ماہ پہلے ارمغان نے محبت کو قبول کیا تھا۔ لبوں سے نہیں، دل ہی دل میں بس۔ زندگی میں اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ محبت نامی کسی رشتے سے آشنا ہو گا ۔سات ماہ پہلے اُس نے نا صرف ایرج کو سوشل میڈیا پر تلاش کر لیا تھا بلکہ اس کے گھر کا آئی پی اڈریس نکال کر اُسے ٹریس بھی کر لیا تھا۔

اور ان سات ماہ میں اُس نے ہر رات ایرج کے گھر کے باہر گزاری تھی۔ کبھی اُس کے گھر کے سامنے موجود پارک میں، کبھی اس کی کیاری میں اور کبھی گھر کے باہر موجود گاڑی میں۔

سات ماہ ارمغان نے ایرج کو راتوں میں جاگتے دیکھا تھا۔ اور اُسے افسوس تھا کہ وہ اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ارمغان کو اُس کی حفاظت کرنی ہی تھی کیونکہ اُس کے گھر میں بہت کچھ ایسا تھا جس سے ایرج کی حفاظت کرنا ضروری تھی۔

ایرج آلتی پالتی مارے بستر پر بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کا بند لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ وہ اُسے دیکھتے کسی گہری سوچ میں گُم تھی۔ پھر آہستہ سے چشمہ چہرے سے ہٹائے، آنکھیں بند کر کے ناک کی ہڈی دبائی۔ اُس کے سر میں درد کی ٹھیس

اُٹھ رہی تھی۔وہ کافی دنوں سے ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی،آج بھی یہی معمول تھا ۔رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور وہ اب بھی جاگ رہی تھی۔،

اُسے نیند سے ڈر لگتا تھا۔نیند میں آتے خوابوں سے ڈر لگتا تھا۔

ایرج کو کمرے میں گھٹن محسوس ہوئی تو اُس نے پردہ ہٹایا اور کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ایک سرد ہوا کا جھونکا کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرے کو بیخ کر گیا تھا۔

بلآخر کافی سوچوں کے گزر جانے کے بعد اُس نے گول چشمہ واپس پہنا اور لیپ ٹاپ کھولا۔

زندگی ایک بار پھر سٹارٹ ہونے لگی تھی۔وہ خوش تھی بھی اور نہیں بھی۔وہ سب شروع صرف اپنے لئے کر رہی تھی۔

سات ماہ بعد آج اُس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا تھا۔

"کتنے فیڈ بیکس، کتنے لوگوں کے آرڈرز آئیں ہوں گے؟" اسکا ذہن سوچ رہا تھا۔

اور وہ ہاتھوں کو لبوں پر ٹکائے غور سے لیپ ٹاپ کی جگمگاتی اسکرین کو دیکھ رہی تھی

۔

پانچ منٹ لگے تھے اُسے تمام ای میلز کا اوپر اوپر سے جائزہ لینے میں۔ جیسا ایرج نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا تھا۔ اُسے بے تحاشہ آرڈرز موصول ہوئے تھے۔

مگر ان میں سب سے منفرد ای میل ایک فٹ بال کلب سے موصول ہوئی تھی۔

اُس نے بے اختیار ای میل کو کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ اُسے لوگو ڈیزائن کرنے کا کہا گیا تھا۔ ای میل تین دن پرانی تھی اور اُسے آرڈر مکمل کرنے کے اچھے بھلے پیسے مل سکتے تھے۔

ایرج نے ریپلائی میں ایک ای میل لکھ کے بھیج دی جس میں اُس نے کام کرنے کی حامی بھی بھری تھی۔

اسی وقت ایرج کو اچانک خیال آیا تو اُس نے لیپ ٹاپ پر ہی انسٹا گرام کھولتے ہوئے اُس فٹ بال کلب کا پیج ڈھونڈا، اُنگلیاں تیزی سے لیپ ٹاپ پر حرکت کر رہی تھیں۔اور اگلے چند لمحات میں پیج اُس کے سامنے کھل گیا تھا۔

اُس نے پیج اسکرول کر کے چند پوسٹس دیکھیں۔اُسے پتا چلا کہ زیادہ تر پوسٹس ایک کھلاڑی کی ہی تھیں جسے "بیسٹ اسٹرائکر" کا خطاب دیا گیا تھا۔اُس کے چند گولز کی ویڈیو سامنے آ رہی تھی۔کھلاڑی کی شکل واضح نہ تھی۔

"ارمغان مطاہر علی"۔ایرج نے زیرِلب اُس کھلاڑی کا نام پڑھا تھا۔

اور پھر۔۔۔

چند پوسٹس کے بعد اسکرول کرتے کرتے اُس کی انگلیاں ایک پوسٹ پر ٹھہر گئیں۔

شکل واضح دِکھ رہی تھی۔تصویر میں اُس نے ایک ٹرافی پکڑی ہوئی تھی۔اُس کے سر پر سفید پی کیپ تھی۔چہرے پہ بھی ایرج جیسا گول چشمہ تھا۔اور نیلے رنگ کی جرسی زیب تن کی ہوئی تھی۔

بس یہی ایک لمحہ تھا جس نے ایرج کے پورے وجود کو جھٹک کر رکھ دیا تھا۔اگلے ہی لمحے اُس کے سر میں اتنی تیز درد کی ٹیس اُٹھی کہ ایرج نے درد سے آنکھیں میچ لیں ۔اُس نے بے اختیار اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے مسلا۔

"میری گھڑی۔۔۔"

"ایکسکیوز می۔۔۔"

"Be careful"

ایرج کے دماغ کے سیاہ پنوں پر کسی کا دھندلا چہرہ لہرایا تھا۔وہ کون تھا؟اُسے یاد نہیں تھا لیکن وہ جو بھی تھا،وہ کہیں بہت قریب تھا۔

ایرج نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں کھولیں۔آنکھوں کے سامنے منظر چلنے لگا تھا۔اُس نے بہت مشکل سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دوبارہ دیکھا تھا۔اسکرین پر اُس کھلاڑی کی تصویر اب بھی کھلی تھی۔پی کیپ، ہلکی داڑھی، سیاہ آنکھیں، گندمی رنگت۔

"ارمغان مطاہر علی"۔اُسنے ایک بار پھر اُسکا نام دہرایا،اور اس بار جیسے خود کو حفظ کروایا تھا۔

اگلے ہی لمحے اُس کی اُنگلیاں کیبورڈ پر چل رہی تھیں۔

-----x------

رات گہری ہوتی جارہی تھی۔کتوں کے بھونکنے اور چمگادڑوں کی مدہم آواز فضا میں واحد شور تھا۔وہ معمول کے مطابق اسی پارک میں آکر بیٹھا ہوا تھا جہاں وہ روز آیا کرتا تھا۔

پارک میں ایک بڑی سی زرد رنگ کی بتی جل رہی تھی جو اس جگہ کو روشن کرنے کے لیے کافی تھی۔ پارک کے بیچوں بیچ ایک فوارہ تھا جس سے پانی پھوار کی صورت نکلتا زرد روشنی میں چمک رہا تھا۔

مگر ارمغان اس وقت پارک کی اندھیر جگہ بیٹھا تھا جہاں اس کے سر پر بڑے بڑے ناریل کے پیڑ اسایہ فگن تھے۔ پارک کی روشنی وہاں تک پہنچ نہیں پا رہی تھی جس کی بدولت وہ وہاں دور سے بس ایک سایہ لگ رہا تھا۔

اس کے ہاتھ میں لائٹر تھا جسے وہ وقفے وقفے سے جلا بجھا رہا تھا۔ کبھی اپنے ہاتھوں کو اس سے سلگاتا، کبھی بس اس سے نکلتے شعلے کو دیکھتا۔

ایک دم اس کی گود میں پڑا موبائل چمک اٹھا تھا۔ اسے لگا تھا وہ کوئی اشتہار کا میسج ہو گا مگر اسے کیا پتا تھا کہ وہ ایک پیغام اس کے سات ماہ کے انتظار کو اختتام تھا۔

اس نے آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے موبائل کو دیکھا اور اس کی سانس جہاں تھی، وہاں ہی لمحے بھر کو ٹھہر گئیں۔اس نے پیغام واپس سے پڑھا۔اس بار خود کو یقین دلانے کے لیے۔

----x-----

ایرج نے سامنے کھلے پیغام کو ایک مرتبہ واپس پڑھا۔پیغام منٹوں میں ہی دیکھا جا چکا تھا مگر جواب نہ آیا۔کیا وہ کوئی غلطی کر رہی تھی؟اسے تو خود بھی معلوم نا تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔

مگر اتنا بڑا قدم۔۔۔۔۔۔۔وہ بھی ایک انجان کے سامنے؟

مگر مسئلہ ہی تو یہی تھا۔وہ شخص انجان نہیں لگتا تھا۔اس کا چہرہ،اس کے وجود سے شناسائی جھلکتی تھی۔

----x------

"ارمغان۔۔۔۔۔۔مجھے چند سوال ہیں آپ سے۔کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ آپ سے کہیں ملاقات ہوئی ہے میری۔۔۔۔۔میری کزن سارہ۔۔۔۔مجھے لگتا ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔کسی جگہ۔۔۔۔وہاں میری کزن بھی تھی۔۔۔۔کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

پہلی دفعہ اس پیغام کو پڑھتے اس کے اندر سات ماہ سے جلتی آگ پر پانی پڑا تھا مگر دوسری بار پیغام پڑھتے اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ایرج اس کے لیے انجان نہیں تھی۔۔۔مگر وہ تو اس کے لیے تھا۔

کیا اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا کہ اس انجان سے گفتگو کرنا؟

اسے لگا تھا وہ زیادہ سوچ رہا ہے۔پر اسے سمجھ نہیں آیا تھا وہ جواب کیا اور کیسے دے؟ بار بار وہ جواب لکھتا اور مٹاتا۔سات ماہ پہلے اور بعد والے ارمغان میں کتنا فرق آگیا تھا،یہ ارمغان خود نہیں جانتا تھا۔

"ایگل میموریل فٹبال کلب، شام چھ بجے۔میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

اس نے اپنی توقع سے زیادہ مختصر جواب دیا تھا۔ گردن گھما کر اس نے پار کھڑی فاطمہ منزل کو دیکھا جو آدھی اندھیرے اور آدھی مدھم روشنی میں نہائی لگتی تھی۔ ایک لمحے کو اپنایت اس کے چہرے سے گزری۔اس نے گردن واپس گھما کر فون بند کر دیا۔اب وہ لائٹر کو واپس جلا بجھا رہا تھا۔

-----x-----

اس کا جواب پڑھتے ایرج کو حیرانی سی ہوئی تھی۔اس نے ارمغان سے ملنے کا تو نہیں سوچا تھا،نہ کہا تھا۔وہ اس سے ملنے تو ہر گز نہیں جانے والی تھی۔وہ ایک انجان سے یوں کیسے مل سکتی تھی؟

سوچ میں ڈوبے اس کے دماغ پر یادوں کی لہر حاوی ہونے لگی تھی۔اسی مرد کی یاد جو اس کے زندگی میں آیا تھا،اور چلا گیا تھا۔اور نہ اس کے بعد کوئی آیا،نہ اس نے آنے

دیا۔اس شخص کی یاد جس کے لیے اس نے اپنی زندگی یک طرفہ طور پر تباہ کر دی تھی۔

(ماضی)

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔بستر پہ سعد اوندھے منہ لیٹا تھا۔وہ سخت گرمیوں کی ایک خشک رات تھی جس دن سعد کے بورڈ کا آخری پرچہ ہوا تھا اور وہ بھی اتنا برا تھا کہ جب سے آیا تھا کمرے میں لیٹا ہی رہا تھا۔

''چلو آئس کریم کھانے جا رہے ہیں۔اٹھو چلو۔''ایرج اس کے کمرے میں داخل ہوتے،بتیاں جلاتے سعد سے مخاطب تھی۔

''مجھے نہیں جانا کہیں. آپ لوگ چلے جائیں۔''اس نے اسی طرح لیٹے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ہے سعد؟ پیپر تھا گزر گیا۔اللہ سے دعا کرو۔اتنا بھی برا نہیں کیا ہو گا جتنا تمہیں لگ رہا ہے۔اب اٹھو۔آج تو آزادی کا دن ہے۔لیٹس انجوائے!''۔وہ فکر مندی سے اس کے پاس آئی اور مسکراہٹ لبوں پر سجائے اسے سمجھانے لگی۔

پندرہ منٹ بعد وہ سب گاڑی میں بیٹھے گپے ہانک رہے تھے۔ارحم ہمیشہ سے ہی اتنا ہینڈسم تھا۔اس کی بڑھتی عمر اسے اور زیادہ ہی خوبصورت بنانے لگی تھی۔نیلی ٹی شرٹ پر سیاہ جینز کی پینٹ پہنے اس وقت گاڑی چلا رہا تھا اور پیچھے بیٹھی ایرج باقیوں کو گفتگو کرتے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

جب وہ ہوتا تھا تو کوئی اور معنی نہیں رکھتا تھا اور جب وہ نہیں ہوتا تھا تو اس کی یاد کچھ اور ذہن میں آنے نہیں دیتی تھی۔یہ محبت نہیں تھی۔بس ایک جان لیوہ کشش تھی جس کا اثر ایرج پر حاوی ہونے لگا تھا۔

"ایرج کا فیورٹ فلیور تو مجھے پتا ہے, تم لوگ اپنے اپنے بتاؤ"۔

وہ آئس کریم پارلر کے اندر داخل ہو رہے تھے جب وہ ارحم کی بات پر کچھ حیران ہوئی تھی۔ایسے ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی کو اس کا پسندیدہ فلیور معلوم ہو۔کیونکہ وہ فلیور ہی عجیب تھا۔

"اچھا؟اور کیا ہے میرا پسندیدہ آئس کریم فلیور؟" اس نے چیلنجنگ انداز میں ارحم سے پوچھا۔

"ببل گم، نہیں؟" وہ بھی اسی انداز میں مسکرایا اور آگے بڑھ گیا.

اور وہ پیچھے چند لمحے ششدر کھڑی رہی پھر سارہ کے کندھے تھپکنے سے اسے ہوش آیا، خود کو کمپوز کر کے وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

ارحم ہر بار اسے جانے بغیر ایک موقع دے دیتا تھا، اپنی محبت میں گرفتار ہو جانے کے لیے اور وہ ہر بار اس کے جال میں پھنس جاتی تھی۔

(حال)

یخ ہوا سے درخت کے سوکھے پتوں کے لہرانے کی آواز کی بدولت وہ خواب کی سی کیفیت میں سے واپس آئی۔ ارحم کی یاد اور اس کی باتیں جیسے اسے حفظ تھیں۔ وہ اسے کبھی بھولی ہی کہاں تھی۔ ارحم کے لیے اس نے محبت کا ہر زینہ پار کیا تھا مگر یک طرفہ طور پر۔

اس کا سر اب درد سے بے حد پھٹ رہا تھا۔اسے دوا کھانے کی ضرورت پیش آنے لگی تھی۔اسے اب سو جانا چاہیے تھا ورنہ سر کا درد اور بڑھ جانا تھا۔لیٹتے ہوئے وہ اسی کشمکش میں الجھی تھی کہ ارمغان سے ملنے جائے یا نہیں۔اسے لگا تھا کہ اس سے ملنے کے بعد رازوں کا ایک گچھا کھل جانا تھا جن میں وہ کئی سالوں سے الجھی ہوئی تھی۔

مگر یوں انجان وہ بھی ایک لڑکے سے ملنا۔۔۔۔وہ اتنی بہادر بالکل نہیں تھی۔

اس نے طے کیا تھا کہ وہ اس بارے میں صبح اٹھ کے سوچے گی۔لیمپ کی روشنی بجھاتے وہ بستر پہ لیٹ گئی تھی۔

--------x---------

کتنے عرصے بعد اسے اتنی لمبی نیند نصیب ہوئی تھی۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔

اس کی نیند حنا کی آواز سے ٹوٹی تھی۔اسے اتنے عرصے بعد کوئی(sleep

(paralysis)خواب، کوئی نہیں ہوا تھا۔اور ایرج تو ٹھہری توہم پرست، اسے لگا تھا کہ یہ اس کی زندگی میں کسی خوشی کی نشانی ہے۔

ناشتہ کر کے وہ لیپ ٹاپ لے کے بیٹھ گئی تھی۔آج ہفتہ تھا اور یونیورسٹی بند تھی۔ وہ لیپ ٹاپ پر جھکے رینڈم ڈیزائنز بنا رہی تھی تا کہ اپنی اسکلز پالش کر سکے۔حنا کمرے میں داخل ہوتے اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

''کیسی طبیعت لگ رہی ہے اب ایرج؟''ان کے جھری زدہ چہرے پہ سوالیہ مسکراہٹ تھی۔

''ٹھیک امی۔''اس نے بھی اپنی ماں کو مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا مگر درحقیقت اس کے سر میں ابھی بھی تھوڑا بہت درد تھا۔حنا اس کے لیے ویسے ہی پریشان رہتی تھیں وہ کیا ان کو اور پریشان کرتی۔

مختصر بات کرتے حنا کھانا بنانے کچن میں چلی گئی تھیں۔اور وہ بستر پر بیٹھے کام کرتی رہی۔وقفے وقفے سے اس کا ذہن اس پیغام پر جاتا جو کل رات ارمغان نے اسے بھیجا تھا۔وہ اب بھی کسی نقطے پر نہیں پہنچی تھی۔

وہ جانا چاہتی تھی،وہ ملنا چاہتی تھی اس سے کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔شاید اسے سات ماہ پہلے والے واقعات مکمل یاد آجائیں۔ارمغان کی حامی نے اسے اور امید دلائی تھی۔وہ سارہ کے بارے میں جانتا تھا۔کیا اور کیسے ؟اس کا جواب اس سے مل کے ہی حاصل ہونا تھا۔

مگر وہ اتنی بہادر نہیں تھی۔

وہ جو بات بات پہ اٹک جاتی تھی،اکثر چیزوں کو بھول جاتی تھی،وہ کیسے اس بارے میں ایک انجان سے بات کرتی جو اسے خود بھی ٹھیک سے یاد نہیں۔کیا پتا اس شخص کو کچھ معلوم نہ ہو،کیا پتہ وہ اسے پھسانا۔۔۔مگر وہ ایسا کیوں کرتا؟آخر ایرج نے ہی اس سے رابطہ کیا تھا۔اگر اسے ایرج کو پھسانا ہوتا تو وہ خود کوئی جال بچھاتا۔

اس کے دماغ میں سوال کے بدلے سوال تھے، جواب کوئی نہ تھا۔

-----x------

"وہ نہیں آئے گی."

جرسی میں بازو گھساتے وہ اپنے دماغ میں بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔

"اسے میں یاد بھی نہیں ہوں۔ وہ کیوں آئے گی ایک انجان سے ملنے۔۔۔" اس کے چہرے پہ دکھ کے کوئی آثار نہ تھے، البتہ اس کا چہرہ سپاٹ اور بے تاثر تھا۔

"اور اگر وہ آ بھی گئی تو وہ مجھے اس طرح نہیں دیکھے گی جیسے میں نے اسے دیکھا ہے۔ اتنے عرصے کوئی داغ کو سنبھال کے نہیں رکھتا۔ یا تو اسے دھو دیتا ہے، یا اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ ہر کوئی بے داغ کپڑے پہنتا ہے، داغ کے کسی کو پسند نہیں۔" اس نے جوتے کے تسمے باندھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"وہ نہیں آئے گی۔ ارمغان۔۔۔ تم نے اپنی زندگی کے سات ماہ ایک جھوٹی امید میں گزار دیے، ویل ڈن۔" وہ خود کو ہی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ طعنے دے رہا تھا۔

گبی کو کھانا دے کر وہ میچ کے لیے گھر سے روانہ ہو گیا تھا۔ بہت سی امیدیں اور بہت سی خواہشیں دفنا کر وہ بے دل سا زینے اتر رہا تھا۔

اس نے چھوٹے سے کلچ میں پاکٹ نائف رکھی تھی۔ چہرے پر نہ ہونے کے برابر میک اپ تھا۔ بالوں کو اس نے ویسے ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ سرمئی کوٹ پہنے وہ اُبر بلاتی کمرے سے باہر نکلی تھی۔

"بس ایک ملاقات، ایک مختصر ملاقات۔ مجھے بس چند سوالات پوچھنے ہیں اور واپس آنا ہے، سات بجے سے پہلے گھر پر ہوں گی۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔" وہ بار بار خود کو جیسے تسلی کروا رہی تھی۔ بظاہر وہ دکھنے میں عام سی لڑکی لگ رہی تھی مگر اس کے اندر ایک زلزلہ تھا۔ وہ زندگی میں اتنا کنفیوز کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مسٹری انسان کو کتا بنا دیتی ہے۔ اسے لگا وہ رازوں کے کھلنے کی پیاسی تھی۔ کیونکہ جو سوال اس کے پاس تھے وہ گھر میں کسی سے نہیں پوچھ سکتی تھی۔ کیونکہ دو قریبی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ایک۔۔۔۔

اس نے ذہن میں ابھرتی یادوں کو جھٹکا۔اس نے اپنے ساتھ زیادہ قیمتی سامان بھی نہیں رکھا تھا کیونکہ کراچی تو پھر کراچی تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے وہ تمام مناظر سوچ رہی تھی جو چند لمحوں بعد پیش آ سکتے تھے۔

جیسے جیسے وہ کلب کے قریب جا رہے تھے اس کا دل اتنا ہی تیز دھڑک رہا تھا۔وہ بالکل اکیلی تھی۔اس سے زیادہ پریشان کن بات کیا ہوتی ؟۔۔۔

مگر دور کہیں دماغ کے کسی کونے میں،اسے احساس ہوا تھا کہ ارمغان سے ملنا اس کی غلطی نہیں ہو گی۔

اسے لگا تھا وہ اسے۔۔۔کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔اس کا گندمی چہرہ اور سیاہ چمکتی آنکھیں اس کے ذہن پہ نقش ہونے لگی تھیں۔اس کے بکھرے بال اور مدھم مسکراہٹ۔

ایرج کو اس ملاقات سے پریشانی اور گھبراہٹ ضرور تھی۔مگر ڈر نہ تھا۔

-----x------

ہاف ٹائم کے بریک میں وہ پسینے سے آلود اپنا چہرہ تولیے سے تھپتھپا رہا تھا۔ٹورنامنٹ میں زیادہ دن نہیں تھے اور وہ جتنا چاہے پریکٹس کر لے،خود سے ناخوش ہی رہتا۔

اب بھی وہ دو گولز کی لیڈ پہ تھے۔

ہاف ٹائم ختم ہونے کی سیٹی بجی تو کرسی سے اٹھتے اس نے مخالف ٹیم کے گول کیپر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تمہیں نہیں پتا کیا؟

once I am on the field, It's obvious that I am the winner"

وہ مسکراہٹ دبائے کہتا آگے بڑھ گیا. حالانکہ اس نے مخالف کو ایک طرح کی دھمکی دی تھی، جس سے اس کو دشواری پیش آسکتی تھی۔کلب میں کھیل کے دوران مخالف ٹیم کو دھمکی دینے کی اجازت نہ تھی، مگر کیا ارمغان کو کسی کی فکر تھی بھی؟

فٹبال کھلاڑیوں کے پاؤں سے روندتے کبھی ادھر جاتی کبھی ادھر۔ہاف ٹائم کے بعد بھی ارمغان کا تنفس اتنا ہی پختہ تھا۔وہ بس تھکا نہ تھا۔جیت کی امید کسی کو تھکاتی بھی ہے کیا؟

مگر مسئلہ یہی تو تھا۔

ارمغان کو جیت کی امید نہیں تھی،اسے جیت کا یقین تھا۔

وقت ختم ہونے میں چند منٹ ہی رہتے تھے اور فٹبال ارمغان کے پاؤں سے لگتی اس کے ساتھ ساتھ مخالف گول پوسٹ کی طرف بھاگ رہی تھی۔

وہ سامنے دیکھتا سب سے بے نیاز شوٹ کرنے لگا تھا کہ اس کی نظر دور۔۔۔

سیڑھیوں کے پاس کھڑے اس وجود پر پڑی۔

اور وہ لمحہ تھا جو اس کے ذہن میں جیسے امر ہو گیا۔

اس نے گول پوسٹ کے قریب دیکھے بغیر فٹبال شوٹ کر دی تھی کیونکہ اس کے لیے اس لمحے کوئی اور زیادہ اہم ہو گیا تھا۔

فٹبال گول پوسٹ میں جاتی یا نہ جاتی اسے پرواہ نہ تھی۔ بس وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوتی۔

فٹ بال گول کیپر نے روک لی تھی اور ارمغان کو ایک طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھا تھا۔ مگر ارمغان نے اسے دیکھنا گوارہ بھی نہ کیا تھا۔ میچ ٹائے ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ختم ہوا تھا۔

وہ باقیوں کی پرواہ کیے بغیر اسے بنا پلک جھپکے دیکھتے اس کے رخ میں چلتا جا رہا تھا۔

''وہ نہیں آئے گی۔'' اس کے ذہن نے اسی کے الفاظ دہرائے تھے۔ اس کے چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا جبکہ دل خوشی اور اُلجھن سے لبریز تھا۔ وہ زندگی میں کبھی اتنا کنفیوز نہیں ہوا تھا۔ ماتھے کا پسینہ بازو کی مدد سے پوچھتے ہوئے، وہ سستی سے اس تک پہنچتے زینے چڑھ رہا تھا۔

اس نے بازو باندھے ہوئے تھے۔ سیاہ جوڑے پہ سرمئی کوٹ زیب تن کیے، وہ اس کی نظروں کو پہچان نہیں پایا تھا، وہ کیا محسوس کر رہی تھی؟ کیا سوچ رہی تھی؟

اور دو پل کے مسافت نے اسے اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ سات ماہ کی یادیں کسی فلم کی طرح ارمغان کے ذہن میں چلنے لگی تھیں۔ انتظار کا اختتام ہو گیا تھا اور ملاقات کی شروعات۔

اس کی سیاہ آنکھیں ایرج کے چہرے کو دیکھتے جھک گئی تھیں۔ وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ (یقیناً ہوا میں خنکی بہت تھی تبھی سانس لینا مشکل ہوا ہو گا)

------X-------

وہ بہت ہینڈسم تھا۔

صحیح بات ہے، وہ خود کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ وہ بلاشبہ اچھا دکھنے والا خوشکل مرد تھا۔ ایرج کو چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ ایموشنز پر کسی کا بس نہیں چلتا اور سچ بات ہے کہ اسے دیکھتے ہی پہلا خیال اسے یہی آیا تھا۔

"آپ بیٹھیں۔۔۔ پانی؟" اس کی آواز بہت جانی پہچانی لگتی تھی۔ جیسے کسی بہت قریبی کی آواز ہو، مگر وہ جان نہیں پائی کہ کس کی؟

"نہیں، میں یہاں کچھ پوچھنے آئی ہوں، اور پھر میں چلی جاؤں گی۔" کہنے سے پہلے اس نے کتنے ہی لمحے لفظوں کو جوڑ توڑ کیا تھا۔

"تو یوں ہی؟ کھڑے کھڑے؟" اب کی بار اس کی آواز آئی تو ایرج کو لگا کے وہ بھی اتنی ہی کنفیوز ہے جتنا کے وہ۔ بنا کچھ کہے ساتھ ہی لگی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کن آنکھیوں سے دیکھا کہ وہ چھوٹے سے تولیے سے منہ پوچھ رہا تھا۔ شاید وہ فوراً ہی

فٹبال کا میچ کھیل کر آیا ہے کیونکہ وہ سامنے فیلڈ پر دوسرے کھلاڑیوں کو دیکھ سکتی تھی۔

دو کرسیاں چھوڑ کر وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔دونوں سامنے دیکھ رہے تھے۔ہری زمین اور جامنی آسمان کے مشترکہ رنگ آنکھوں میں قید کرتے دونوں لمحے بھر خاموش تھے۔

ایرج اس کی تیز تیز چلتی سانسوں کو دو کرسی دور بیٹھے ہوئے بھی سن سکتی تھی۔

وہ لمحے جیسے صدی بن گئے تھے۔وہ ذہن میں لفظوں کو ترتیب دیتے سوچ رہی تھی کہ وہ کیا بولے۔اس کے کلچ کی زپ کھلی تھی۔وہ کسی بھی خطرے کے لیے تیار تھی مگر اسے لگا تھا کہ کوئی خطرہ اس کے قریب نہیں ہے۔بس وہ ہے اور اس سے دو قدم دور بیٹھا انجان شخص جس کو جاننے کا دعوی وہ بھی اپنے دل و دماغ میں کر چکی تھی۔

"سارہ کو کیسے جانتے ہیں آپ؟" بالآخر ایک طویل وقفے کے بعد اس نے بغیر کسی تمہید کے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا کسی سارہ کو۔" اس نے اتنے عام انداز میں کہا تھا جیسے اسے کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔

ایرج آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اس سے نظر ملائے بغیر سامنے۔

"تو۔۔ وہ۔۔ جھوٹ۔۔۔ آر یو کڈنگ می؟" چھری پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ خطرے کی گھنٹی اس کو چاروں اطراف زور سے سنائی دے رہی تھی۔

"میں آپ کو جانتا ہوں ایرج۔" اب کی بار اس نے ایرج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔اس کے تاثرات نرم پڑنے لگے تھے اور وہ اب جیب سے اپنا چشمہ نکال کے پہننے لگا تھا۔

-----x------

ایرج آگے کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا، اس کو اندازہ بھی تھا؟

اس نے اس شخص کو دیکھا بھی نہ تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اسے جانتا ہے؟

"مگر تم نے کہا تھا تم سارہ کو جانتے ہو۔۔۔؟" وہ اسی حیرانی سے اسے دیکھتے بول رہی تھی۔آپ سے تم تک وہ کب پہنچی وہ خود بھی نہیں جانتی تھی، کیا وہ معنی رکھتا بھی تھا؟

"مجھے یاد نہیں کہ میں نے ایسا کچھ کہا تھا؟" اس کے چہرے پہ نہ مسکراہٹ تھی نہ کوئی تاثر، مگر چہرہ سپاٹ نہ تھا۔خشک تھا مگر نرم بھی۔

ایرج کو لگا تھا اس سے بے وقوف اس دنیا میں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔اس نے میسج پہ ملنے کا پتہ اور وقت بتایا تھا۔وہ کس کو جانتا ہے کس کو نہیں، یہ کہاں بتایا تھا۔اور عقلمند ایرج نے پوچھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

"کیسے جانتے ہو۔۔۔۔مجھے" اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔مگر وہ ہمت کر کے وہاں بیٹھی رہی۔

”سات ماہ پہلے۔ ہم ایک کیفے میں ملے تھے۔۔۔“ وہ اب ہاتھ باندھے تحمل سے بتا رہا تھا۔ وہ سات ماہ پہلے ہوئی ایک ملاقات۔

”آپ، اور شاید آپ کی دوست ایک کیفے میں بیٹھے تھے، شاید وہی سارہ تھیں؟

”اتفاق سے میں آپ سے ملا تھا۔ ہماری مختصر گفتگو ہوئی تھی۔۔۔“ آدھی بات کے درمیان اس نے اپنی زبان کو لگام دے دی. وہ اس کیفے میں کیوں تھا, کس لیے تھا, وہ آدھی سے زیادہ باتوں کو گول کر گیا تھا۔

ایرج کے سامنے منظر سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ جیسے دماغ کچھ یاد کر رہا ہو۔۔۔ کوئی پرانی یاد۔۔۔۔۔

”میں چلتی ہوں۔ شکریہ۔“ وہ اسے دیکھے بنا سیٹ سے اٹھ کر قدم بڑھانے لگی۔ اسے آنکھوں میں عجیب سی چبھن ہو رہی تھی۔ سر میں درد کی ٹھیس اٹھ رہی تھیں۔“

"be careful"

"وہ جو اسکے وجود کو پار کرتے گزر رہی تھی، اسکے جملے پہ ٹھہر سی گئی تھی۔ ساتھ اس کی دنیا بھی ٹہر گئی تھی۔

"be careful"

یہ لفظ اس نے کہیں سن رکھے تھے، وہی لہجہ، وہی آواز، وہی الفاظ۔

"تم۔۔۔ کون ہو تم۔؟" وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی قدم قدم دور ہو رہی تھی۔

اذیت دیتی ہیں دھند میں تپتی یادیں۔ اذیت ملتی ہے جب ذہن زندگی کے واقعات بھولنے لگتا ہے۔ کتنا مشکل ہوتا ہے ایک اصل زندگی میں رہ کر اس زندگی کو نہ جینا۔

"میں آپ کی مدد کروں گا ایرج۔ میں انتظار کروں گا۔ ایک اور ملاقات کے۔ م لیے۔" وہ سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب اسے بے جان نظروں سے دیکھتے کہہ رہا تھا۔

وہ اذیت سے مر جائے گی مگر ارمغان مطاہر علی سے ملنے واپس نہیں آئے گی۔

کلب سے نکلتے اس نے عہد کیا تھا۔

------x-------

فلیٹ کا عقبی دروازہ ٹھاہ سے بند ہوا تو وہ تیز قدموں سے چلتا لاؤنج میں آیا تھا۔

مغرب کا وقت گزر چکا تھا اور آسمان اب مکمل سیاہ تھا۔تاروں کی چمک بھی اس کے دل کے اندر اندھیرے کو روشن نہیں کر سکتی تھی۔

وہ ایک ہاتھ کی دو انگلیوں سے ماتھا مسلتا صوفے پر نیم دراز سا گر گیا۔آنکھیں قرب سے بند کر لیں اور سر پہ ٹکی سفید پی کیپ کو ٹیبل پر اچھال دیا۔

''تم سے زیادہ بے وقوف کون ہو گا ارمغان۔۔۔''اتنے عرصے بعد اس نے خود کو کوسا تھا اسے اچھا لگا تھا۔

''سرے سے ہی تمہاری تمام حرکتیں غلط تھیں۔یہ کیا حرکت کی ہے تم نے۔۔''

وہ چابی کا گچھا دوسرے ہاتھ سے گھماتا آج شام کی اس ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کے خیال میں کبھی نہیں ہونی چاہیئے تھی۔

"نہ میں اسے کبھی میسج کرتا، نہ وہ کبھی آتی۔۔۔اور نہ وہ کبھی میرے بارے میں یوں سوچتی۔۔۔۔" وہ بلند آواز میں کہتا خود کو گالیاں دے رہے تھا۔

اسپورٹس جیکٹ سے اس نے ایک ننھا سا پاکٹ نائف نکالا۔ وہ پیلے رنگ کا پاکٹ نائف اس کا نہیں تھا مگر جس کا تھا اس کے بارے میں سوچ کر اس کا درد کرنے لگا تھا۔

"اتنا معلوم تھا کہ وہ مجھ سے ملنے میں ہچکچائے گی۔۔۔ مگر وہ مجھ سے ڈرتی تھی؟" وہ چھری کو ہاتھوں میں گھماتا بے یقینی سے سوچ رہا تھا۔

"اسے لگا تھا میں اس پر حملہ کروں گا؟ اسے مجھ سے خوف آیا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ مگر"۔ وہ سات ماہ سے جس شدّت سے اس دل کو کسی کی امید پہ واپس مرہم لگائے جوڑے ہوئے تھا۔۔۔۔۔آج وہ اسی شدت سے کرچی کرچی ہوا تھا۔

"کاش میں اسے بتا سکتا کہ کیفے کے علاوہ بھی میں نے اسے کہاں کہاں نہیں دیکھا تھا۔ کاش میں اسے بتا سکتا کہ اس کے لیے ہماری ملاقات سات ماہ پہلے والا وہ اتفاق۔۔۔

اس نے آنکھوں کو نرمی سے موندا۔

چھری کا ایک چھوٹا سا بٹن دبایا تو اسکی نوکیلی جگہ باہر کو آگئی۔

وہ اپنی جیکٹ کی آستین اوپر کر رہا تھا۔

"یو ڈیزرو دس پین"

اتنے عرصے بعد اسے خود سے اسی قسم کی گھن آئی تھی اور آج اتنے عرصے بعد وہ خود کو وہی درد دینے والا تھا جو اسے کھوکھلا کر دیتی تھیں۔ جو اسے صرف ایک غلیظ انسان بنا کر چھوڑ دیتی تھیں۔ بے دل، بے جان۔۔۔ ایک بسمل، ایک جرح زدہ مردہ انسان۔

وہ اب چھری کو اپنے کلائی سے تھوڑا اوپر رکھتے، چھری پر زور دینے لگا تھا۔اس نے آنکھیں درد کی ایک ٹھیس پر زور سے میچ لیں۔

''کیسا انسان ہوں میں۔'' کراہتے ہوئے سرگوشی میں خود کلامی کی۔خون کے قطرے ایک ایک کرتے زمین پر گر رہے تھے۔

-----x-----

''کیسی انسان ہوں میں؟'' کمرے میں داخل ہونے کے بعد اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز اسکی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ مگر اس کے کانوں میں تو کسی کی بھاری اکھڑی اکھڑی آواز پہلے ہی پہرا دیے ہوئی تھی۔

''میں آپ کو جانتا ہوں ایرج۔۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے بے ساختہ کانوں پر ہاتھ رکھا، جیسے اس آواز کو دبانا چاہا ہو مگر وہ آواز جیسے دماغ اور دل دونوں سے جا ملی تھی۔

"سرے سے ہی تمہاری غلطی تھی۔۔۔۔ تم سے زیادہ بے وقوف کون ہو گا ایرج؟" خود سے کہتے اسے اپنے آپ پہ ہی غصہ آیا تھا۔ کلچ کے اندر رکھا فون میسیجز کی آواز سے بار بار بجا رہا تھا مگر اس نے کلچ بستر پر اچھالتے اپنی پشت بستر سے ٹکالی۔

"اتنی بڑی غلطی۔۔۔ خود پیر پہ کلہاڑی ماری ہے تم نے۔۔۔" خود کو کوستے اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

وہ ایسی ہی تھی۔ پہلے غلطی کرتی تھی اور بعد میں پچھتاتی تھی۔ آدھے سے زیادہ کام اور مواقع وہ اسی وجہ سے گنوا دیتی تھی کیونکہ اسے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ کوئی غلطی نہ کر دے۔ اسے گھر میں کبھی کچھ نہ کہا گیا تھا مگر وہ خود کو بہت کوستی تھی۔ خود کو کبھی بد دماغ تو کبھی پاگل کہتی۔ اس کے آدھے مسئلے اس کی اپنی وجہ سے ہی تھے اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پائی تھی۔ کیا اس کی غلطی بھی تھی ان سب میں؟

اس کے دماغ میں بس ماضی کی دنیا اس کے حال کی دنیا سے زیادہ بڑی اور زیادہ کٹھن تھی۔وہ کس چیز پہ کس وقت اور کہاں دھیان دیتی؟

"جاہل۔۔۔۔جاہل۔۔۔۔جاہل" اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اپنا سر پیٹا تھا۔

"اگر وہ تمہیں مار۔۔۔۔" لمحے بھر کو اس نے سوچا تھا اور دوسرے ہی پل اس کے ذہن کی اچھائی نے اس سوچ کو فنا کر دیا تھا۔

"وہ ایسا نہیں ہے، لگتا تو بالکل بھی نہیں۔" ایرج ایسی ہی تھی۔ چیز ہو یا انسان، اچھا ہو یا برا، وہ اس کی اچھائی کو ہی دیکھتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہر شخص زندگی میں اپنے الگ مسئلوں سے ڈیل کرتا ہو گا۔ جس کی وجہ سے اس کی منفی خامیاں ہوتی ہیں۔ اس کے خیال میں کوئی بھی شخص برا نہیں ہوتا۔۔۔حالات برا بنا دیتے ہیں۔

اسے خود بھی اندازہ نہ ہوا کہ کب اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کے گرا۔ فوراً ہی اس نے آنکھوں کو رگڑا تھا۔

"آج ارحم ہوتا تو۔۔" اس کے لب پھڑ پھڑائے اور اسی ایک شخص کا نام لیا جو کبھی اس کے ذہن سے خارج ہی نہیں ہوا تھا۔

(ماضی)

یونیورسٹی کا داخلی امتحان دے کر وہ گھر واپس آ رہے تھے۔ گاڑی برق رفتاری سے کراچی کی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ سامنے ڈرائیور سیٹ پر ایک وجیہہ شخص براجمان تھا جس کے چہرے پر فریم لیس گلاسز تھے۔ بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور وہ صبح کی رف سی حالت میں دکھائی دیتا تھا۔ سیاہ ٹی شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر۔ گلے سے لپٹا وہی مخصوص سلور لاکٹ جس کے پینڈنٹ پہ وہی عبارت ابھری ہوئی تھی۔

''ہو جاؤ گی تم پاس اتنی ٹینشن کون لیتا ہے۔'' بالآخر پانچ منٹ سے برقرار خاموشی اس نے ایرج کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے توڑی.

''تم ہنس رہے ہو؟''۔اس نے آنکھیں گھما کر اس کی شکل دیکھی تو وہ اسے مسکراہٹ دبائے دیکھ رہا تھا۔

''میں؟ نہیں تو۔ میں تو چپ ہوں۔'' پھر اسٹیرنگ ویل سے ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں پہ رکھ لیا۔

''ارحم۔۔۔اگر داخلہ نہ ہوا تو میرے پاس اور کوئی چوائس۔۔۔۔''

''ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی. تم پاس ہو جاؤ گی، میری بات کا تو یقین ہے نا؟''اس کی پریشانی سے ماتھے پہ ابھری لکیروں کو دیکھے اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''تم اتنے یقین اور اعتماد سے کیسے کہہ رہے ہو؟''ایرج اور اس کی پریشانی ساتھ کبھی چھوڑنے والی نہ تھی۔

"کیونکہ تم سے زیادہ بھروسہ مجھے ہے تم پر۔۔۔۔" وہ اب ایرج کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سڑک پہ گاڑی چلاتے فوکسڈ لگتا تھا۔

وہ ایسے ہی عام باتیں کر کے پلٹ جاتا تھا اور لوگ اسے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

"کچھ کھایا ہے صبح سے؟" اس کے کچھ نہ بولنے پر اس نے سوال کیا۔

"صبح ڈبل روٹی اور چائے پی لی تھی۔۔۔۔" وہ اس کی پچھلی بات پر اب تک اٹکی ہوئی تھی۔

"یعنی کچھ نہیں کھایا۔۔۔۔ چلو باہر ناشتہ کرتے ہیں آج۔۔۔۔" اس نے گاڑی کو دوسری جانب موڑ لیا۔

"مگر گھر پر امی نے بنالیا ہو گا۔ ہم گھر پر۔۔۔۔" ایسا نہیں تھا وہ ارحم کے ساتھ ناشتہ نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر اسے گھر بھی جانا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔۔ ایک دن باہر ناشتہ کرنے سے کچھ نہیں ہو گا"۔

کچھ منٹ بعد ہی وہ میک ڈونلڈ کے ایک آؤٹ لیٹ کے پاس تھے۔ڈرائیو وے بند تھا جس کی وجہ سے ارحم گاڑی سے اترتا اندر آرڈر کرنے جا رہا تھا۔

''یہیں بیٹھو، میں لے کر آتا ہوں، کیا کھاؤ گی تم؟'' وہ اس سے پوچھنے کے بعد آؤٹ لیٹ کے اندر چلا گیا۔ایرج گاڑی کا شیشہ نیچے کیے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

پانچ دس منٹ ہو گئے تھے۔ارحم اب بھی واپس نہیں آیا تھا اور ایرج سیٹ سے اپنا سر ٹکائے بے دھیانی کے عالم میں کسی اور جہاں میں غائب تھی۔

ایک دم وہ اصل دنیا میں واپس آئی تھی جب اسے اپنے ہاتھ پہ کسی کی گرفت محسوس ہوئی۔

''چھوڑو۔۔۔۔۔چھوڑو ہاتھ چھوڑو'' وہ بوکھلاتی ہوئی اپنا ہاتھ اس خواجہ سرا سے چھڑوانے کی کوشش میں تھی جو نجانے کب وہاں آگیا تھا اور اب ایرج کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

"باجی سو روپے تو دے دو۔" وہ وحشی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پہ سمائے اسی سے کہہ رہا تھا۔اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ایرج کا ہاتھ سن ہونے لگا تھا۔

"ہاتھ ہٹاؤ"۔وہ نجانے کون سا لمحہ تھا جب وہ اس کے سامنے آیا تھا۔اس کا ہاتھ اب خواجہ سرا کے ہاتھ پہ تھا۔ایرج کو اپنے ہاتھ پہ سے اس کی گرفت ہلکی ہوتی محسوس ہوئی۔

"چھوڑو اس کا ہاتھ!" ایک جھٹکے سے ارحم نے اس خواجہ سرا کا ہاتھ ایرج کے ہاتھ سے الگ کر دیا تھا۔ایرج نے پہلی بار ارحم کو اس لہجے میں بات کرتے دیکھا تھا۔

سخت۔۔۔سرد۔۔۔۔۔بے تاثر۔

اس کے ہاتھ میں آرڈر کا پیکٹ دکھائی دیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟۔۔۔" اس نے ایرج سے پوچھا تھا۔اس کا سلور لاکٹ سیاہ ٹی شرٹ پر نمایاں دھوپ کی وجہ سے چمک رہا تھا۔اتنی تیز روشنی کے باعث۔۔۔۔۔

(حال)

ایرج کی آنکھیں چندھیاں گئی تھیں۔ حنا نے اس کے کمرے کی بتیاں جلادی تھیں۔

اس نے یک دم آنکھیں کھولیں۔ حقیقت نے ایرج کے ذہن پہ قبضہ کر لیا تھا۔

ماضی اور ماضی کی اچھی یادیں ذہن کے کسی کونے میں دب گئی تھیں۔

"کب آئی تم؟" حنا اس سے سوال کر رہی تھیں۔

"بس ابھی ابھی۔" وہ بے دھیانی میں اصل دنیا سے بے نیاز لگ رہی تھی۔ چہرے پہ آنسوؤں کے سوکھے نشان واضح تھے۔

"آج ارحم ہوتا تو شاید میرے لیے کوئی تحفظ بھی ہوتا، کوئی حفاظت کرنے والا ہوتا۔۔۔" اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ آنکھیں پھر بھر آئی تھیں۔

-----x-----

"آج چار دن ہو گئے ہیں۔" سڑک کے کنارے چلتے اس نے اس ایک ملاقات سے بیتے دن گنے تھے۔ چار دن چار صدیاں لگ رہی تھیں۔ اور شاید اب تو تمام صدیاں ہی ایسے کاٹنی تھیں، بغیر کسی ملاقات کے، بغیر سوالات کے۔

اس ملاقات کے بعد وہ آج پہلی بار واپس اس کے گھر کے پاس جا رہا تھا۔ آج دل نہیں تھا۔ نا ہمت تھی۔ پہلے تو ایک امید تھی جو اسے وہاں کھینچ لاتی تھی۔ اب تو کچھ بھی نہ تھا۔

اس نے میرون رنگ کی پوری آستین والی سویٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس کی لمبی آستین اس کے ہاتھ پہ بندھی سفید پٹی کو چھپانے میں ناکام تھی۔ پٹی پر سوکھے خون کے دھبے نمایاں تھے۔ چار دن پہلے اس نے خود کو خود ہی کے حملے سے بچایا تھا۔ اس کے ہاتھ پہ جہاں ہزاروں ایسے کٹ تھے وہاں ایک اور صحیح۔

self sadisticارمغان

بندہ تھا۔خود کو تکلیف دینے میں اسے لطف آتا تھا۔اس کی زندگی میں جہاں کوئی ایک غم زدہ واقعہ ہوتا،وہ خود کو تکلیف دیتا۔

اس کے خیال میں دنیا میں کوئی اچھا نہیں تھا۔اس کے لیے ہر انسان برا تھا، منفی تھا۔ انسان پیدا ہی منفی ہوتا ہے اس کو اچھا اس کے اعمال بناتے ہیں اور اس میں ہر شخص مات کھا جاتا ہے۔۔۔وہ اکثر سوچتا تھا۔

دنیا میں،اور اب تک کی گزاری گئی زندگی میں اسے جو پہلا شخص مثبت ملا ہے وہ ایرج تھی۔

اس کے لیے یہ دنیا ایرج کی تھی۔ایرج اس دنیا میں رہنے اور زندگی کو جینے کی اصل حقدار تھی۔وہ زندہ رہنے کے لیے بنائی گئی تھی۔اسے خوشی پانے اور خوشی بانٹنے کے لیے بنایا گیا تھا۔درد جھیلنے اور غم پانا تو ارمغان کے حصے میں لکھا تھا۔اسے قبول بھی تھا۔

وہ ہاتھ میں دبائے اس پیلے چاقو کو محسوس کرتا پارک کی طرف بڑھ رہا تھا جس کی زرد روشنی آج بھی آدھے پارک کو روشن اور آدھے کو اندھیرے میں چھوڑے چمک رہی تھی۔ وہ داخل ہوا تو چند ایک بچے فٹبال کھیلتے نظر آئے۔

وہ مسکرایا۔

وہ جس دن بھی وہاں آتا، اسے وہ بچے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ انہیں دیکھتا رہا۔ بچپن کے دن کتنے اچھے ہوتے تھے نا، بس ایک اسکول کی فکر تھی, نہ ذمہ داریاں تھیں، نہ گھرداریاں۔

وہ وہاں بیٹھے اپنے بچپن کو یاد کرتا اور پھر اپنے ذہن سے یادِ ماضی جھٹک نہ پاتا۔ فٹبال کی جگہ اس کے ہاتھ میں دکان صاف کرنے کے لیے کپڑا ہوتا تھا۔ جس عمر میں بچے فٹبال کو لات مارتے, اس عمر میں وہ اپنے باپ کی لات کھاتا تھا۔ جس عمر میں بچے اپنی ماں کے ساتھ لگ کر سوتے، اس عمر میں وہ تنہا ٹھنڈے فرش پر بنا تکیے کے سوتا

تھا۔ جس عمر میں بچوں کو ماں باپ لوریاں سنا کر سلاتے، اس عمر میں وہ گالیاں کھا کر سوتا تھا۔

کتنا مختلف ہوتا ہے ہر انسان، اس سے زیادہ مختلف اس کا ماضی۔

وہ گھنی سرسبز گھاس پہ قدم رکھتا اسی مخصوص سیٹ پہ آ بیٹھا تھا جو رات کے اس پہر اندھیرے میں ڈوبی ہوتی۔ وہاں بیٹھے وہ ایک بس ہیولہ سا دکھائی دیتا۔

سیٹ سے پشت ٹکائے اس نے اپنی کلائی میں بند اس پیلی چھری کو دیکھا۔ پھر گردن گھما کے پارک سے تھوڑے فاصلے پہ فاطمہ منزل کو، بہت سے خیالات اس کے ذہن میں ابھرے تھے مگر اس نے انہیں جھٹک دیا۔

آج ایک رات پھر، تنہائی کے نام۔

-----x------

آج کی رات، یادوں کے نام۔

کھلی فضا میں دو پل سانس لینا بھی انسان کو کتنا پر سکون کر دیتا ہے۔

سڑک کے کنارے چلتے جب ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے پہ آ کر لگا تو اس نے سوچا۔ ملاقات کے چار دن بعد آج وہ کہیں باہر نکلی تھی، کتنے عرصے بعد وہ رات کو یوں واک پہ آئی تھی۔ اسے کافی بہتر محسوس ہوا تھا۔ گھر میں اداسی کے سوا کچھ نہ تھا مگر یوں باہر دو قدم چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

وہ گھر کے پاس بنے چھوٹے سے پارک کی طرف رخ کیے چل رہی تھی۔ اس کا ذہن اب بھی ماضی کے ارحم اور حال کے ارمغان کے بیچ سفر کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر ان چار دنوں میں اس نے ایک انجان شخص کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ شاید وہ اسے اتنا انجان لگا ہی نہیں تھا، جتنا سب لگتے تھے۔

اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔اسے لگتا تھا وہ جتنا اس سے دور رہے گی، اتنا بہتر۔یہی سچ تھا۔مگر کچھ تھا مقناطیسی سا جو ایرج کو اس کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کرتا تھا۔شاید اس کی آواز، شاید اس کا انداز، یا شاید اس کا احساس۔

وہ سر جھٹکتے پارک میں داخل ہوئی اور زرد روشنی میں ڈوبی ایک سیٹ پر جا بیٹھی۔

پارک تقریباً خالی تھا، بس کچھ بچے گھاس پہ ادھر ادھر بھاگتے فٹبال کھیل رہے تھے۔اسے بے اختیار وہ یاد آیا۔نیلی جرسی، گول چشمہ اور ہلکی شیو۔

وہ پشت سیٹ سے ٹکائے، آنکھیں موندے اس کا خیال دماغ سے جھٹک رہی تھی۔ شاید دل سے بھی۔مگر مسئلہ بس یہ تھا کہ جب وہ دماغ سے جاتا تو ماضی کے صفحوں پہ تحریر دھندلی سی یاد ذہن پہ جگہ گھیر لیتی۔اور ایک اس کی تو یاد تھی جسے وہ کبھی ذہن سے جھٹک نہیں پاتی تھی۔نہ اس سے جڑی یادوں کو، نہ اسے۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو نظر میں تیز زرد روشنی جا ٹکی۔تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیائی تو اس نے پھر سے آنکھیں موندلیں۔۔۔۔

(ماضی)

اس نے آنکھیں کھولیں تو ارحم اس کے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں پاپ کارن کے دو چھوٹے چھوٹے پیکٹ تھے۔ایک ایرج کو تھماتے خود اپنے والے پیکٹ سے پاپ کارن کے دانے چن چن کے کھانے لگا۔

"مصالحہ تو ڈلواتے۔"اس نے پاپ کارن کا ایک دانہ منہ میں رکھا تو لبوں سے گلہ نکلا۔

"پاپ کارن میں مصالحہ کون ڈالتا ہے؟"وہ جیسے اس کی بات پہ حیران ہوا تھا۔وہ ہر دن کی طرح اس دن بھی اتنا ہی تندرست لگ رہا تھا۔سفید شرٹ پہ نیلی آستین کی چیک شرٹ پہنے البتہ اس وقت اس کا چشمہ غائب تھا۔سفید شرٹ پہ وہی سلور لاکٹ چمک رہا تھا۔

"میں تو کھاتی ہوں، اور مزے کے ہو جاتے ہیں۔" وہ کھاتے ہوئے ساتھ ساتھ کہتی جا رہی تھی۔ پارک کے بیچوں بیچ فوارہ پانی کو بارش کی صورت میں برسا رہا تھا مگر کراچی کی گرمی حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی ہوا میں گرمائش تھی۔

"اگر میں نہ ہوتا تو تمہارے موڈ سوئنگز کون سنبھالتا؟" وہ بھنویں اکھٹے کیے سوالیہ نظروں سے ایرج سے پوچھ رہا تھا۔

"اور تم کیوں نہ ہوتے؟" ایرج نے الٹا سوال کیا تھا۔

"اگر میں کہیں دور چلا جاؤں پھر؟" وہ مسکراہٹ دبائے کہہ رہا تھا۔

"کیا مطلب تم کہیں دور چلے جاؤ؟"۔ اس کی بات پر وہ بے اختیار ہنسا تھا۔

"اگر مجھے کہیں ضروری کام سے کافی عرصے کے لیے جانا ہو تو تم میرے ساتھ ساتھ چلو گی؟"۔

وہ اب بھی ہنستے ہنستے سوال کر گیا تھا۔اور اس کے سوال کے جواب تو بے تحاشہ تھے ایرج کے پاس، مگر وہ کبھی بول نہیں پاتی تھی۔

وہ بات، یہاں تک ہی ادھوری رہ جاتی تھی۔

زندگی کا وہ پہلو کبھی مکمل ہی نہیں ہوا تھا۔

(حال)

اس کی آنکھ ایک آہٹ سے کھلی تھی، جو ٹھیک اس کے مقابل ہوئی تھی۔

اس کی آنکھ کھلی تو تیز چمکتی زرد روشنی نے سب سفید کر دیا تھا۔دھیرے دھیرے آنکھوں نے اپنا فوکس برقرار کیا تو اسے اپنے سامنے ایک وجود دکھائی دیا۔سب سے پہلی نظر اس کے ہاتھوں پہ گئی، پھر ہاتھ پہ بندی پٹی پہ،اور پھر۔۔۔اس کے ہاتھ میں موجود پیلے چاکو پہ جو اس کا ہی تھا۔

اور پھر ایرج کی نظر آہستہ آہستہ اٹھتی گئی اور وہ وجود آہستہ آہستہ بیٹھتا گیا۔ دونوں کی نظروں کا تبادلہ ہوا۔ آنکھوں کے رخ ساتھ ساتھ اوپر سے نیچے سفر کر رہے تھے اور وہ کسی مسافر کی طرح ساتھ ساتھ۔

حتیٰ کہ وہ شخص اب اپنے گھٹنوں پہ گھنی گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ نہ اس کی نظر ایرج سے ہٹی، نہ ایرج کی نظر اس سے۔

"یہ آپ کی چھری، آپ اس دن چھوڑ گئی تھیں شاید۔" نظروں کا تبادلہ لمحے میں ٹوٹ گیا تھا۔ ایرج نے ایک بار پھر دیکھا۔ وہ ارمغان تھا۔ وہ ہل نہ پائی۔

"لے لیں، یہ آپ کی ہی ہے۔" وہ اٹھ کے جا بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کے بالکل مقابل گھاس پہ بیٹھا ہوا تھا اور وہ بینچ پر۔ بالآخر اس نے ارمغان کے ہاتھ سے چھری اٹھائی اور ہاتھوں میں سختی سے دبالی۔

"آپ کو لگا تھا کہ میں آپ کو ماروں گا؟" اس کے لہجے میں کوئی دھمکی، کوئی روکھا پن نہیں تھا مگر اس کے لہجے میں مٹھاس بھی نہ تھی۔ اس کا لہجہ بھی اسی کی طرح تھا۔ انجان۔

اس کے سوال پہ وہ چونکی نہیں تھی، مگر اس کے پاس جواب بھی نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارمغان کو پتا چلے کہ اس ملاقات کے دوران اس کے پاس چھری بھی تھی۔ مگر وہ تو حفاظت کے لیے تھی۔۔۔۔۔۔

"ہاں۔۔۔۔" اس نے بمشکل بولا تو اس کے حلق میں کانٹے پڑتے محسوس ہوئے۔ اسے پیاس نہیں لگی تھی۔ بس ماحول خشک ہو گیا تھا۔

"میں خودکشی کیوں کروں گا؟"۔

اس کا جواب وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی اور وہ جو گھاس پہ گھٹنے کے بل بیٹھا تھا، اب آلتی پالتی مار کے آرام دہ طریقے سے گھاس پر ہی بیٹھ گیا۔

''تم۔۔۔یہاں؟ کیسے؟ تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟'' ایرج پتا نہیں کیوں جب بھی اس کے بارے میں سوچتی تو منفی ہی کیوں سوچتی۔

اس کے سوال پر ارمغان کے گلے میں گلٹی ابھر کے معدوم ہوئی۔ہاں، وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ مگر کسی بھی غلط مقصد کے لیے نہیں۔ وہ اسے سچ بتانا چاہتا تھا، مگر چار دن میں جو اس کا حال ہوا تھا۔۔۔

وہ ایک ملاقات اس کے لیے کافی نہیں تھی. اس کی امید ٹوٹ جانا تو اس کے لیے زندگی کا ختم ہو جانا تھا۔وہ ایرج کو یہ کیسے سمجھاتا؟

''میں تمہارا پیچھا کیوں کروں گا ایرج؟'' اس نے سفید جھوٹ بولا تھا، مگر اسے اس وقت وہی بہتر لگا۔ یہ سوچ ہی اس کے لیے کافی تھی کہ ایرج کو اس سے کسی ڈر کا احساس ہوا تھا۔وہ حالات کو اور مشکل نہیں بنانا چاہتا تھا۔

''تو تم یہاں کیسے ہو؟۔۔۔اور تم مجھے تم کیوں بول رہے ہو؟'' اس کا سوال وہیں تھا مگر اب کی بار اس کے تم بولنے پہ بھی ایرج کو اعتراض تھا۔

"کیونکہ آپ مجھے آپ نہیں بول رہیں۔" اس کا جواب تو حق تھا۔ ایرج آگے سے کچھ نہیں کہہ پائی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا ارمغان۔" اس نے پہلی بار براہ راست ارمغان کا نام لیا تھا۔ ارمغان کو سانس لینے میں دشواری ہوئی۔ (ہوا میں خنکی زیادہ تھی ناں!)

"میں اتفاق بولوں گا تو تم مانو گی نہیں اور اس بات کے علاوہ کوئی سچ نہیں۔" اس کے ذہن میں کوئی بہانہ نہیں آیا تھا، اور اتنی جلدی حقیقت اس کے سامنے رکھنا اسے مناسب نہیں لگا۔

"او کے، یہ اتفاق یہاں ختم ہوا ہے، اور میں امید کرتی ہوں یہ اتفاق آئندہ کبھی نہیں ہو گا۔" اس کے لہجے میں کچھ نہ تھا۔ بس سرد سا لہجہ اور سرد سے الفاظ تھے جنہوں نے سامنے بیٹھے شخص کا دل جکڑ لیا تھا۔ مگر وہ کس کو بتاتا؟

"ایرج۔۔۔ ایک منٹ۔"

وہ اٹھ کر چند قدم ہی دور گئی تھی کہ اس کی آواز پہ قدم زنجیر ہوئے۔ وہ اس سے ڈری نہیں تھی۔ اسے اس اتفاق میں ہوئی دوسری ملاقات میں پہلی بار اس کی آواز نرم محسوس ہوئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کی طرف آرہا تھا۔

دو قدم کے فاصلے پر وہ رک گیا تھا۔ ایرج کو ہی دیکھ رہا تھا۔ مگر اس بار اس کی نظریں بے تاثر نہیں تھیں۔ اس بار ان میں کچھ تھا جو ایرج جانچ نہیں پائی تھی، یا شاید وہ جاننا نہیں چاہتی تھی۔

اس سے پہلے وہ کچھ کہتا، ایرج کی نظر اس کے ہاتھ پہ بندھی پٹی پہ پڑی جس پر جگہ جگہ سرخ دھبے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے انگلی کے اشارے سے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا تو اس کی نظر بھی اپنے ہاتھ کی طرف گئی۔

"یہ۔۔۔ کچھ نہیں کٹ لگ گیا تھا۔" اس سے زیادہ وہ اسے اور کیا وضاحت دیتا؟

"کٹ لگ گیا تھا یا لگایا گیا تھا؟" اس کی بات پر وہ حیران ضرور ہوا تھا مگر زیادہ حیرانی تب ہوئی تھی جب اس کے سامنے کھڑی ایرج نے اسے پیلے چاکو کا بلیڈ اس کے سامنے کیا۔اس پہ خون کے تین ننھے ننھے سوکھے قطرے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں بہت غور سے دیکھا جاتا تو وہ واضح ہوتے۔

"تم نے خودکشی کی کوشش کی ہے؟" اس کے لاجواب چہرے کو دیکھتے ایرج نے اسے ایک بار پھر مخاطب کیا۔اب اس کی نظریں چاقو سے ہٹ کر ایرج پہ جا ٹھہری تھیں۔

"محبت کی امید پوری ہونے کے لیے قربانی مانگتی ہے،اور یہ تو بس پہلی سیڑھی ہے۔"

"کونسی مح۔۔۔؟" اس کی بات پر وہ اب لاجواب تھی اور اس کی اگلی بات نے تو اس کو شاک میں ڈال دیا تھا۔

"پرسوں شام سات بجے، اگر تم آئی تو مجھے لگے گا کہ قربانی رائیگاں نہیں گئی۔" اور وہ کہہ کر رکا نہیں، تیز قدموں سے پارک سے باہر نکلنے لگا۔

اور وہ جو پیچھے کھڑی تھی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جاتا دیکھتی رہی۔

"کیا وہ اظہار۔۔۔" وہ زیر لب بڑبڑاتی اب بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے خلاء کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چلا گیا تھا۔ اس کے وجود کی مہک فضا میں اور اس کے الفاظ کا سنگم اس کے دماغ میں رہ گئے تھے۔

وہ آج پارک آئی ہی کیوں تھی؟

------x-------

"وہ آج پارک گیا ہی کیوں تھا؟"

فلیٹ کا دروازہ پٹک کے وہ اپنے کمرے میں گیا تھا۔ گھپ اندھیرے کے باوجود اس نے کمرہ روشن نہیں کیا۔ ویسے ہی جا کر بستر پہ لیٹ گیا۔

انسان کو غلطیوں کے بعد ہی پچھتاوا کیوں ہوتا ہے؟

اسے اس لمحے کے بعد سے ہی پچھتاوا شروع ہو گیا تھا جب اس سے اس نے۔۔۔۔۔

''تم اب تک مر کیوں نہیں گئے ہو ارمغان؟ آج شاید۔۔'' ارمغان کا خود کو کوسنے کا سیشن نمبر پانچ ہزار پانچ سو بیس شروع ہو چکا تھا۔

''ایموشنز کنٹرول نہیں ہوتے تم سے۔ تم کیا ہو۔۔۔۔'' وہ خود کو ایسے ڈانٹ رہا تھا جیسے کسی اور کو گالیاں دے رہا ہو۔

''جو تم نے آج کیا ہے اس کے بعد سے تو ایرج کیا، دنیا کی ہر لڑکی تم سے سو میل دور رہے گی۔'' وہ آنے والے حالات کا خود سے حساب لگانے لگا تھا۔

''اچھا ہے، تم یہی تو ڈیزرو کرتے ہو بلکہ تم اس سے بھی بدتر ڈیزرو کرتے ہو۔ ایرج تم کو ایک تھپڑ بھی رسید کر دیتی تو بھی وہ کافی نہ ہوتا۔'' وہ اب منہ پہ ہاتھ رکھے آدھے گھنٹے پہلے ہوئے مناظر کو یاد کر رہا تھا۔

ارمغان اور اظہارِ محبت؟ یہ کم از کم ارمغان کے تاحیات ہونے تک تو ناممکن لگتا تھا۔۔۔ مگر زندگی بھی تو عجیب اور اجنبی ہوتی ہے آج ارمغان مطاہر علی ہے اپنے جذبات کے سامنے ہار گیا تھا۔

"وہ کبھی نہیں آئے گی۔ اب تو وہ کبھی نہیں آئے گی، کیونکہ اگر اب وہ آئی تو میں اس کا سامنا نہیں کر پاؤں گا۔" وہ خود کو ایک آخری بار کوستا بستر سے اٹھا اور اپنے بلے کو تلاش کرنے لگا تھا۔

"ایک تو یہ آوارہ بلا منحوس مارا کہاں رہتا ہے۔" جب خود کو کوسنا ختم ہو گیا تھا تو ایک بے زبان جانور کی باری آگئی تھی۔

زندگی میں پہلی بار اس نے اتنا کنفیوزڈ محسوس کیا تھا۔ اسے محبت تھی، مگر وہ کبھی اسے اون نہیں کر پایا تھا۔ وہ کبھی محبت کے اظہار کو اون نہیں کر پایا تھا۔ اور آج جو اس نے کہا تھا اس کے بعد تو اسے اپنی زندگی سے اور نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ کبھی نہیں آئے گی۔" اس نے ایک بار پھر بڑبڑایا۔

-----x------

''میں کبھی نہیں جاؤں گی۔''

اس کی باقی باتوں سے جب ذہن ہٹا تو ایک دوسری بات اس کے گلے پڑ گئی۔ اس نے ایرج کو دعوت خاص دی تھی۔ پرسوں شام سات بجے۔ جس میں وہ کبھی نہیں جانے والی تھی۔

بہت ہو گیا ملاقاتوں اور سوالات کا یہ سلسلہ، اب اتفاق میں تو کیا، میں خواب میں بھی اس شخص کو دیکھنے نہیں چاہوں گی۔'' اس کا دماغ بالکل کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔ اسے اب نیند کی ضرورت تھی۔

گھر پہنچتے ہی وہ بستر پہ لیٹ گئی تھی۔ سوتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں وہی شخص دائرہ کاٹ رہا تھا۔ گول چشمہ، گندمی رنگت، ہلکی شیو، زخمی ہاتھ۔

وہ فجر کا وقت تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر سر بھاری ہو رہا تھا۔سر اور جسم میں تھکن اب معمول سا بن گیا تھا۔

اس نے خود پر جان لگاتے واش روم تک کا سفر کیا۔وہ اب تک اس کو بھول نہیں پائی تھی اور اس خواب کے بعد تو بالکل بھی نہیں جو آج اس نے دیکھا تھا۔

چار رکعت نماز پڑھ کر وہ کچن میں اپنا ناشتہ بنانے چلی گئی تھی۔آج یونیورسٹی جانا تھا مگر نہ ہمت تھی نہ دل۔مگر پہلے ہی وہ اتنی کلاسز مس کر چکی تھی کہ اب کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔

کمرے میں ناشتہ لائے وہ اس خواب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔۔اس نے خواب میں ارمغان اور خود کو دیکھا تھا۔

مگر۔۔۔۔

دونوں نے ایک دوسرے پر پستول تانی ہوئی تھی۔ارمغان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ایرج کی آنکھوں میں بے یقینی۔۔تیز بارش تڑاتڑ برس رہی تھی۔وقفے

وقفے سے سرمئی بادلوں میں بجلی چمکتی منظر کو اور وحشت ناک بنا رہی تھی۔ وہ کوئی سنسان سڑک تھی۔ بس بجلی کی روشنی تھی جو سڑک کو پل بھر کے لیے روشن کرتی، اور پل بھر بعد اندھیرا۔

"دل ٹوٹ جانا بہت دکھ دیتا ہے ایرج۔" اس کے سامنے کھڑے شخص نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ پستول ویسے ہی تنی تھی۔

"اور تم جانتی ہو کہ یہ بات میں نے اپنے لیے نہیں کہی" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا.

"انتظار انسان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔" نظروں کا تبادلہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ جیسے آنکھیں جھپکی ہی نہ ہوں۔

"میری امید ٹوٹتی جا رہی ہے، اور تمہاری ٹوٹ گئی ہے۔"

اس کے الفاظ جہاں ختم ہوئے، لمحے بعد بادل اتنی زور سے گرجے کہ اس کا چہرہ روشن ہوا۔اس کے چہرے پہ خون لگا ہوا تھا۔کپڑے جگہ جگہ سے پھٹتے ہوئے تھے۔ماتھے پہ سفید پٹی بندھی تھی۔۔۔

ایرج نے سر جھٹکا تو حقیقت کی دنیا نے اس کا استقبال کیا تھا۔

وہ خواب کو جوڑ توڑ کرتی اس کا کوئی مطلب بنا رہی تھی۔

جہاں اس کو خواب کا منظر الجھا رہا تھا وہاں ارمغان کے کہے الفاظ کوئی معنی ہی نہیں بنا رہے تھے۔اس پہ ارمغان نے ایسے پستول کیوں تانی ہوئی تھی؟اس کے چہرے پہ خون کی نشان کیوں تھے؟وہ خون کس کا تھا؟

اور پھر ارمغان کی الفاظ۔۔۔کون سی امید؟کس کا انتظار؟ایرج کی سوچ جہاں جا رہی تھی،وہ قابل یقین تھی نہیں۔

وہ ارحم کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔اور اگر ارحم کو جانتا بھی تھا تو ایرج کے احساسات کو کبھی نہیں جان سکتا تھا۔جو اظہار ایرج ارحم کے سامنے ٹھیک ڈھنگ سے نہیں کر پائی تھی،وہ ایک انجان شخص کیسے جان سکتا تھا؟

اس نے اس کی بات کا کوئی اور مطلب نکالنے کی کوشش کی۔

وہ یہ تو بھول گئی تھی کہ جو اس نے دیکھا تھا وہ خواب تھا۔اور خواب دل و دماغ کی باتوں کو مناظر کی صورت میں دکھاتا ہے۔

------x------

وہ یونیورسٹی سے گھر آئی تو تقریباً مر چکی تھی۔ کھانا کھائے بغیر وہ بستر جا لیٹی تھی۔ پورے دن اس نے خود کو مصروف رکھا تھا کہ وہ خواب اس کے ذہن سے نکل جائے۔وہ ناکام ہوئی تھی۔وہ ارحم کو نہیں جانتا تھا۔پھر وہ کیسے دعوے سے کہہ رہا تھا کہ اس کی امید ٹوٹ چکی ہے؟

اسے معلوم تھا کہ اس کی امید ٹوٹ چکی ہے، مگر وہ زندگی میں ارحم کی جگہ کسی کو نہیں دے پائے گی، اسے یہ بھی معلوم تھا۔اس نے نہ جانے کتنی ہی بار ارمغان کو ارحم کی جگہ رکھ کر سوچا تھا، مگر وہ نہیں کر پاتی۔جو لمحے اور جو احساس ارحم کے ساتھ محسوس ہوئے تھت۔وہ کسی اور کے ساتھ کبھی نہیں ہوئے تھے، نہ ہو سکتے تھے۔

آنکھیں بند ہونے تک وہ اپنے ذہن میں خود کو اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔اسے یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ اس کا فیصلہ ارمغان کی بھی وہی حالت کر سکتا تھا جس میں وہ معلوم نہیں کتنے سالوں سے اٹکی ہوئی ہے۔مگر وہ فیصلہ اسکے لیے بھی اور ارمغان کے لیے بھی بہتر تھا۔

اسے کیا معلوم تھا اسکا ایک انکار اسکی زندگی کے ساتھ کیا کرنے جا رہا ہے۔

-----x------

دو دن بعد گھر سے باہر نکلنا بھی اس کے اندر کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ لایا تھا۔ اس کا دل ایک ماچس کی تیلی کی طرح سلگ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ درد کی ہر لہر کو محسوس کرواتا۔

آج اس کا آخری پریکٹس میچ تھا اور آج رات ہی اسے لاہور روانہ ہونا تھا۔ کل سے ٹورنامنٹ کے میچ شروع ہونے کو تھے اور آج بہت ہلکا پھلکا سا وارم اپ تھا۔

کلب میں داخل ہوتے ہی اس نے پوسٹر بینر پر اپنے کلب کا نیا لوگو دیکھا۔ وہ تھوڑا حیران ہوا تھا کیونکہ اسے لگا تھا کہ شاید اس نے وہ لوگو کہیں دیکھ رکھا ہے۔ پھر بھی اسے نظر انداز کرتے ہو کلب کے اندر داخل ہو گیا تھا۔

پورے وارم اپ کے دوران اس نے ایک ہی بات کو سوچا تھا. سات بجنے میں دس منٹ ہی باقی تھے۔ اس کے ٹیم میٹس نے پہلی بار ارمغان کو اتنا غیر دماغ پایا تھا، وہ بھی فٹبال کے معاملے میں۔

وقتاً فوقتاً وہ چہرہ اٹھا کے سیڑھیوں کی جانب دیکھتا۔ ہر بار دل کے اندر امید کی ننھی سی کرن جگمگاتی اور پھر لمحے بعد بجھ جاتی۔

"وہ آئے گی" کی آواز "وہ نہیں آئے گی" کے شور میں ڈوب جاتی۔ جیسے کوئی لمحہ بہ لمحہ امید کی ڈور کو چھری سے کاٹ رہا ہو، اور رسی کی ڈور اس کے دل سے جڑی ہو۔ آہستہ آہستہ جیسے اس کے دل سے خون رس رہا ہو۔

سات بیس ہو گئے تھے۔ اچھے خاصے کھلاڑی اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے تھے۔ رات کو انھیں ساتھ لاہور کے لئے نکلنا تھا۔ اسے بھی۔

مغرب کے رنگوں کو جیسے اس نے وہاں سیڑھیوں پہ بیٹھے حفظ کر لیا تھا، وہ اسی جگہ بیٹھا تھا جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے وہ یاد نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے ذہن سے نکلی کب تھی جو یاد آتی؟ وہ تو اس کے ساتھ نہ ہو کر بھی ساتھ تھی۔ بس اس کی آواز کو وہ یاد کر رہا تھا۔

اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔

دل بھی اتنی سے زور سے ٹوٹتا ہے جتنے شور سے کوئی شیشے کا پیس۔ تم نے دل کو ٹوٹتے سنا ہے؟

اور پھر یک طرفہ محبت مکمل ہوتی ہی کب ہیں۔

"کتنی کوشش کی تھی میں نے۔۔۔ خود کو کتنا بدلا تھا۔۔۔ میں تو بس۔۔۔ میں تو بس ہیرو بننا چاہتا تھا۔۔۔ میں تو اس کی کہانی کا کردار بننا چاہتا تھا۔"

"سب کو بس پرنس چارمنگ پسند ہوتے ہیں۔۔ میں نے خود کو حیوان سے پرنس چارمنگ میں بدل لیا تھا، یا شاید یہ صرف میرا وہم تھا؟ شاید میں اب بھی اتنا ہی گھٹیا غلیظ اور بے دل حیوان تھا جس پر کوئی تھوکنا بھی گوارہ نہیں کرتا۔"

"اور میں کتنا بے وقوف ہوں۔۔۔۔ مجھے لگا تھا میری زندگی جینے کے قابل بنتی جا رہی ہے، مجھے لگا تھا میری زندگی میں رنگ واپس آنے لگے ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ میری ہیملٹ والی داستان ایک فیری ٹیل کی طرح اختتام پذیر ہو جائے گی، مگر

نہیں۔۔۔میں اسی زندگی کو جیتا رہا،اسی زندگی کو جیتا رہوں گا اور میری زندگی کا اختتام بھی ہیملٹ کی کہانی کی طرح ہی ہوگا۔"

"سات ماہ۔۔۔۔سات ماہ دل، دماغ، کردار، احساس اور خواہشات بدلنے کے بعد بھی۔۔۔۔۔وہ میری کہانی کی ہیروئن رہی، اور میں اس کی کہانی کا ولن۔"

ایک داستان آج ختم ہو گئی تھی۔وہ داستان جو ہمیشہ، ہر جہاں میں ہی ادھوری رہ جانے کے لیے لکھی گئی تھی۔

اس نے اپنے چہرے کو کسی دعا کی طرح پوچھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اسے بہت سے کام کرنے باقی تھے۔

----x------

وہ نہیں گئی تھی۔

پہلی بار اس نے خود سے کیا وعدہ نبھایا تھا۔ وہ ارمغان سے ملنے نہیں گئی اور وہ پچھتا بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے جو کیا تھا اپنی حفاظت اور بھلائی کے لیے کیا تھا۔ مگر دل کے کسی کونے میں سے ایک آواز بار بار اس کا دل بھاری کر رہی تھی۔

کیا پتا اس نے کسی دوسرے مقصد کے لیے بلایا ہو؟ کیا پتا اس کی بات کا مطلب وہ نہ ہو جو وہ سمجھی تھی؟ کیا پتا اس نے ایرج کا انتظار کیا ہو۔۔۔ مگر وہ خواب۔۔۔ اس کی باتیں کسی بھی دوسرے رخ نہیں جا رہی تھیں۔۔

کیا اس نے واقعی غلط کیا تھا؟

"نہیں۔" اس نے دل سے آتی آواز کو دبا دیا تھا۔ اسے ارمغان والا باب اپنی زندگی سے نکال باہر کرنا تھا۔ اس کی زندگی میں کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ارمغان سے انکمفرٹیبل نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہ تھا کہ وہ اس پہ بھروسہ کرتی تھی۔ وہ انجان تھا، اور انجان اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

افسوس اس بات کا تھا کہ جب ہر بار ایرج کسی کے بارے میں سوچتی تو اچھا سوچتی۔۔۔۔ مگر ارمغان کے بارے میں وہ کبھی اچھا سوچ نہیں پائی تھی۔

وہ ہوتی ہے نا ایک گٹ فیلنگ جو پہلے سے ہی دماغ میں ایک انتباہ بھیج دیتی ہے۔اب انسان اسے اگنور کرے یا اس پہ غور کرے۔

ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور وہ کھانا کھانے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ جس انسان کو وہ اپنے دماغ سے نکالنے کی کوشش کر رہی ہے وہ بس کچھ دنوں میں۔۔۔۔ بس کچھ دنوں میں اس کی سوچ ہی پلٹ کر رکھ دے گا۔

(کیونکہ ہماری چالاک ایرج کو باتیں ہی اتنی جلدی سمجھ آتی ہیں۔)

-----x------

وہ گھر آیا تو پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔اس نے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کر لاؤنج روشن کیا۔اس وقت گبی اس کے پاؤں میں آ کر لپٹا تھا۔

ارمغان نے پاؤں جھلایا تو وہ فاصلے پہ جا گرا۔پھر واپس قریب نہ آیا بلکہ دوسری طرف بھاگ گیا۔

وہ جوتوں کو اچھالتے کمرے کی طرف آیا تھا۔دراز سے دوائیوں کا ڈبہ کپکپاتے ہاتھوں سے نکالا اور دوا منہ میں رکھی۔پھر وہ کمرے میں رکا نہیں بلکہ فریج سے پانی نکال کر غٹا غٹ پی گیا۔

اسے گیارہ بجے تمام کھلاڑیوں کے ساتھ لاہور کے لیے نکلنا تھا۔کمرے میں واپس آیا تو اس نے بلب کو بند کیا اور بستر پہ لیٹ گیا۔اس کی آنکھیں نیند اور آنسوؤں کی وجہ سے سرخ ہونا شروع ہو گئی تھیں۔وہ میچ سے پہلے خود کو کمپوز کرنا چاہتا تھا۔

ایرج کا باب اس کی زندگی میں بند ہو گیا تھا اور اب اسے وہ واپس نہ کھولنے کی کوشش کرنی تھی۔

کتنے عرصے بعد اس کا دل پھر ٹوٹا تھا۔۔۔ مگر آج تکلیف بہت زیادہ ہوئی تھی۔ اس دن سے بھی زیادہ جس دن اس کو ایک الزام کے تحت گھر سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ اس دن سے بھی زیادہ جس دن اسے اس کی ماں کی آخری بار شکل بھی نہیں دکھائی گئی تھی۔ اس دن سے بھی زیادہ جب اس کے جسم کے ساتھ غلاظت کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔

دل پہلے بھی ٹوٹا تھا آج بھی ٹوٹا تھا، مگر آج تکلیف زیادہ ہوئی تھی۔ شاید کیونکہ امید بھی ساتھ ٹوٹی تھی۔ وہ اب کسی سے دل نہیں لگا پائے گا، نہ امید۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ اسے چند گھنٹے آرام کرنا تھا۔

------x------

اس کی آنکھ بلی کی آواز سے ٹوٹی تھی۔ وہ اس کے اوپر لیٹا میاؤں میاؤں کرتا کھانا مانگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنی چاہیں مگر پتلیوں میں بے حد درد تھا۔ دماغ اتنا دکھ رہا تھا کہ جیسے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔

اس نے وقت سے موبائل اٹھاتے وقت دیکھا، اس کے پاس ڈیڑھ گھنٹہ تھا اور اس کے بعد وہ دس دن کے لیے لاہور جا رہا تھا۔ سب کچھ کراچی چھوڑ کے۔

اس نے بے اختیار آنکھیں ملیں اور واش روم میں داخل ہوا۔ شیشے میں اپنا عکس دیکھتے جیسے وہ کچھ یاد کرنا چاہ رہا تھا۔

اور پھر۔۔۔

"شام کیا ہوا تھا؟"۔

اس کی یاد کسی ریت کی طرح ذہن سے پھسل رہی تھی۔ اس کے سر میں درد کیوں تھا؟

واش روم سے باہر آ کر اس نے دراز کھول کر دواؤں کا ڈبہ کھولا۔ وہ چونکا۔

اس نے دوا کب کھائی تھی؟

جیب پر ہاتھ مارتے اسے اندر کچھ محسوس ہوا۔

اسے کام کرنا تھا۔۔۔۔

اسے بس اتنا یاد آیا تھا کہ اسے لاہور جانے سے پہلے ایک کام کرنا تھا۔

اسکے ذہن کو کیا ہوا تھا؟ وہ سب بھولتا کیوں جا رہا تھا؟

جیب سے پاکٹ واچ نکالتے اس نے بغور اسے دیکھا۔

دوروس کو ایک ضروری کام کرنا تھا۔

گھڑی کو واپس جیب میں ڈالتے اس نے اپنے گھر کی چابیاں اٹھائیں اور فون پہ ایک کوڈ ملاتے کسی کو کال کرنے لگا۔

کال پہلی رنگ پہ اٹھالی گئی۔

"جی باس؟" دوسری طرف سے بھاری آواز سنائی دی۔

"مارک 39 کے باڈی دو دن میں آجانی چاہیے۔مارک 40 کی تیاری کرو۔ تمہیں لوکیشن مل جائے گی۔ مگر۔۔۔۔جب میں کہوں گا تب،اس سے پہلے قدم نہ اٹھانا، بس مارک 40 پہ نظر رکھنا."

اس کی آواز بدل گئی تھی۔اس آواز کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔اس نے اپنی بات کہہ کر کال کاٹ دی۔

آنکھوں میں درد کی ایک اور ٹھیس اٹھی تو اس نے بے اختیار آنکھیں کو مسلا۔

دوروس کو لاہور جانے سے پہلے ایک کام کرنا تھا۔۔۔۔

بہت ضروری کام۔۔

-----x-----

وہ صحن میں بیٹھی،پاؤں جھلاتے فون پہ کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔بال کھلے گردن سے تھوڑے نیچے ولف کٹ میں کٹے تھے۔اور ٹراؤزر پہ کریم کلر کی کرتی,دوپٹہ گردن میں رسی کی مانند۔وہ کافی معمولی حلیے میں تھی۔

چہرے پہ ٹکے چشمے کو ٹھیک کرتے اس نے پیغام ایک بار پھر مٹا دیا۔ لفظوں کو جوڑ توڑ کرتے اسے سمجھ نہیں آیا وہ کہاں سے بات شروع کرے، کیا لکھے؟

کیا کہے؟

اس نے سر گھما کے آسمان دیکھا۔ سیاہ آسمان پہ واحد چاند چمک رہا تھا۔ تارے جیسے گم تھے۔ ارحم کے تارے۔۔۔۔۔

آج اتنے عرصے بعد اس نے آسمان کو تاروں کے بغیر دیکھا تھا۔ ذہن صاف ہو گیا تھا۔

آسمان تاروں سے خالی تھا۔

ایرج کا دل بھی ارحم سے خالی تھا۔

اس نے آنکھیں واپس فون کی طرف متوجہ کر لی۔

وہ بات کہاں سے شروع کرے؟

(دس دن پہلے)

ارمغان سے نا ملے ایک دن ہونے والا تھا۔وہ رات سوئی نہیں تھی۔وہ بس یہی سوچ رہی تھی کہ کیا بات کرنی تھی اسے؟اور وہ پارک والی بات۔۔۔۔۔

اس کی موجودگی نے بھی اسے ڈسٹرب کیا تھا،اور اس کی غیر موجودگی نے بھی۔

فجر تک اس کی آنکھیں یوں ہی لیٹے لیٹے چھت گھومتے پنکھے کو تکتی رہی تھیں۔

جہاں اس کے ذہن سے ارمغان نہیں نکلا تھا۔وہاں اس کے ذہن میں پہلے ہی ارحم کا بسیرا تھا۔اس کے ساتھ گزرے لمحات وقفے وقفے سے ذہن میں یاد آرہے تھے۔

اس کی یاد افسردہ کر دیتی تھی اسے۔جیسے پھول دکھا کے اس کو کانٹے پکڑا دیے ہوں کسی نے۔

(ماضی)

ماضی کے رنگوں کو جدا کریں تو سرمئی رنگ کی سوکھی سوکھی سی داستان میں سے ایک دن وہ جمعے کا تھا جب ارحم کی جرمنی میں جاب لگ گئی تھی۔اور جتنی بری طرح ایرج کا دل کسی نے مٹھی میں بند کیا تھا،وہ صرف ایرج ہی جانتی تھی۔

فاطمہ منزل کے صحن میں سب جمع ارحم کے ہاتھ سے مٹھائی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ سب خوشی خوشی ارحم سے باتیں کر رہے تھے۔مریم تو ابھی سے ہی اسے ہدایت دینا شروع ہو گئی تھیں اور وہ مسکرا مسکرا کر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔گھر کا ہر فرد اس سرمئی آسمان تلے صحن میں جمع تھا۔سوائے ایرج کے۔

وہ کمرے میں سب سے الگ تھلگ بستر پر بیٹھی تھی۔جیسے خود کے ہی دل پہ مرہم لگا رہی ہو۔وہ کسی کے لیے کیوں رو رہی تھی؟اس کے لیے جس کو کبھی اس کا ہونا ہی نہ تھا؟اگر وہ اس کی قسمت کی سنہری لکیر نہ تھا تو اسے کس چیز کا غم تھا؟وہ کیوں رو رہی تھی؟ایک دن اسے ایسے ہی جانا تھا۔ملک سے بھی اور دل سے بھی۔

مگر وہ اسے دل سے نکال نہیں پائی تھی۔اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ زندگی کا یہ مرحلہ اتنا مشکل ہوگا۔

وہ ہر لمحے اس وقت کے لیے تیار تھی مگر اب کہ جب وہ وقت آیا تھا تو پتا نہیں کیا ہوا تھا۔اس کے آواز نہیں نکلی تھی۔ مگر آنسو گواہ تھے،اس کے دل میں ایک امید سی جاگی تھی۔

"کیا پتا وہ میرے کہنے پہ جرمنی نہ جائے یا پھر مجھ سے۔۔۔۔" یہ امید بہت نازک تھی۔ جیسے اسے امید سے ہی امید نہ ہو۔ مگر دل تو دل تھا۔ہر مرحلہ،ہر مشکل پار کرنے کے لیے تیار تھا۔

رات گیارہ بجے وہ اپنی کچی نیند سے جاگی تھی۔ کمرہ روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور دروازے پر ایک آہٹ نے اسے جگا دیا تھا۔اس نے چشمہ چہرے پر ٹکائے۔دروازے کے پاس دیکھا۔وہی سلور لاکٹ،ایرج جانتی تھی کہ

وہ کس کا لاکٹ ہے، وہی تو جانتی تھی۔ چپل پیروں میں پھسائے اس نے لاکٹ اٹھایا۔

وہی ابھری ہوئی عبارت۔ وہ مسکرائی تھی، مگر اس مسکراہٹ میں کوئی خوشی ہی نہیں تھی۔ اسے آج ہمت کرنی تھی۔ اپنی محبت کے لیے ایک قدم اٹھانا تھا۔

"وہ مجھے کبھی انکار نہیں کرے گا"۔ اسے امید سے زیادہ اعتماد تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے گیلری تک پہنچ گئی تھی۔

بالکنی پہ پہنچتے ہی اس کے قدم رک گئے تھے۔ سرمئی ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے، چشمہ سامنے ٹیبل پر رکھا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ہر بار کی طرح اس کی مسکراہٹ میں وہی کشش تھی جو اس کی شخصیت میں تھی۔

وہ ٹیبل قریب آنے لگی۔۔۔۔

(حال)

اس نے یادوں کا سلسلہ وہیں توڑ دیا۔

وہ پھر سے اپنا دل کیسے دکھاتی؟ وہ اس رات کو پھر سے کبھی دہرا نہیں پائے گی۔ اس کا دل رک جاتا تھا۔ وہ جمعے کی رات اس کی زندگی کے خوبصورت آئینے کو چکنا چور کر کے ایک حقیقت کا آئینہ اس کے سامنے لاتی تھی۔ جس میں وہ اپنا ٹوٹا عکس خود بھی کبھی دیکھ نہ پائی تھی۔ نہ دیکھ پائے گی۔

فجر تک وہ یوں ہی جاگی رہی تھی۔ فجر کی آذان پہ بھی وہ اٹھی نہیں۔ یہاں تک کہ فجر قضاء ہو گئی۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی۔ یقیناً حنا ہوں گیں، وہ صبح اٹھ کے سب کے لیے ناشتہ بناتی تھیں۔

مگر ایرج کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے اٹھ کے دیکھا بھی نہیں۔ اس کے اندر ہمت ہی نہیں بچی تھی کوئی کام کرنے کی۔ تکان اور درد کا ایسا امتزاج تھا۔ ایرج کی آنکھیں بند دروازے تک جا ٹھہریں تھیں۔

وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ اس کے کمرے کے باہر کون کھڑا تھا۔

-----x------

ارادے کے خلاف وہ اسے بھول نہیں سکا تھا۔

اسے لاہور آئے آج دو دن ہو گئے تھے۔اور وہ ایرج نامی باب اپنی زندگی سے بند نہیں کر پایا تھا۔وہ اسکو سچ بتانا چاہتا تھا۔وہ اسے سب بتانا چاہتا تھا۔ مگر پتا نہیں لاہور آ کے ہر یاد میں دھندلا پانی سا پڑ گیا تھا۔

وہ ٹورنامنٹ جس کا اس کو اتنی شدت سے انتظار تھا،اب جب وہ دن آیا تھا تو تمام جذبے جیسے راکھ ہو گئے تھے۔

پہلا میچ ہو چکا تھا جس کو وہ باآسانی جیت گئے تھے۔

وہ اس وقت گلبرگ کے ایک ہوٹل میں جوتے اتار رہا تھا۔اس نے ایرج کا انسٹا گرام کھولا۔وہاں

لکھا آرہا تھا۔تمام پوسٹ غائب ہو گئی تھیں۔"instagram user"

اس نے ارمغان کو بلاک کر دیا تھا۔

اس نے گہری سانس بھری۔ وہ اب کوئی قدم نہیں اٹھا پائے گی۔ اپنا دل کوئی ایک جگہ سے دو بار کیسے تڑوا سکتا تھا؟

"کاش میں شیطان ہوتا، غلط کام کرتا مگر لوگوں کو تو نہ دکھتا۔ نہ ان کو دکھتا، نہ ان سے دل لگاتا۔ نہ لوگوں کو پتہ لگتا، نہ میں نظروں میں آتا۔"

اس نے بے آواز کہا تھا۔ جیسے خود پر بھی اب ترس آنے لگا تھا۔

---x------

وہ یونیورسٹی کے آئینے کے سامنے کھڑے اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ گہرا سانولا چہرہ، آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے جو concealer سے چھپانے کے باوجود بھی چھپ نہ پائے تھے۔

یہ اسی ایرج کا عکس تھا جو خود سے ڈرتی تھی۔جو کچھ کہتی نہ تھی کیونکہ اسے لگتا تھا اس کی ہر بات غلط اور فضول ہے۔یہ وہی ایرج تھی جو کہنے سے پہلے اپنی ہر بات کو ہزار بار سوچتی اور پھر بھی کہہ نہ پاتی تھی۔

"ایرج تمہارا اتنالو کانفیڈنس ہے۔" آج صبح ہی اس کی دوست نے کسی بات پر اسے کہا تھا۔

یہ وہی ایرج تھی جو اداس ہوتی تو خود کو خود مناتی تھی۔ایرج خود کی نظروں میں ہی فضول تھی تو کسی اور کی نظروں کو کیا بھاتی۔

اس میں کیا تھا پسند کرنے والا؟

وہ ہار مان جاتی تھی، کیونکہ وہ کبھی جیت کے قریب بھی پہنچ نہیں پائی تھی۔اسے شرمندگی ہوتی تھی خود سے۔وہ اپنی باتوں میں ہی کھو جاتی تھی۔دوسرے لوگوں کی باتوں کو ذہن میں سوار کرلیتی۔اسکا اصل چہرہ کیا تھا؟اس کی خواہشات کیا تھیں؟

اس کی خواہشات وہ تھیں جو لوگ اسے بتاتے تھے۔

اس کا اصل وہ تھا جو لوگ اسے دکھاتے تھے۔

ایرج خود میں تو کچھ نہ تھی۔لوگ صحیح تھے،لوگ اس کو برے مشورے کیوں دیں گے ؟اس نے کبھی احتجاج ہی نہیں کیا تھا۔۔۔کیونکہ اس کی نظروں میں تو اس کی باتیں بھی بے معنی تھیں۔

وہ خود کے لیے کیا قدم اٹھاتی جب وہ اپنی زندگی میں خود ہی ایک سائڈ کریکٹر تھی۔

اس کو غائب دماغی سے نکالنے والی آواز بیگ میں بجتے رنگ ٹون کی آواز تھی۔اس نے ایک ہاتھ سے آنکھوں سے ٹپکتے آنسو پوچھے جو نجانے کب آئے تھے۔

فون نکال کر اس نے نمبر دیکھا۔

آج پہلی بار اس نمبر کو دیکھ کر اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔

وہ ارحم کی کال تھی۔نجانے کتنے دنوں بعد اس نے کال کی تھی۔

ایرج نے سرخ بٹن دبا دیا۔

فون واپس سے بیگ میں ڈالا اور نل کھول کر پانی کی چھینٹیں منہ پر مارنے لگی۔

کیا فائدہ تھا اس ریل گاڑی کے پیچھے بھاگنے کا جو اس کی منزل کی طرف ہی نہ جاتی ہو؟

لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو بدلنے میں سال لگ جاتے ہیں۔

مگر نہیں!

انسان تو لمحوں میں بدلتا ہے۔اس کا دل لمحوں میں پلٹ جاتا ہے۔ برائی سے اچھائی کی طرف۔۔۔یا۔۔۔اچھائی سے برائی کی طرف۔

ایرج واش روم سے باہر آئی تو اس کا منہ صاف ہو چکا تھا۔

دل و دماغ لمحہ بہ لمحہ داغ چھٹا رہا تھا۔فیصلہ سامنے تھا،زندگی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہی تھی۔

وہ اب اندھی نہیں بنے گی، اس نے یہ وعدہ خود سے کیا تھا۔

اور ہر بار کے بر خلاف، یہ وعدہ جھوٹا نہ تھا۔

-----x------

آج آٹھ دن گزر گئے تھے۔ ارمغان سے ملنے نہ جانے کے اور دس دن ہو گئے تھے اس سے ملے ہوئے۔ اس نے ہر دن کا حساب کر رکھا تھا۔ ہر ایک دن کا۔

وہ بہت دن بعد ہی سہی، مگر ارمغان کی باتوں کو سمجھ رہی تھی۔ وہ ارمغان کو ارحم کی جگہ پر رکھ رہی تھی جبکہ ارمغان کو تو اسے اپنی جگہ رکھ کر جانچنا تھا۔

کیا مختلف تھا ان میں؟ کچھ نہیں۔

اس کے ساتھ بھی وہی ہو رہا تھا جو ایرج کے ساتھ ہوا تھا۔ ایرج بھی وہی کر رہی تھی جو ارحم نے کیا تھا۔ وہ محبت نا کرتی۔ وہ بات تو سن سکتی تھی۔ کم از کم وہ کسی کی پکار تو سن سکتی تھی۔۔

وہ بالائی منزل تک جاتی سیڑھیوں کے دہانے بیٹھی تھی اور اب اٹھ کر گیلری کی طرف آگئی تھی۔ہر چیز ویسی ہی تھی۔ٹیبل، کرسیاں، پودے۔

بس آج وہ نہیں تھا۔

کمرے میں سب سونے جا چکے تھے۔اوپری منزل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ ٹیبل تک آئی، پھر کرسی کھینچ کہ بیٹھی۔

فیصلے کی گھڑی آپہنچی تھی۔

آج وہ رات آگئی تھی جس رات اسے سب قبول کرنا تھا۔اسے آج آگے بڑھنا تھا۔

آج ہفتے کی رات تھی۔وہ مسکرائی۔

وہ یک طرفہ سب کچھ جھیل کر تھک چکی تھی۔آج وہ آخری بار خود کو بکھرتا دیکھنے والی تھی۔اس کے بعد دکھ بچے گا یا نہیں؟ اس نے سوچا نہیں تھا۔

گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا تو وہ تاروں سے سجا ہوا تھا۔چاند بادلوں کے پیچھا غائب تھا۔آنکھ سے آیک آنسو ٹوٹ کے نکلا تو اس نے بے اختیار آنکھیں موندلیں۔ذہن کے پردے ماضی کا آخری منظر دکھانے لگے تھے۔جس کو دیکھنے اور جینے والی صرف ایک لڑکی تھی۔

وہ خود۔

(ماضی)

وہ ٹیبل کے قریب آتی گئی۔یہاں تک وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔اس کی نظر ارحم سے ہٹی نہ تھی۔نہ ارحم کی ایرج سے۔

"جا میں رہا ہوں، رو تم کیوں رہی ہو؟"

ہاتھ آگے بڑھاتے اس نے بغیر کسی مسکراہٹ کے کہا تھا۔حالانکہ لہجا نرم تھا۔

ایرج نے اس کی ہتھیلی پر لاکٹ رکھ دیا۔اس نے مٹھیاں بند کر لیں تھیں۔

"تم۔۔۔جا رہے ہو۔۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی تھی۔ جتنی ہمت جمع کر کے وہ یہاں آئی تھی۔ وہ ساری ٹوٹنے جا رہی تھی۔

"تو یہ خوشی کی بات ہوئی نا؟" وہ جیسے اب تک اس کے رونے کی وجہ نہیں جان پایا تھا۔

"تمہیں کبھی احساس نہیں ہوا ارحم؟ کبھی محسوس نہیں ہوا؟" ایک لمبی تمہید تھی جو اس نے باندھی تھی۔ وہ یک دم کچھ بول نہیں پائے گی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خود کے لیئے، خود سے یک طرفہ طور پر دوسرے شخص کے سامنے آواز اٹھائی تھی۔

"کیا احساس نہیں ہوا ایرج؟ مجھے بتاؤ؟ کیا پریشانی ہے؟" وہ ہاتھ باہم پھنسائے اس سے کہہ رہا تھا۔ آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار برسنے لگی۔

"I like you Arham"

پھوار جیسے برس رہی تھی۔ویسے ہی برستی رہی۔ مگر پتا نہیں شور کیوں بڑھ گیا تھا۔

باہر کا شور،اندر کا شور۔وہ دونوں ساکت،ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔لمحہ آتا گیا، گزرتا گیا۔

"واٹ؟"وہ اس کی بات پہ تھوڑا غیر آرام دہ ہوا۔اس کی آواز میں چونک جانے کی جھلک آئی تھی۔

"تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا ارحم؟"اس کا گلا رندھنے لگا تھا۔اس نے اتنی ہمت تو کرلی تھی،آگے بات کرنے کی ہمت کہاں سے لاتی؟

"مگر میں نے۔۔۔۔"ارحم بار بار لب کھولتا،پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیتا۔

ایرج کو لگا وہ اگلا سانس نہیں لے پائے گی۔

(وہ مجھے کبھی انکار نہیں کرے گا۔)

"ایرج میں نے۔۔۔۔ایرج میں نے تمہیں کبھی اس طریقے سے نہیں دیکھا۔"

وہ جملے ٹوٹے ہوئے تھے مگر لہجہ ویسا ہی مضبوط تھا۔وہ اب ایرج کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"نہ کبھی دیکھنا چاہوں گا۔۔تم۔۔۔۔"

"میرے بارے میں اتنا کیوں پتا تھا پھر تم کو؟میری ہر پسندیدہ چیز،مجھے تم ہی منانے آتے تھے نا۔جب میں کبھی اداس ہوں،کیوں؟"وہ اس کی بات کاٹے ایک سانس میں بول رہی تھی۔

"تم نے مجھے نشانیاں دی ارحم۔۔۔۔۔تم نے۔۔۔"اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا تھا۔وہ بہت کچھ بولنا چاہتی تھی،مگر بول نہیں سکی۔

"میں سب کے ساتھ ایسے ہی ہوں ایرج،تمہارے ساتھ۔۔۔سعد کے ساتھ، سارہ کے ساتھ،دانیال کے ساتھ۔مجھے سب کی پسندیدہ چیزیں معلوم ہیں۔مجھے

سب کو منانا آتا ہے، میں نے تمہیں کبھی کوئی سائن نہیں دیا، ورنہ میں خود تم سے بات کرتا۔ خود کنفیس کرتا۔۔۔"

وہ اب چونکا چونکا سا لگ رہا تھا۔

"پھر ہر رات پورے گھر کو چھت پر کیوں نہیں بلاتے؟ صرف میں ہی کیوں؟"

وہ اس کی بات پہ ششدر رہ گیا تھا۔

"کیونکہ تم بہت قابل لڑکی ہو ایرج، اور تم بہت روتی ہو، تمہیں اس گھر میں جیسا ٹریٹ کیا جاتا ہے، میں جانتا ہوں۔ میں نے تم سے ہنس کے بات کی۔ تم کو گھمانے لے کر گیا۔ تم کو تحائف دیے۔ مگر یہ کہیں بھی محبت کے دائرے میں نہیں آتا ایرج۔ تم میری کزن ہو۔ تم میرے لیئے سارہ جیسی ہو۔ میں تمہارے بارے میں کبھی ایسے نہیں سوچ سکتا۔۔"اس کی آنکھوں میں غصہ یا افسوس نہ تھا۔ اس کا لہجہ سمجھانے والا تھا۔ اس کا لہجہ ایرج کے منہ پر ایک تھپڑ کی طرح تھا جس کا نشان اس کے چہرے پر سے کبھی مٹنے والا نہیں تھا۔

(وہ مجھے کبھی انکار نہیں کرے گا۔)

”میں جرمنی جارہاہوں، تمہیں بھی کال کروں گا۔سب کو بھی۔مجھے معاف کرنا ایرج اگر میں نے کبھی کوئی غلط بات تم سے کہی ہو یا تمہیں سائن دیاہو مگر مجھے لگتا ہے میں نے ایسا بالکل نہیں کیا۔“

(وہ مجھے کبھی انکار نہیں کرے گا۔)

”بارش تیز ہو جائے گی۔بادل آرہے ہیں۔تم بھی جاؤاب کمرے میں۔طبیعت خراب ہو جائے گی۔۔۔“

وہ کہہ کر اٹھا نہیں، بیٹھا رہا، جیسے ایرج کے اٹھنے کا انتظار کر رہا ہو۔

(وہ مجھے کبھی انکار نہیں کرے گا۔)

اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کب سیڑھیاں اتر کر کمرے تک آئی۔اس نے دروازہ آہستہ سے بند کیا۔اس کے بال بھیگ چکے تھے۔وہ بستر پہ آکر بیٹھ چکی تھی۔

(وہ مجھے کبھی انکار نہیں کرے گا۔)

یہ وہ رات تھی جب ایرج باہر سے تو ویسی ہی رہی تھی، مگر اندر سے مکمل تبدیل ہو گئی تھی۔

وہ بستر پر بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں نجانے کتنے آنسو امڈ آئے تھے جنہیں وہ چاہ کر بھی بہا نہیں پائی۔

اس کے ہاتھ بے اختیار بالوں کی جڑوں میں گئے، اس نے اپنے بالوں کو مٹھی میں پھنسایا اور زور سے کھینچ دیا۔

نجانے کتنے بال ٹوٹ کر ہاتھ میں آئے تھے۔ نجانے کتنے آنسو بستر کی چادر میں جذب ہوئے تھے۔

اور یک طرفہ محبت مکمل ہوتی بھی ہے کیا؟

(حال)

اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کا پورا چہرہ نمکین پانیوں سے بھیگا ہوا تھا۔ ہوا خشک تھی اور سانس پتا نہیں کیوں چڑھ رہا تھا۔ اس نے گہرے گہرے سانس لیئے۔

وہ کامیاب ہوئی تھی۔

اس نے ماضی کے اس صفحے کو پڑھ کر جلا ڈالا تھا جس کی وہ کبھی کوشش بھی نا کر پائی تھی۔

وہ اسے بھول نہیں پائی گی۔ نہ اس سے جڑی اچھی اور بری یادوں کو، مگر وہ ان یادوں سے اب ڈرتی نہیں تھی۔ اسے اب ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا دل خالی تھا مگر ہلکا ہو چکا تھا۔ اس کے دل جیسے داغوں سے صاف ہو چکا تھا۔ وہ ارحم کو دل سے نکال نہیں پائی تھی مگر اس نے ارحم کو دل میں ہی کہیں دفن کر دیا تھا۔ جیسے اس ہڈی کو نگل لیا ہو جو عرصے سے نہ اگلی جا رہی تھی نہ نگلی۔

اس نے قبول کر لیا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو قبول کر لیا تھا۔

بس چند دن میں بہت کچھ بدلا بدلا سالگ رہا تھا، جیسے زندگی میں اب آسانیاں آنے والی ہوں۔

اس نے چہرہ پوچھتے ہوئے قمیص سیدھی کی اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر باہر کا منظر دیکھا۔ وہ پہلے جیسی ایرج نہیں بن پائے گی۔ کیونکہ جو ٹوٹا تھا اس کے حصے جوڑنا ممکن نہ تھا۔ مگر وہ ذہن سے آزاد تھی۔ دل سے آزاد تھی۔ اتنا کافی تھا

اس نے قدم سیڑھیوں کی جانب بڑھا دیے تھے۔ ابھی ایک اور شخص بھی تھا جس کے بارے میں اسے سوچنا تھا۔ مگر اب فیصلے آسان لگ رہے تھے۔ اب اسے سب آسان لگ رہا تھا۔

گیلری ویسے ہی ویران رہ گئی تھی۔ اندھیرے میں ڈوبی وہ گیلری وہ ایرج کو جاتے دیکھتی رہی۔

اور پھر۔۔۔

گیلری میں اوٹ میں سے کوئی باہر آیا۔اس کے ہاتھ میں فون تھا جس پہ وہ مسلسل کچھ لکھ رہا تھا۔

اس نے بھی ایرج کو سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا۔

-----x------

"میں نے اس سے معافی بھی نہیں مانگی تھی۔"

وہ بالکنی میں کھڑا،ہاتھ بالوں میں چلاتے کسی سوچ میں گم لگ رہا تھا۔اس نے نیلی شرٹ اور ٹخنوں سے تھوڑی نیچے آتی شارٹس پہن رکھی تھیں۔اسے آج بھی یاد آرہا تھا۔

اس کے باقی دوست بستر پہ سوئے تقریباً مردہ لگ رہے تھے،اور وہ رات کے اس پہر اپنی زندگی کے سب سے حسین باب کے بدترین انجام کو سوچتے پچھتا رہا تھا۔

"کیا اسے میری وہ بات یاد ہو گی؟ مجھے اسے سچ بتانا چاہیے تھا۔۔ کیا ایک ملاقات نہیں ہو سکتی اب۔۔ صرف اظہار سچ کے لیے؟ اسکے سوال کے جواب کے لیے؟"۔

وہ دل ہی دل میں سوچتا سوال بنا رہا تھا۔خود ہی جواب بھی دے رہا تھا۔اس کا دل بالکل خالی ہو گیا تھا۔ٹورنامنٹ کا فائنل میچ کل صبح ہونا تھا اور وہ رات گئے اس پہر تک جاگ رہا تھا۔

"میں نے اسے سات ماہ پانے کی جدوجہد کی تھی۔میں نے اسے سات ماہ پانے کی کوشش کی تھی،اور میں نے اسے دو ملاقاتوں میں کھو دیا۔"اب کی بار اس نے دل میں نہیں بولا تھا، بلکہ اس کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔

اس نے نظر بھر کے لاہور کی کشادہ سڑک کو دیکھا جو رات کے اس پہر بھی کافی روشن تھی۔لاہور کافی کھلا کھلا تھا۔وہاں کراچی کے لحاظ سے گھٹن نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے گہری سانس لی اور کمرے میں واپس آگیا۔ اسے ایک رات اور بتانی تھی۔ ایرج کے باب کو بند کرنے کی کوشش میں، جس میں وہ کب سے ہارتا آیا تھا۔

-----x------

(وہ دونوں فیلڈ کی گھاس پہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ وہ اپنی سناتا، کچھ ایرج اپنی۔ آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان الگ الگ رنگوں میں ڈھلتا جا رہا تھا۔

"کیا مطلب تم خواب نہیں دیکھتے؟ ہر انسان کے گولز تو ہوتے ہیں نا۔" وہ برا سا منہ بنائے اس سے کہہ رہی تھی۔

"خواہوں میں کیا دیکھوں؟ گولز ہیں، مگر کبھی ایسے خواب نہیں دیکھے جو آسمانوں کو چھوتے ہوں۔" وہ اب اس کی طرف منہ کیے بول رہا تھا۔

"تو اتنے دماغ کا کیا فائدہ جب آپ اپنی زندگی ہی Fantasize نہ کر سکو۔" اسے لگا جیسے وہ کوئی فیکٹ کسی ان پڑھ آدمی کو بتا رہی ہو۔

"اچھا یہ بتاؤ خواب دیکھوں تو ان میں کیا سوچوں؟" وہ اب سوال کر رہا تھا۔ چہرے پہ مدھم مسکراہٹ تھی۔

"لو بھلا خواب سوچ کے دیکھے جاتے ہیں؟ خواب تو ہوتے ہیں سوچ کو آزاد کرنے کے لیے ہیں"

وہ اس کی بات پہ مدھم سا مسکرایا۔

"اگر خواب سوچ کر دیکھے نہ جائیں تو یہ خود کو جھوٹی تسلی دینا ہوا نا۔" وہ اس کی بات ہر گز ماننے کو تیار نہ تھا۔

"جھوٹی تسلی ہی صحیح مگر اچھے ہوتے ہیں۔" اس نے اب چہرہ موڑ لیا۔ وہ اب دور آسمانوں پہ پر پھیلائے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے تمہیں فریب میں آنے کا شوق ہے؟" اب کی بار اس نے بولا تو مسکراہٹ لبوں تلے دبائی۔

"روز یہاں آتی ہوں، فریب میں۔" اپنا چہرہ گھمائے اس نے کہا تھا۔اس کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ تھی۔

"یعنی میں تمہیں فریب لگتا ہوں؟" وہ ابرو اکھٹے کیے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تم اصلی نہیں ہو تم exist نہیں کرتے۔ تم فریب لگتے ہو مجھے۔ تمہاری آنکھیں فریب لگتی ہیں۔" آخری بات پہ وہ خود ہی ہنس دی تھی۔

وہ چند لمحے اسے ایسے ہی دیکھتا رہا۔ایرج کے پیروں کے پاس فٹبال پڑی تھی۔

سورج ڈھلتا جا رہا تھا۔چاند بادلوں پہ سجتا جا رہا تھا۔

"اور مجھے تمہاری آنکھیں خوبصورت لگتی ہیں۔" چند لمحوں بعد اس نے خاموشی توڑی تھی۔اس کی بات پر ایرج اور کھلکھلا کے ہنسی۔

"یہ ڈھائی کلو کے چشمے میں ڈھکی میری آنکھیں دکھ بھی جاتی ہیں تمہیں؟" وہ خود کو کنٹرول کرتے کہنے لگی۔

"اہم۔۔۔۔ایسے نہیں۔۔۔"۔ارمغان نے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ہاتھ ایرج کے چشمے پہ جا ٹھہرا۔دونوں کی نظریں ملی تو جیسے کسی نہر اور آگ کا سنگم برپا ہوا۔اس نے آرام سے ایرج کے چہرے سے چشمہ ہٹایا۔

"ایسے۔۔۔یہ آنکھیں، مجھے خوبصورت لگتی ہیں۔" وہ اب دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اس کی بات پہ ایرج کچھ بول نہ سکی۔بس حیرانی سے ارمغان کو دیکھے گئی کہ جب ارمغان ایک اور وقفے کے بعد بولا۔

"دنیا میں کتنے ہی سیریل کلرز آئے اور گئے۔کیا تمہیں پتا ہے ایرج ان کے مرنے کا سبب سب سے زیادہ کیا چیز بنتی تھی؟ اس نے اچانک سوال کیا تھا۔

ایرج اس کے غیر متوقع سوال پہ سوچنے لگی۔پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں پتا۔ کیا سبب بنتا ہے؟

''ان سب کو محبت ہو جاتی تھی۔''

وہ حیران ہوئی تھی۔اس کے سوال پہ بھی اور اس سوال کے جواب پہ بھی۔

اسکا چشمہ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔اور وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔)

ایرج نے آنکھیں کھولیں۔ جیسے حقیقت کی دنیا میں واپس آئی ہو۔ کمرہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ آج پہلی بار خود اٹھی تھی۔اسے کسی ڈراؤنے خواب یا کسی کی آواز نے نہیں جگایا تھا۔آج پہلی بار وہ کسی خواب کو دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔

ارحم سے جڑی یادیں چاہے جیسی بھی ہوں، اچھی یا بری۔ان کو یاد کرتے ہوئے وہ ہمیشہ اداس ہو جاتی تھی۔وہ ارحم اور اس کی یادوں پہ کبھی مسکرائی نہ تھی۔

اور جس کے ساتھ اس کی اچھی یادیں نہ تھیں۔وہ اس کو یاد کرتے مسکرائی تھی۔یہ کیسی کشمکش تھی۔

واش روم سے واپس آکر اس نے جائے نماز بچھائی اور مغرب کی قضاء نماز ادا کی۔ ہالا کہ وہ پاوور نیپ سے جلد اٹھ جایا کرتی تھی مگر آج لمبا سو گئی تھی۔

سلام پھیرتے وہ جائے نماز پر پتا نہیں کتنے لمحات بیٹھی رہی۔تاروں سے خالی آسمان کو دیکھتی رہی۔

اس کے ذہن میں وہی خواب منڈلا رہا تھا۔اس خواب میں سب اچھا تھا۔سب خوبصورت،سب حسین تھا۔خواب میں ہی صحیح مگر کسی نے پہلی بار اس کی آنکھوں کی تعریف کی تھی۔

جائے نماز تہہ کر کے وہ چار پائی پہ ہی بیٹھ گئی تھی۔پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جب دل نے اسے وہ قدم اٹھانے پہ راضی کر لیا تھا۔جس کے بارے میں وہ نجانے کتنے دنوں سے سوچ رہی تھی۔

ارمغان سے اسے دلی لگاؤ نہیں ہوا تھا، مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی بات ضرور سنے گی۔ایک آخری بار۔صرف اس خاطر کہ وہ ایک اہم کردار تھا اس کو بدلنے کے لیے۔ان چاہتے ہوئے بھی۔

اس نے چہرے پہ چشمہ ٹکایا۔فعن اٹھا کہ پہلے ارمغان کو ان بلاک کیا اور اسے میسج ٹائپ کرنے لگی۔

اس نے بے اختیار سر کو واپس اٹھا کر آسمان دیکھا۔آسمان تاروں سے خالی تھا، ایک چاند جو مکمل چمک رہا تھا۔وہ کافی تھا۔تاروں کی ضرورت بھی نہیں لگتی تھی۔

پہلی بار ارمغان کو سوچتے اسے ارحم کا خیال نہیں آیا تھا کیونکہ ایرج نے اپنا دل اپنی خواہشات اور اپنے اقدام کے لیے خالی کر لیا تھا۔ارمغان اس کے ذہن میں تھا۔وہ دل میں آتا یا نہیں، وہ ذہن سے جانے والا نہیں تھا۔

اور ایرج نے قبول کر لیا تھا۔ایرج نے سب قبول کر لیا تھا۔

بالآخر اس نے میسج لکھ کر بھیج دیا۔ اب وہ جواب کے انتظار میں تھی۔ کیا کوئی جواب آئے گا بھی؟

-----x------

وہ جہاں تھا وہیں رہ گیا. تمام دنیا جیسے دھندلی ہو گئی تھی اور وہ ایک میسج ابھر کے سامنے آیا تھا۔

کچھ منٹ پہلے ہی وہ اپنے فلیٹ کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ گلے میں پلیئر آف دا میچ کا میڈل لٹک رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ جوتے اتار رہا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آیا تھا، وہ کیا محسوس کرے۔ حیران تو پہلے سے ہی تھا۔ وہ لمحہ آ گیا تھا جب وہ ایرج کو سب بتا دے گا۔ یہ ملاقات صرف سچ اور حق کی بنا پہ تھی، وہ یہ جانتا تھا۔ مگر ارمغان علی کو یہ منظور تھا۔

"مجھے تمہاری بات سننی ہے ارمغان۔ تم کیا کہنا چاہتے تھے؟"

اس کے میسج میں کوئی غصہ، کوئی ناراض ہی نہیں جھلکتی تھی۔یہ کیسے ہوا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔

بے تاثر چہرے پہ کوئی ایموشنز نہیں تھے۔اس نے جواب سوچتے ہوئے لب دبائے۔

زندگی واقعی فیری ٹیل لگنے لگی تھی۔اور حقیقت کا تھپڑ اتنے ہی زور کا تھا۔

-----x-------

ایرج نے ڈاکٹر نوشین کو آج کے سیشن کے لیے منع کر دیا تھا۔آج اسے کہیں اور جانا تھا۔شاید اب اسے تھیراپی لینی ہی نہیں تھی۔تمام وجوہات جس نے اسے تھیراپی لینے پر آمادہ کیا تھا،اب حل ہوتی جارہی تھیں۔اور آج شاید۔۔۔آج اس کی زندگی کی تمام الجھی ڈوریں سلجھنے والی تھیں۔ایک جرح زدہ زندگی پر لگا مرہم اس جرح کو مندمل کرنے والا تھا۔

کافی وقت بعد اس نے آج سفید جوڑا پہنا تھا۔ وہ سفید بہت کم پہنتی تھی۔ آج وہ جوڑا زندگی کے نام۔

لبوں پہ ہلکی سی لپ گلاس لگائی اور آنکھوں کے نیچے گہرے concealer حلقوں کو

سے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"آج سے یہ حلقے بھی مدھم پڑتے جائیں گے۔" وہ خوش نہیں تھی۔ وہ بے صبر تھی۔ زندگی کا وہ بند دروازہ تھا، جس کی چابی کھوجنے وہ آج جا رہی تھی۔ اس نے کلچ میں بے اختیار وہ زرد پاکٹ نائف ڈال دیا تھا۔ وہ تیار ہو کے اپنی امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

-----X-----

سیاہ ٹرٹل نیک کا کالر موڑتے ہوئے وہ بے تاثر نظر سے خود کا عکس آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ لب سلے ہوئے، دل پھٹا ہوا، ٹوٹا ہوا؟

ہاتھ میں گھڑی پہنتے اس نے فون اٹھایا۔ایک آخری بار۔۔۔۔زندگی اس سے اسے ملا رہی تھی۔یہ فیری ٹیل سے کچھ کم تھا کیا؟ مگر یہ ملاقات فیری ٹیل نہیں تھی۔یہ ملاقات رومیو اور جولیٹ کی کہانی کا آخری باب تھا۔

بالکل وہ ہو رہا تھا جس کے وہ قابل تھا۔حقیقت ایک بار پھر اسے اکیلا چھڑوانے کے لیے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

وہ جا رہا تھا۔

اپنی اور اس کی زندگی بدلنے کے لیے۔

-----x------

حنا کو خدا حافظ کہتے وہ ان کے کمرے سے صحن تک آئی تھی۔اس کے عین سامنے دانیال کھڑا تھا۔نہ ایرج نے کچھ کہا،نہ اس نے۔وہ دونوں بس ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔اس کی نظروں میں سوال تھا،ایرج کی نظروں میں چبھن۔وہ سات ماہ پہلے بھی اس سے کھچا کھچا لگ رہا تھا اور اب بھی۔

"کیا نام ہے اس کا؟" اب کے اس نے سوال کیا تو نظروں میں اجنبیت تھی۔اس کا سوال وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

"کس کا نام؟" وہ صحن کے کنارے ہی کھڑی تھی۔وہ کس کا نام پوچھ رہا تھا؟ وہ سمجھ نہیں پائی.

"اس کا ہی جس سے آپ ملنے جا رہی ہیں؟" اس کی بات تھی۔اس کا سوال تھا یا کوئی پگلا ہوا سیسا۔اس کی آواز میں طنز، چبھن یہ واضح کرتی تھی کہ وہ سب جانتا ہے، کیسے؟ وہ یہ نہیں جانتی تھی، مگر وہ سب جانتا ہے، شاید نام بھی پتا ہو اور اب صرف یہ بتانے آیا ہو کہ وہ جانتا ہے۔

اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ دانیال کے سامنے کمزور پڑ رہی تھی مگر چند الفاظ دل کو جکڑ لیتے ہیں۔وہ کیا جواب دے؟ جواب دے یا وضاحت؟

اسے اپنا آپ بالکل زمین بوس ہوتا محسوس ہوا تھا۔وہ جانتی تھی کہ دانیال ارمغان کو اس کا بوائے فرینڈ سمجھ رہا ہے پر حقیقت تو بالکل الٹ تھی۔ مگر وہ کیسے کہتی؟اور وہ کیا کہتی؟

”وہ....“اس نے لب کھولے تھے۔اسے خود کو مضبوط کرنا تھا۔زندگی سلجھنے والی تھی،وہ خود کو بکھرتا دیکھ نہیں سکتی تھی۔

”ارمغان؟“

اور جیسے اس کی زبان ان چھے حرف کے ایک نام پہ کٹ گئی تھی۔

”اس سے ملنے مت جائیں۔۔۔وہ خطرناک ہے۔۔۔وہ خطرناک ہے۔“وہ اب کچھ نہیں کہہ رہی تھی،اب دانیال کہہ رہا تھا۔

وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ ارمغان کو کیسے جانتا ہے؟اور وہ کیا جانتا ہے۔ مگر لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔زبان دماغ سے جواب ڈھونڈ نہ پائی۔دماغ تھا ہی سن،وہ کیا سوچتی؟

اس نے اپنے قدم چلتے محسوس کیے تھے۔وہ دروازے کے پار قدم رکھ رہی تھی۔

دانیال نے آگے کچھ نہیں کہا۔ مگر ایرج نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

وہ گردن نفی میں ہلا رہا تھا۔وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"وہ خطرناک ہے۔۔۔۔مت جائیں۔"

ایرج نے اپنے پیچھے دروازہ بیر دیا تھا۔نہ وہ اسے دیکھ سکتی تھی،نہ دانیال اسے۔

وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔

وہ ملنے جا رہی تھی۔

اپنی زندگی کے لیے وہ ایک انجان خطرہ تو مول ہی سکتی تھی۔

-----x------

ایرج کے جانے کے بعد وہ صحن میں رکا نہیں بلکہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں

پھلانگنے لگا۔ساتھ ساتھ فون پہ کچھ ٹائپ بھی کرتا جا رہا تھا۔

"وہ چلی گئیں ارحم بھائی۔۔۔میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں رکیں۔۔اب میں کیا کروں؟"

وہ اوپر آکے تیز تیز سانسیں بھرتا جواب کا انتظار کرنے لگا۔

-----x------

وہ جا رہا تھا۔

ایرج سے ملنے۔اور یہ ملاقات ان دونوں کی زندگیوں میں جو طوفان لانے والی تھی اس کا اندازہ ارمغان کو خود بھی نہ تھا۔

یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔ جھوٹ چھپتا تھوڑی ہے۔آج وہ اسے سب سچ بتانے جا رہا تھا۔وہ اظہارِ محبت نہیں اظہارِ حقیقت کرنے جا رہا تھا۔

وہ جا رہا تھا۔

سیاہ ٹرٹل نیک پہ سیاہ کوٹ اور ڈریس پینٹ پہنے وہ آج بہت مختلف لگ رہا تھا۔

پرفیوم کو کپڑوں میں چھڑکتے اسے پچھلے دنوں ایرج سے کی گئی بات یاد آئی تھی۔

(ایک دن پہلے)

اس کا پیغام اب بھی جگمگا رہا تھا۔ارمغان بے جان نظروں سے اس پیغام کو بار بار پڑھ رہا تھا۔پیغام بھیجنے والے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔اور پھر اس نے پیغام لکھنا شروع کیا۔

"اس دن میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا ایرج۔میں تمہیں جانتا ہوں اور میں سارہ کو بھی جانتا ہوں۔میرے پاس ایسی حقیقت ہے جس سے میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔ مگر شاید اب تمہیں اس حقیقت کو جان لینا چاہیے۔تم مجھ سے ملنے آؤ ایرج۔شاید یہ آخری ملاقات ہی صحیح۔۔مگر اس بار تمہارے کیے گئے پہلے سوال کا جواب ہے میرے پاس۔میں سارہ کو جانتا ہوں۔۔سارہ سے جڑی بہت چیزوں کو جانتا ہوں۔ مگر کیا تم حقیقت سننے کی سکت رکھتی ہو؟"

پیغام لکھتے اس نے جگہ بھی ساتھ لکھی اور موبائل پاور آف کر دیا۔اسے پتا تھا وہ آئے گی۔کیونکہ مسٹری انسان کتا بنا دیتی ہے۔

(حال)

اس نے سر جھٹکا اور سیاہ جوتے پہننے لگا۔بڑی ہوئی شیو کو اس نے آج ڈھنگ سے تراشا تھا۔

وہ بہت مختلف اور ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔

"آنٹی کے پودوں میں گندگی نہیں کرنا، تمہاری گرل فرینڈ کو گھر میں آنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔اپنی آوارہ حرکتیں گھر سے باہر کرنا اور لال بیگ کو مت کھانا خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔"

ہر بار کی طرح گبی کو تلقین کرتا گھر کی چابیاں اٹھانے لگا تھا۔

وہ جا رہا تھا۔ایک آخری ملاقات کے لیے۔

-----x------

''اوہ خدا! دانیال۔۔۔۔ایرج کے پیچھے جاؤ، وہ خطرے میں ہے، اس کے پیچھے جاؤ فوراً۔۔۔۔یا خدا!۔۔۔۔۔اسے بچاؤ۔۔۔۔۔جاؤ۔۔''

ارحم کا جواب فوراً ہی موصول ہوا اور موٹر سائیکل کی چابی لے کر وہ نیچے بھاگا تھا۔ اسے ارحم سے کیا اور کیوں نہیں کرنا تھا، ابھی اس کا وقت بھی نہیں تھا۔ ابھی اسے صرف اپنے بھائی کی بات پہ عمل کرنا تھا۔

مریم پیچھے سے اسے پکار رہی تھیں مگر وہ انہیں نظر انداز کر کے گھر سے باہر نکل چکا تھا۔

-----x------

نمائش کی سڑکوں پہ چلتی وہ گاڑی اور اس میں بیٹھا مسافر دونوں الگ الگ جہانوں میں گم تھے۔

"وہ خطرناک ہے۔" دانیال کے کہے الفاظ بار بار اس کے ذہن میں کسی گھوارے کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کرتی تو ماضی یاد آ جاتا، آنکھیں کھولتی تو حقیقت، اور دونوں میں سے کوئی بھی سکون دہ ثابت نہ ہو پایا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ بس ٹھنڈے یخ بستہ تاثرات۔ اس نے آنکھیں پھر سے موند لیں۔

(ماضی)

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ایرج سترہ سال کی ایک لڑکی تھی۔ ایک عام لڑکی۔ بہت کانفیڈنٹ، بہت بہادر اور نڈر سی تھی۔ اس دن اس لڑکی کا نویں جماعت کا رزلٹ آنا تھا۔ وہ پوری رات سو نہیں پائی تھی۔ پہلے بورڈ کا پہلا رزلٹ جو تھا۔

صبح گیارہ بجے اس کا رزلٹ آیا تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنے ابا کے کمرے میں بھاگی تھی۔ وہ اس وقت بستر سے ٹیک لگائے گرما گرم چائے پیتے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ساتھ ان کے بڑے بھائی اور اس کے چاچو نسیم بھی تھے۔

"Your daughter has scored 89%!"

وہ بھاگتی ہوئی بستر پر آلتی پالتی مار کہ بیٹھے اپنا رزلٹ بتارہی تھی۔سب کے چہرے مسکراہٹ سے چمک رہے تھے کہ جب کسی نے پیچھے سے ایرج کی لمبی چوٹی کو ہلکا سا کھینچا۔

"پہلے مجھے بتانا تھا تم نے۔۔۔" اس نے سر اٹھا کے دیکھا تو اس کے سر کے اوپر ارحم کھڑا تھا جو ناراضی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔آج اسکول کی چھٹی تھی اور وہ گھر پہ تھا۔ (وہ اسکول میں پڑھتا نہیں پڑھاتا تھا)۔

"تمہارے پاس کون سا میرے لیے کوئی تحفہ ہوتا؟" ارحم اس سے کافی بڑا تھا مگر اس نے بچپن سے ہی اسے آپ کر کے نہیں پکارا تھا۔پہلے اسے بہت سمجھایا جاتا تھا مگر اب کسی کو اتنی پرواہ نہ تھی۔

"میں نے سوچا تھا سی ویو جانے کا مگر خیر۔۔۔" وہ اس کی بات پر اور ناراض ہوتا کمرے سے جانے لگا۔

"واپسی میں مال جا کے تم مجھے گفٹ دو گے تو راضی ہوں۔" اس کی بات پہ جہاں ارحم مسکرایا وہاں نسیم اور جاوید بھی ہنس دیے تھے۔

(حال)

اس نے آنکھیں کھولیں۔اور منظر آنسوؤں سے چھپ گیا تھا۔

"تم ہمیشہ یہی کرتے تھے ارحم۔۔۔تم نے ہمیشہ وہ مسکراہٹ سجائی رکھی جس کے معنی کھو کھلے تھے۔تم کیئرنگ نہیں ہو۔۔۔تم مینیپولیٹر ہو۔تم نے ہمیشہ مجھے رلایا ہی ہے۔"

وہ آنسو صاف کرتی، آنکھیں رگڑتی دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

وہ بہت قریب تھی۔زندگی کے رازوں سے بہت قریب۔

صدر میں آج بھی اتنا ہی شور تھا۔اتنے ہی لوگ تھے۔اتنا ہی ہجوم تھا۔

گاڑی رکی تو وہ اس سے اترنے لگی۔

-----x-----

گاڑی دور نکل چکی تھی۔وہ پیچھے رہ گیا۔اسے پتا بھی نہیں تھا ایرج کی گاڑی کس طرف مڑی ہے اور کہاں جارہی ہے۔

اس نے سر پہ ہاتھ رکھے سوچنا چاہا۔گھڑی میں وقت دیکھا۔۔چھ بجنے میں بیس منٹ تھے۔

"کہاں ہیں ایرج آپی آپ۔۔۔۔۔"خود سے کہتا اس نے بائک واپس اسٹارٹ کردی تھی۔اسے ہمت نہیں ہارنی تھی۔

-----x-----

گھر سے باہر نکلتے اس نے کال واپس ملائی۔بے تاثر نظروں سے سامنے خلاء میں دیکھتے اس نے فون پر بات کی اور فلیٹ کے زینے اترنے لگا۔

وہ جارہا تھا۔

اسے احساس ہوا تھا کہ آج گرمائش تھوڑی زیادہ تھی۔اس نے ایک انگلی سے اونچے کالر کو کھینچا اور ہوا کو آر پار ہونے کی جگہ دی۔کوٹ کو کندھوں سے اتارتے ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔

حلق خشک پڑ رہا تھا۔فضا میں صرف اس کے چمکتے سفید جوتوں کا شور گونج رہا تھا۔

جیسے فلیٹ کوئی ویرانہ ہو اور وہ واحد مرد ہو جو فلیٹ میں رہتا ہو۔

جیب سے سیاہ سن گلاسز نکالتے اس نے آنکھوں پہ ٹکا لیے۔

وہ آج واقعی بہت الگ لگ رہا تھا۔۔۔۔

وہ جا رہا تھا۔

-----x------

وہ آچکی تھی۔

اس نے ڈرائیور کو پیسے دیے اور زینب مارکٹ کے سامنے والی روڈ پار کرنے لگی۔

کندھوں پہ دوپٹہ اڑ کے بار بار ہاتھوں میں آرہا تھا جسے وہ بار بار درست کرتی کیفے میں داخل ہوگئی تھی۔اس کیفے میں آج معمول Deja Vu کے حساب سے بہت کم رش تھا۔اسے تو جیسے صدر اور یہ جگہیں بھول سی گئیں تھیں۔اسے وہاں اگر

ہوا تھا کہ شاید وہ یہاں آچکی ہے۔

وہی لکڑی کی ٹیبل،ایبسٹریکٹ پینٹنگ، شیشے کے پار وہی روڈ۔

شاید وہ یہاں آئی تھی۔شاید نہیں۔

اس نے ایک ٹیبل پہ اپنا کلچ رکھا اور کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔ارمغان ابھی نہیں آیا تھا۔اس نے موبائل پہ وقت دیکھا۔پونے چھے ہو چکے تھے۔اسے وہاں اس کا انتظار کرنا تھا۔وہاں

تھی۔وہ پانی خریدنے کے لیے اٹھ گئی۔self-sevice

-----x-----

وہ اتفاق تھا تو کمال تھا۔قسمت تھی تو پھوٹی ہوئی۔

وہ اندھا دھن بائک چلا رہا تھا کہ کہیں اسے اس کی گاڑی مل جائے مگر اسے نہیں ملی تھی۔

بائک کی رفتار آہستہ کرتے اس کی ہمت اور امید شکست کھا رہی تھی جب اسے اپنے سامنے وہی کالی گاڑی دکھائی دی جس میں ایرج سوار تھی۔مگر وہ الٹی طرف سے آرہی تھی،یعنی وہ گاڑی سواری اتار چکی تھی۔

اس نے چمکتی آنکھوں سے گاڑی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"جو سواری آپ نے اتاری ہے وہ کہاں اتاری تھی؟ایک لڑکی،سفید کپڑے،گول چشمہ؟"گاڑی روکتے ہی اس نے ڈرائیور سے سوال کیا تھا اور وہ اس کے سوال پہ چونکا تھا،مگر پھر تاثر سخت کرتے کہنے لگا۔

"دیکھیں جو بھی سواری تھی۔ہمیں اجازت نہیں ہے کہ کسی کی پرائویسی کسی انجان کو ریویل۔۔۔۔"

"وہ میری کزن ہیں۔ایرج۔آپ ان کی پروفائل کھول کے نام بھی دیکھ لیں۔وہ خطرے میں ہیں۔پلیز بتائیں آپ نے انہیں کہاں اتارا ہے؟"

دانیال نے ایک ہی سانس میں وضاحت دی تھی جس پر ڈرائیور کے تاثرات تھوڑے ٹھنڈے پڑے۔اس نے موبائل کھول کے پچھلی سواری کا نام چیک کیا۔

وہ نام ایرج ہی تھا۔

اس نے چہرہ دانیال کی طرف موڑا،اس کی نظروں میں اب بھی سوالیہ تاثر تھا۔

"دیکھ لیا آپ نے؟پلیز اب بتائیں۔۔۔"اس کی پریشانی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

"ان کو میں نے صدر میں زینب مارکٹ کے پاس ایک کیفے پہ اتارا ہے۔"اس نے بالآخر کہہ دیا تھا۔

"شکریہ آپ کا۔۔۔"وہ کہہ کر رکا نہیں،موٹر سائیکل واپس اسٹارٹ کرتے کراچی کی سڑکوں پہ بھگانا شروع کردی۔

وہ صدر سے دور تھا مگر وہ پہنچ جائے گا۔اسے نہیں پتہ تھا کہ ایرج کسی خطرے میں تھی مگر ارحم نے اسے کہا تھا کہ کوئی خطرہ ہے تو خطرہ ہے۔اور وہ ایرج کو بچا لے گا۔ ایرج اس کی نہ سہی ارحم کی بات سن لے گی۔وہ پہنچ جائے گا۔اسے امید تھی کہ وہ پہنچ جائے گا۔

-----x------

سیاہ پورشے کراچی کے سڑکوں پہ رواں دواں تھی۔اے سی کی تیز ہوا سیدھا اس کے منہ پہ پڑ رہی تھی۔اور وہ سب سے بے نیاز اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔چھے بجنے میں دس سے بھی کم منٹ رہ گئے تھے۔

اس کے چہرے پہ ایک تلخ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

وہ آج واقعی بہت مختلف لگ رہا تھا۔باہر سے بھی اور۔۔۔۔اندر سے بھی۔

وہ جا رہا تھا۔

-----x------

پانی کی آدھی خالی بوتل اس کا تھکا تھکا چہرہ تک رہا تھی۔اسے وہاں بیٹھے دس منٹ ہو گئے تھے اور ارمغان اب تک نہیں آیا تھا۔اس نے اس کو میسج بھی بھیجا تھا مگر کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔وہ اب تک تھک چکی تھی،مایوس تھی۔وہ چھے بجے تک اس کا انتظار کرنے والی تھی اور اگر وہ نہ آیا تو وہ چلی جائے گی۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ گرائے شیشے سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔جہاں لوگوں کے رش کے علاوہ کچھ نہ تھا۔بار بار پاؤں جھلاتے وہ ٹیبل کو ہلا رہی تھی۔

باہر بچے کھیل رہے تھے۔گاڑیاں چل رہی تھیں۔شور کیفے کے اندر کافی کم تھا مگر اسے شور کا اندازہ تھا۔

وہ باہر ہی دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنے پیر پہ کچھ وزنی سا محسوس ہوا۔فوراً گرسی پیچھے دھکیلتے اس نے دیکھنا چاہا کہ وہ کیا ہے۔اسے لگا تھا کہ شاید وہ کوئی بلی یا بلی کا بچہ ہو گا۔۔۔۔۔

مگر نہیں۔۔۔۔

اس کے پاؤں کے برابر میں ایک سنہری گھڑی تھی۔اس نے شاک کی نظروں سے اسے دیکھتے ہی اٹھایا تھا۔اس گھڑی میں چھے بج رہے تھے۔

اور اسی لمحے اسے اپنے پیچھے سے آواز آئی۔

"ایکسکیوز می۔۔۔۔میری گھڑی۔"

(ارمغان کے لاہور جانے سے دو گھنٹا پہلے۔)

لاہور جانے سے پہلے دوروس کو ایک ضروری کام کرنا تھا۔

سیاہ پورشے کا دروازہ کھولا گیا۔وہ اسکے اندر بیٹھتے ڈرائیور کو ہدایات دے کر چپ ہو گیا۔

جیب میں اب بھی اس گھڑی کا وزن محسوس ہو رہا تھا۔

اسے ایک کام کرنا تھا۔

صدر کی مارکٹ آہستہ آہستہ بند ہوتی جارہی تھیں۔ مگر وہ ایک کیفے اب بھی کھلا ہوا تھا۔

دروازہ کھینچتے وہ کیفے کے اندر داخل ہوا تو کیفے میں نہ ہونے کے برابر لوگ تھے۔اکا دکا لوگ بیٹھے آہستہ آواز میں باتیں کررے تھے۔

وہ سیدھا کاونٹر کی طرف آیا اور ایک کپ کافی کا آرڈر دے کر کرسی پہ آکے بیٹھ گیا۔

ادھر ادھر نظر گھماتے اس نے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر جیکٹ کی جیب سے سنہری گھڑی نکال کے مٹھی میں دبائی۔

ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔کیفے سے اچھے خاصے فاصلے پہ اسکی سیاہ گاڑی کھڑی تھی اور وہ اس کا سایہ دور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔

کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔اس نے گھڑی پہ گرفت ہلکی کی اور ایک پاوں سے تھوڑا سازور دے کر ٹیبل کا اوپری حصہ اٹھایا۔گھڑی کو ایک مخصوص ٹائم پہ سیٹ

کر کے ٹیبل اور روڈ کے بیچ ایسے پھنسادیا کہ وہ گھڑی گرنے سے بھی نا گرتی۔ کم از کم اتنے وقت تک تو نہیں جتنا وقت اسے درکار تھا۔

کافی پی کہ وہ فوراہی وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ کیفے سے تھوڑا دور آتے اس نے کال ملائی۔

ہر بار کی طرح فون پہلی گھنٹی پہ اٹھالیا گیا۔

"جی باس؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"لوکیشن مل گئی ہو گی۔ وقت بھی دیکھ لو۔ ناایک منٹ پہلے، ناایک منٹ بعد۔ دس دن بعد۔ ٹھیک شام کے چھے بجے۔"

وہ کال کاٹنے ہی لگا تھا کہ دوسری طرف سے سوال آیا۔

"پر باس اگر وہ نا آئی تو۔۔۔۔"

"وہ آئے گی۔اسے میں لاؤں گا۔" مختصر سا جواب دے کہ اس نے کال منقطع کر دی۔

گاڑی کا دروازہ کھول کے وہ بیٹھنے لگا تھا۔

ابھی ایک اور کام تھا جو اسے لاہور جانے سے پہلے کرنا تھا۔

(حال)

"ایکسکیوز می۔۔۔۔۔میری گھڑی۔"

وہ بالکل سن ہو گئی۔دنیا بالکل ٹھہر گئی اور ہر سو وہ ایک آواز گردش کرنے لگی۔

اس نے رفتہ رفتہ چہرہ گھمایا۔اس کی سانسیں جہاں تھیں،وہاں تھم گئیں۔

ارمغان اس کے عین پیچھے کھڑا تھا۔اس کے چہرے پہ ایک انجان مسکراہٹ تھی۔

چہرے پہ سن گلاسز تھے اور وہ سیاہ ٹرٹل نیک پہ سیاہ کوٹ میں ملبوس تھا۔اس کے پیچھے تین باڈی گارڈز تھے جنہوں نے وہاں کے ویٹرز اور مینجر پر پستول تانی ہوئی

تھی۔ مگر اتنی مہارت سے کہ باہر کسی بھی شخص کو احساس نہ ہو سکتا تھا کہ کیفے کے اندر کیا چل رہا ہے۔

وہ وہیں شل سی بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ کلچ میں رکھی بھری کا اسے احساس ہوا ہی نا تھا۔۔۔ وہ تو ارمغان تھا۔۔۔ وہ تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاے گا۔۔۔

وہ بہت مختلف لگ رہا تھا۔

اس کا چہرہ، اس کا حلیہ، اس کی مسکراہٹ، اس کا لہجہ۔۔۔۔ سب بہت مختلف تھا۔۔۔

اسے ارمغان آج واقعی انجان لگ رہا تھا۔

اس کے جواب نہ آنے پر ارمغان کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔ وہ اس کے سامنے جھکا کہ اب دونوں کے چہروں کے درمیان بس سانسوں کا فاصلہ تھا۔

"آ گیا تمہارا ارمغان۔۔۔ تمہارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے۔ تمہیں جاننا تھا نا کہ سارہ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

وہ اپنی جگہ سے ہلا اور ایک کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ ہٹایا۔اس کی آنکھوں میں بھی وہی حیوانیت تھی جو اس کی مسکراہٹ میں تھی۔

''تمہاری کزن کو سات ماہ پہلے میں نے مارا تھا۔تمہارے بھائی، سعد جاوید صدیقی کو بھی میں نے ہی قتل کیا تھا۔اور اب۔۔۔اب تمہاری باری ہے ایرج جاوید صدیقی۔۔۔پہلے سعد، پھر سارہ، اور اب تم۔تمہاری زندگی آج میں تم سے چھینوں گا۔"

"اور ہاں۔۔۔سوری مجھ سے ایک غلطی ہو گئی اپنا تعارف کروانے میں۔میں ارمغان نہیں ہوں۔میں دوروس ہوں۔اور دوروس کو اپنا کام اس دنیا سے لاکھ گناہ زیادہ پسند ہے۔تم نے ارمغان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔بدلہ تو بنتا تھا نہ پھر؟''۔

وہ مدھم سا ہنس ہنس کے بول رہا تھا۔اور وہ ٹھنڈے پڑتے جسم سے اس کی بات سن رہی تھی۔

"تم نے ارمغان کی محبت دیکھ لی ایرج۔۔۔اب تم دوروس کی ہوس دیکھو گی۔ تمہارے ساتھ میں اس سے بھی بدتر کروں گا جو میں نے سارہ اور سعد کے ساتھ کیا۔ تم ارمغان کو عزیز ہو۔اور اس لیے مجھے تم سے اتنی ہی نفرت ہے۔"

وہ کرسی سے اٹھتے کپڑے جھاڑنے لگا۔پھر اسکی گردن کے قریب جھکا۔

"Be careful"

کہہ کر رکا نہیں, پلٹ گیا۔وہ کیفے سے نکل رہا تھا اور ایرج۔۔۔ایرج سے تو جیسے کسی نے اس کی سانسیں چھین لی تھیں۔

(Be careful)

اس کے کہے آخری الفاظ دماغ کے کسی کونے میں دفن ہوئی یاد کو واپس اس کی آنکھوں کے سامنے لا رہے تھے۔

یہ تھی حقیقت؟

یہ تھا اس کے سوال کا جواب؟

یہ تھا ملاقات کا نتیجہ؟

اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اپنی گھڑی لے گیا تھا۔

اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔۔۔کاش زندگی کے راز راز ہی رہتے۔کاش کچھ سوال کے جواب اسے ملتے ہی نہیں۔کاش وہ یہاں نہ آتی۔۔۔کاش وہ اپنی زندگی مسٹری ہی رہنے دیتی۔

اس نے بے جان قدموں سے چلنا چاہا تھا مگر وہ لڑکھڑا گئی تھی۔ارمغان دور کہیں چلا گیا تھا۔ایک لیڈی ویٹر نے اسے سنبھالا تھا مگر اس نے خود کو اس کے ہاتھوں سے آزاد کیا اور دروازے کے رخ میں چلنے لگی۔

(وہ خطرناک ہے۔۔۔مت جائیں۔)

وہ دروازہ کھولتے باہر آئی تو سماعتوں سے تیز شور ٹکرایا تھا۔ہوا کا تیز جھونکا بھی اس کے اندر کی روح کو جگانے کے لیے کافی نہ تھا۔وہ خلاء میں دیکھتے بس قدم بڑھا رہی تھی۔

کیونکہ شاید اسے سات ماہ پہلے جو ہوا تھا، وہ یاد آگیا تھا۔

اور شاید اسے پتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

اور واللہ۔۔۔وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔

کیفے کے اندر ادھ خالی بوتل یوں ہی پڑی رہ گئی تھی۔جیسے سات ماہ پہلے وہ کافی کا کپ اور آدھے کھائے ڈونٹ پڑے رہ گئے تھے۔

(تم پرفیکٹ ہو ایرج۔)

وہ اندھا دھند اپنے قدم بڑھاتی جا رہی تھی۔روڈ کے کنارے کھڑے اسے بس ایک سڑک کراس کرنی تھی۔بس ایک روڈ کا فاصلہ تھا۔۔۔زندگی کا معاملہ تھا۔۔۔

(تمہاری آنکھیں خوبصورت ہیں۔)

اس کا کلچ اس کے ہاتھوں میں مضبوطی سے دبا ہوا تھا۔ دوپٹہ ہاتھوں میں آگیا تھا اور زمین سے رینگتا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"میں مرنا نہیں چاہتی.... یااللہ میں مرنا نہیں چاہتی۔۔۔۔ یااللہ مجھے جینا ہے۔۔۔ میں نے تو نمازیں بھی قضاء کی ہیں۔۔۔ میں نے تو گناہ کیے ہیں۔۔۔۔ یااللہ میں مرنا نہیں چاہتی۔۔"

اس کے چہرے پہ آنسو ابل ابل کے بہہ رہے تھے۔ منظر دھندلا گیا تھا۔ موت واضح ہو گئی تھی۔

کیا ایسے ہوتے ہیں؟ موت سے پہلے کے لمحات؟

(آئی یو آر دا بیسٹ)

وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی۔ وہ سڑک کراس کرنا چاہتی تھی مگر شاید قدم کسی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔

(تم التیئز ہو۔)

اس کے قدم رک گئے تھے۔دھندلے منظر پہ ایک روشنی سی چھانے لگی تھی جو اس کی کن اکھیوں سے بڑھتی جارہی تھی۔

(تم نے ارمغان کی محبت دیکھ لی ایرج۔۔۔اب تم دوروس کی حوس دیکھو گی)

اس کے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔دوپٹہ زمین سے جالگا۔ایک شور تھا جو بے حد قریب تھا۔۔۔موت کا شور۔۔۔ٹرک کا شور۔۔۔

"لاالہ الااللہ محمد۔۔۔۔"

کلمہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے لب بند ہو گئے تھے۔

اسے اپنی موت کا کلمہ بھی نصیب نہ ہوا تھا۔

اسے تو یہ بات بھی معلوم نہ ہو سکی تھی کہ سات ماہ سے اب تک جو وژن اور خواب وہ دیکھ رہی تھی۔۔۔۔اس میں سفید جوڑے والی ہمشکل مردہ عورت کوئی اور نہیں۔۔۔۔وہ خود تھی۔واقعی وہ ایرج تھی۔

****

اس نے دیر کر دی تھی۔

اس کی موٹر سائیکل کہاں،اور وہ خود کہاں اسے اندازہ نہیں تھا۔سڑک پہ تمام لوگ اکٹھا گہما گہمی کا شکار تھے اور زخمی کو قریبی ہسپتال لے جا چکے تھے۔

پولیس بھی واقعے پہ پہنچ گئی تھی اور ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کر لیا تھا۔(رشوت لے کر کمزور سے انجان بیل پہ چھوڑ دینے کے لیے۔)

کسی صاحب سے ہسپتال کا نام پوچھتے وہ بائک لے کر بھاگا تھا۔

اس نے دیر کر دی تھی۔

اور خطرہ سر سے ہو کر گزر چکا تھا۔

اس کے چہرے پہ صرف پریشانی کے آثار تھے۔اسنے زخمی بندے کا حلیہ بھی نہیں پوچھا تھا۔شاید تھوڑی سی امید وہ بھی زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

ہسپتال میں داخل ہوتے ہی ریسپنسٹ نے اسے راستہ بتایا تو وہ راہداری کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

وہ وارڈ کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ اندر سے ایک ڈاکٹر نکلتا دکھائی دیا۔اسے دیکھ کر وہ ڈاکٹر ٹھہرا اور قریب چلا آیا۔

"مریض کے ساتھ آپ ہیں؟"ڈاکٹر کے سوال پہ وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"آئی ایم سوری، ہم انہیں نہیں بچا سکے۔"

وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اسے کہہ گیا تھا جیسے وہ کوئی معمولی بات ہو۔

پر دانیال کو لگا کہ جیسے اس کے کان میں کسی نے پگھلا سیسا انڈیل دیا ہو۔

وہ بے جان قدموں سے کمرے کی طرف آیا۔ڈاکٹر پیچھے غائب ہو گیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے وہاں ایک ہی لاش تھی جس پہ سفید چادر اس کا چہرہ ڈھک رہی تھی۔

لرزتے ہاتھوں سے اس نے وہ چادر اس لاش سے اٹھائی۔

اور وہ وہیں برف کا مجسمہ بن گیا۔

وہ ایرج نہیں تھی۔

-----x------

سیاہ پورشے خالی ہائی وے پہ رواں دواں تھی۔ شام کے اس پہر بھی کوئی بندہ بشر، کوئی گاڑی دکھائی نہ دیتی تھی۔ مغرب کا وقت ہونے لگا تھا اور سورج لمحہ بہ لمحہ ڈھلتا جا رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پہ چاند کی ہلکی پھلکی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔

سیاہ گاڑی کے اندر بیٹھا شخص کسی کو فون ملا رہا تھا۔ ہر بار کی طرح فون پہلی گھنٹی پہ اٹھا لیا گیا۔

"کام ہو گیا؟"

"جی باس۔۔۔۔ باڈی آگئی ہے، کل تک آپ کے پاس ہو گی۔"

باقی کی بات کے لیے اس کے پاس وقت نہ تھا۔ اس نے ضروری خبر سنتے ہی کال کاٹ دی۔

ٹرک ڈرائیور کو اس کے دو تین سفید کالر بندے جلد جیل سے چھڑوا لیں گے، پھر ایک اور گمشدہ لاش کا کیس کوئی زیادہ سے زیادہ پانچ ماہ چل کر بند ہو جائے گا۔

یہی تھا پاکستان

اس نے فون کو کوٹ کی جیب میں ڈالا اور گھڑی کو ہاتھوں سے تھامے دیکھنے لگا۔

شاید اب تو اس پاکٹ واچ کا ہر نقشہ، ہر زاویہ اسے حفظ ہو چکا تھا۔ گھڑی کے پیچھے لکھی عبارت اب بھی ویسے ہی ابھری ہوئی تھی۔ البتہ اس کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

"اچھی یادوں میں، اور بری یادوں میں۔۔۔۔ ہم ساتھ رہیں گے ایکویرس۔"

اس نے زیر لب خود سے کہا اور گھڑی کو بھی جیب میں ڈال دیا۔

ابھی ایک لمبا سفر طے کرنے کو باقی تھا۔

"باس۔۔۔۔ سیدھا وہاں ہی جانا ہے؟" ڈرائیور نے وقفے بعد اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ اپنے گھر لے جاؤ پہلے۔" درشتی سے کہتا اس نے سر جھٹک دیا۔ ڈرائیور بالکل چپ ہو گیا۔

وہ جا رہا تھا۔

ایک آخری۔۔۔۔ اور طویل ملاقات کے لیے۔

وہ جارہا تھا۔

ایک ان کہے سوال کا طویل جواب دینے۔

وہ جارہا تھا۔

ایرج سے ملنے۔

وہ جارہا تھا، سیاہ ملک کے سب سے سیاہ شہر کی طرف۔

وہ لاہور جارہا تھا۔

کیونکہ فٹبال کھیلنے تو لاہور ارمغان جاتا تھا۔

دوروس کو اور بھی بہت کام کرنے ہوتے تھے

اور ابھی ایک ضروری کام تھا۔۔۔جو باقی رہتا ہے۔

---------x----------

جرح

حصہ دوم: اندرون لاہور

قسط نمبر ۴: نہ مومن رہا نہ ایمان

....

ٹریگر وارنگ؛

مزکورہ قسط میں کچھ ایسے مناظر اور واقعات کا ذکر ہے جو کچھ قارئین کے لیے پڑھنا ممکن نہ ہو۔

قسط میں سیلف ہارم، تفصیلی جسمانی تشدد، بچوں پہ جسمانی تشدد، تفصیلی خون خرابا، ٹارچر، اور قتل وغارت، ذہنی امراض، پستول کا غلط استعمال، بولڈ الفاظ (گالی نہیں)، انسانی اسمگل اور ایسے بہت سے ٹاپکس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر آپ کو ایسا کوئی مواد پڑھنا گوارہ نہ ہو تو براہِ مہربانی چند سینز کو چھوڑ دیں۔ شکریہ۔

....

کیا تم نے سنی نہیں،

ہیملٹ کی وہ عظیم داستان؟

جس میں بدلے کی پیاس بھی

بنا دیتی ہے ہیملٹ کو حیوان

کیونکہ ہر انسان کے ہوتے ہیں دو چہرے، دو رنگ

چھپائے رکھتا ہے کہ جنہیں، نہیں ہے وہ بھی نادان

اسے معلوم ہے کہ کب کسی پیادے کو چلنا ہے آگے

ہر باری پہ نظر ہے، ہر قدم ہے مہان

تمہیں لگتا وہ معصوم ہے، تمہیں لگتا ہے وہ شایان

لیکن کیا تم نے دیکھا ہے کبھی؛

ابلیس کو تھامے صراط مستقیم کا نہاں؟

وہ تو انتظار میں ہے، اسے تو بس کرنا ہے وار

بدلے کا انگارہ جھلس رہا، نزدیک نہیں اسکے آمان

زندگی اک ناٹک ہے، وہ موت کا پجاری

وہ تو ہے گمراہی کا رستہ، وہ تو ہے شیطان

ہاں، شکل سے وہ دکھتا ہے بھی اگر مسلمان

مگر جب نہ وہ مومن رہا، نہ اسکا ایمان

تو کیا لگتا ہے تمہیں، وہ رہا انسان؟

....

کراچی سے لاہور تک، صدر سے اندرون تک.

اس کے گال ٹھنڈے پڑھ چکے تھے۔ماتھا بار بار گاڑی کے شیشے سے ٹکرا رہا تھا۔
ہاتھوں پر سرخ خون جم گیا تھا۔

اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ اسکے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

اسے کچھ معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ آخر ہے کہاں؟

وہ بس سانسیں لے رہی تھی،اس کے لیے فی الوقت یہ بھی کافی تھا۔

وہ زندہ تھی،اس کے لیے یہی غنیمت تھی۔

ہاتھ گاڑی کے جھٹکوں کی وجہ سے پہلو میں ہنوز ہل رہا تھا۔گاڑی کسی تنگ سڑک سے گزر رہی تھی۔اسے زندگی کہاں لے جارہی تھی،وہ یہ جاننے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔

....

(لاہور،حال)

سیاہ پورشے سرمئی گھر کے سامنے دھول اڑاتے رکی۔دروازے کے کھلتے ہی اس کے چمکدار جوتوں کی جھلک لاہور کی دھواں دار فضا میں واضح ہوئی۔

وہ کوٹ جھاڑتا، بٹن کو سوراخ میں ڈالتا، گاڑی سے باہر نکلا۔

اس کا سیاہ کوٹ اور سرمئی سایہ سفید دھول میں دھندلا گیا مگر اس کی سوچ اور دماغ میں چلتی چالوں پہ کوئی دھند طاری نہیں ہوئی تھی۔

وہ تمام لوگ لاہور پہنچ گئے تھے اور گلبرگ کے ایک نہایت سحر انگیز مکان کے سامنے کھڑے تھے۔وہ آگے تھا، دو گارڈز پیچھے۔گاڑی پارک ہونے کے لیے ان کے پیچھے سے گزر گئی۔

اس نے آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتارا۔ پھر دو انگلیوں سے سیاہ ٹرٹل نیک کا کالر کھینچا۔
موسم آج خلاف توقع گرم تھا، ٹرٹل نیک پہننا ایک برا آئیڈیا ثابت ہوا تھا۔

چار کول سڑک پر اپنے قدم رینگتے، وہ آہستہ آہستہ چلتے گھر کے سیاہ دروازے کے
پاس آیا۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، دروازہ ایک کلک کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔

ہاتھ میں تھاما چشمہ اُس نے کالر سے اٹکا دیا۔

سرمئی گھر اندر سے اندھیر تھا اور ایک عذابِ جاں بدبو ہر سُو پھیلی ہوئی تھی۔اس کے پیچھے سے چھے عورتیں گھر میں داخل ہوئیں اور فوراً صفائی میں مشغول ہو گئیں۔

”کل تک پورا گھر صاف ہو جانا چاہیے۔“وہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔

”زندگی اک ناّٹک ہے،“

سرمئی مکان کی زمین کھوکھلی تھی،جوتوں کی آواز گونجنے لگی۔

”ہم سب موت کے پجاری،“

ایک ایک کر کے اُس نے گھر کی بتیاں جلادیں۔

"جو سچ ہے وہ خواب ہے،"

گھر کا دروازہ پیچھے بند ہو گیا۔ سورج کی روشنی دم توڑ گئی اور مصنوعی روشنی پھیلتی چلی گئی۔

"جو جھوٹ ہے وہ عذاب،"

ہر فرنیچر پر سفید چادر بچھی تھی جس کو ماسیوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

”زِندگی گزار دی جھوٹ میں۔کمال ہے میری اداکاری،“

جگہ جگہ مکڑی کے جالے تھے،زمین پہ مٹّی اور گرد کی موٹی موٹی تہہ بچھی تھیں۔

”اب جھوٹ کی حقیقت بے چین کرتی ہے، عجیب ہے یہ بیماری۔“

اُسنے سیڑھیوں کے اوپر تک نظر دوڑائی۔اور ایک زخمی سا تاثر اس کے چہرے پر پھیل گیا۔

(لاہور،ماضی)

~بارش ہو رہی باہر اور میں کمرے میں اکیلا

اندھیرا بڑا ظالم مجھے سونے نہیں دے رہا

بیٹی کی منحوس پیدائش کے چھے سال بعد مطاہر کو ایک حسین اور خوبصورت بیٹا خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

اس خوش شکل بچے کا نام اس کے باپ نے ارمغان رکھا تھا، ارمغان یعنی خدا کا تحفہ، واقعی، ان کے لیے تو وہ خدا کا تحفہ ہی تھا۔

اس کی چھ سال بڑی بہن اس کے قریب آنے سے بھی ڈرتی تھی۔ یا شاید اسے ڈرایا جاتا تھا۔ وہ تو تھی ہی منحوس۔ اَن وانٹڈ۔ اور ارمغان تو تحفہ تھا۔ جسے سب چاہتے تھے، جِسے سب نے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔

جس دن ارمغان کا ایڈمیشن اس اسکول میں ہو گیا تھا جہاں ہادیہ بھی پڑھتی تھی اس دن سے جیسے ہادیہ کے زندگی جینے اور تمام خواب پالنے کی خواہشات چکنا چور ہو گئ تھیں۔

اس کے آگے پڑھنے، آگے بڑھنے کا کیا فائدہ؟ اس کے لیے تو ارمغان تھا۔

اس کے زندہ رہنے کا کیا فائدہ؟ اس کے لیے بھی ارمغان تھا۔ ماں باپ کا سہارا تو اسے ہی بننا تھا، اس کا آگے پڑھنا، آگے بڑھنا تو ضروری تھا۔ ہادیہ کے لیے اس کا کیا

فائدہ تھا؟ وہ تو پہلے سے تھی ہی بوجھ،اسے جلد یا بدیر ماں باپ کی جان چھوڑ کر ان کا سانس بحال کرنا تھا۔

آٹھویں جماعت پڑھ کے اسکول کی ٹاپر ہادیہ، گھر بیٹھا دی گئی۔اب وہ ریاضی حل کرنے کی جگہ سبزیاں کاٹتی تھی۔ہاں۔۔۔وہ اب ہانڈیاں بہت اچھی بناتی تھیں۔ روٹیاں بھی گول گول،نرم نرم۔اس کے ہی جھاڑو دینے سے گھر ایک دم صاف ہو جاتا تھا۔اس کے ہی برتن دھونے سے پلیٹوں پہ چمک آجاتی تھی،اس کے ہی کپڑے دھونے سے کپڑوں کے داغ مٹ جاتے تھے۔

وہ دن میں پونچھا لگا رہی ہوتی جب گھر کی بیل بجتی،وہ چابی دینے اوپر کی گیلری میں جاتی تو اسکول کا بستہ پیٹھ پر تانے ارمغان کی مسکراتی صورت واضح ہوتی،

وہ بھی مسکرا دیتی۔

کم از کم اس کے ساتھ اس کا بھائی تھا۔ہادیہ اور ارمغان میں گھر والوں نے جتنا بھی فرق رکھا تھا،ان کے سامنے وہ کچھ نہ تھا،ان کی محبت،ان کا ساتھ یکجا۔ان کے لیے کوئی فرق معنی نہیں رکھتا تھا۔وہ اس کا پیارا بھائی تھا،اور وہ اس کی پیاری بہن۔

ارمغان مسکراتے رہنے والا بچہ تھا۔جس کے نکھرے چہرے پہ آنسو کا ایک نشان بھی نہ ہوتا۔اور ایک ہادیہ تھی،جس کی آنکھیں گہرے حلقوں میں گم گئی تھیں۔

اور وہ حلقے رونے کی وجہ سے نہیں تھے،

اور یہ بات سب کے علم میں تھی۔

''چولہے سے جل گیا تھا بس۔'' وہ کہیں جاتی تو اسے وضاحت دینی پڑتی۔

''سیڑھیوں سے پھسل گئی تھی۔'' وہ ارمغان کو دیکھتی۔

''نہیں واش روم میں گر گئی تھی چاچی''۔۔۔۔

(لاہور، حال)

گرل کی راڈ تھامے وہ زینے چڑھنے لگا۔ یہ ہی تو وہ واحد جگہ تھی جہاں اس کی زندگی کی سب سے اچھی یادیں بھی بنی تھیں، اور زندگی کی بدترین یادیں بھی۔

یہاں ارمغان، ارمغان تھا۔کاش وہ یہاں سے دربدر نہ ہوا ہوتا۔

کاش وہ دوروس نہ بنا ہوتا۔

آج وہ آخری بار اس جگہ بغیر ثبوت آیا تھا۔وہ اس سرمئی گھر کو ثبوت دکھانے والا جس کو وہ بے گناہ ثابت کرتے۔

مگر کیا وہ واقعی بے گناہ تھا، کیا وہ معاف ہو جانے کے قابل تھا؟

~خالی مکان، جو کبھی بستا تھا لوگوں سے،

کبھی گھر تھا جو، آج بس ایک یاد بن گیا۔

~~~~~

وہ ہوش میں تھی یا نہیں مگر اندرون لاہور میں داخل ہوتے ہی اس کی ناک کے نتھنوں میں مصالحہ دار کھانوں اور خوشبودار چائے کی مہک گھس چکی تھی۔

گاڑی دھول اڑاتے، اندرون لاہور کی جھلک دکھاتے گزر گئی اور ان میں خوش مہک بھی پیچھے ہی کہیں رہ گئیں۔

اب صرف بدبو تھی۔
~~~~~

خون کی، موت کی، دم گھٹنے والی غلیظ بدبو۔

وہ شاہی محلہ میں داخل ہو چکے تھے۔ ہر جگہ کان میں چبھتا بے ہنگم سا شور تھا، ہر دکان کے گرد مکان نما دیواریں تھیں جن کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں دن کے اس پہر بند تھیں۔

سب کو معلوم تھا کہ وہ کھڑکیاں کس وقت کھولی جاتی تھیں۔

گاڑی ایک تنگ گلی کے کنارے جا رکی۔ وہ نہایت پتلی گلی تھی جس کو وہاں دیواروں سے جڑی الجھی سلجھی تاریں اور کیبل اور تنگ بناتی تھیں۔

گاڑی کا دروازہ کھلا تو ایرج کا بے حس و حرکت چہرہ گاڑی سے آدھا باہر کو لٹک گیا، اس کا چہرہ ایک طرف سے بالکل صاف تھا، جبکہ دوسری طرف سوکھا خون جم چکا تھا۔

اس کی سفید قمیص بھی اب سرخ مائع میں نہا گئی تھی۔ جگہ جگہ پٹیاں اور بینڈ تیج بندھی تھیں۔

اسے بے ہوش رہے آج تین دن ہو گئے تھے۔

گاڑی کی دوسری طرف سے ایک گارڈ نکلا، پھر اس کی طرف والے دروازے پہ آیا اور اسے اٹھانے کے لیے قدم بڑھائے کہ پیچھے سے آتی آواز پہ ٹھہر گیا۔

"رکو، تم نہیں۔" سیاہ شرٹ پہ نیوی بلو کوٹ اور پینٹ پہنے، گارڈ کے پیچھے دوروس کھڑا تھا، گارڈ نے چہرہ اس کی طرف موڑا تو دوروس کا حلیہ واضح ہوا۔

سیاہ شرٹ پہ نیوی بلو کوٹ پینٹ، ٹائی کا نام و نشان نہیں اور اوپر کے دو بٹن ہر بار کی طرح کھلے ہوئے تھے جن سے اسکے سیاہ ڈریگن ٹیٹو کی جھلک دیکھائی دے رہی تھی، پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ اسے دیکھ رہا تھا، برونز رنگ چہرے پہ سیاہ سن گلاسز جمے ہوئے تھے۔

اس نے ایک ہاتھ جیب سے نکالا اور دوسری گاڑی کی طرف مڑتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

گاڑی سے ایک بھاری بھرکم عورت برآمد ہوئی جس کا منہ پھولا ہوا تھا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ چہرہ کسی تاثر سے عاری تھا، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی دوروس کے ہم قدم آئی۔

''اسے اٹھاؤ، اور آفس کے ساتھ والے کمرے میں شفٹ کرو، اس کی صحیح سے مکمل بینڈیج کرواور یقینی بناؤ کہ اسے جتنا جلدی ہو سکے، ہوش آجائے۔'' اس نے اپنی اسسٹنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر باس میں کیسے۔۔۔" اس نے احتجاج کرنے کے لیے لب کھولے مگر دوروس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم گرو یا مرو۔۔مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں، مگر اس کو ایک اور زخم بھی نہیں آنا چاہیے۔" اس نے اب ایرج کے بے جان چہرے کو دیکھا تھا۔

"ہاں جیسے اس کے جسم پہ پہلے سے ایک بھی خراش موجود نہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اس سے کہنے لگی اور دوروس کے چہرے پہ ہر بار کی طرح وہی موت کی خاموشی جیسا تاثر چھا گیا جو تارا کی کوئی بھی بات بکنے پر چھا جاتا تھا۔

"تمہارے بولنے کے پیسے سیلری سے کاٹوں تو سیلری چھوڑو، تم پہ دو ماہ کا قرضہ چڑھ جائے۔" وہ کہتے ہوئے رکا نہیں، اپنے سفید اونچے آفس کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑھ گیا۔

تارا اسے پیچھے سے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگی۔

~~~~~

(کراچی، حال)

ایرج کو گم ہوئے آج تیسرے دن کا سورج بھی غروب ہو چکا تھا۔
~~~~~

گھر میں موت کہ جیسی خاموش چھا گئی تھی۔ جیسے خوش اور پُر فضا ہوا چلتے فاطمہ منزل تک آئے تو وہاں ہی دم توڑ دے۔ نجانے اس گھر کے مکین اب تک زندہ کیسے تھے۔۔۔ یا شاید بس زندہ تھے، بس سانسیں لے رہے تھے۔

کراچی میں سورج ڈوبا تو آسمان پہ سیاہ بادل چھانے لگے۔ ویسے تو کراچی میں بارش برائے نام ہوتی تھی مگر کبھی موسلادھار برس جاتی تو پورا شہر دریا دریا ہو جاتا۔

سیاہ بادلوں پہ وقتاً فوقتاً بجلی گرجتے اپنے برسنے کی خبر دے رہی تھی۔ مگر صحن کی چارپائی پہ بیٹھے دانیال کو جیسے ان سب سے کوئی غرض نہیں تھا۔

وہ پاؤں سے بار بار زمین بجا رہا تھا۔ پھر ایک ہاتھ سے سر کھجاتا اور واپس فون پہ کچھ سوچ کہ لکھنے لگتا۔

تین دن پہلے وہ اس ہسپتال گیا تھا۔ مگر وہاں ایرج نہیں تھی۔ اسے یاد تھا کہ ہسپتال سے نکلنے کے فوراً بعد ہی وہ واپس صدر کی اسی سڑک گیا تھا جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ وہاں اب بھی اتنا ہی رش تھا۔ پولیس کی گاڑی بھی وہیں تھی۔ مگر وہ ان تک جانے کے بجائے راہ چلتے شخص کو ایرج کا حلیہ بتاتا، ان سے سوال پوچھتا، شاید کہیں نا کہیں سے کوئی خبر خیر مل جائے۔۔۔

وہ مطلوبہ کیفے میں داخل ہوا تو وہاں بھی عجیب سی خاموشی تھی۔ وہ کاؤنٹر پہ کھڑے شخص سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے سرد لہجے میں اسے ٹوک دیا؛

''ہم سے پوچھ گچھ ہو چکی ہے، پلیز ہمیں پریشان مت کریں۔''

وہ اور پریشان ہو گیا۔ حیرت تھی، شاک تھا، افسوس بھی۔

ایرج کہاں تھی!؟ وہ لمحوں میں کہاں جا سکتی تھی، ایسے کیسے ہو سکتا تھا کہ کسی کو اس کا روپ یاد نہ ہو، نہ ہسپتال والوں کو، نہ ان عام لوگوں کو۔ وہ سوچنے لگا، اسے اپنا دماغ چلانا تھا۔

ایک واحد راستہ جو اسے دکھائی دیا وہ پولیس تک جانا تھا، مگر کیا اسے یہ انتہائی قدم کسی سے بغیر پوچھے اٹھانا چاہیے تھا؟ اسے جو راستہ سامنے دکھا، اس پہ قدم رکھ دیا۔ کیفے سے باہر نکلتے ہی اسے پولیس کی جیپ نظر آئی۔ سامنے ایک پٹھان نوجوان

پولیس کی وردی میں کھڑا اپنے ساتھی سے بات کر رہا تھا۔دانیال کے ٹوکنے پہ اس نے گھوم کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے ایف آئی آر درج کروانی ہے۔"اس کا لہجہ نرم تھا۔دل میں لرزش پیدا ہو رہی تھی۔

پولیس آفیسر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا،اور مسکرایا۔

"بچے گھر سے کسی بڑے کو لے کر آؤ،ایسے ہی تیرے جیسے نوعمروں کے کہنے پہ ایف آئی آر کاٹتے پھرے تو ہو گیا ہمارا کام۔"اس نے ایک قہقہہ بلند کیا اور ساتھی کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔

ہر طرف مایوسی تھی، ہر طرف سوال تھے، جواب کہیں نہ تھا، امید کہیں نہیں تھی۔

بارش تڑاتڑ برسنا شروع ہو گئی تو وہ لمحے کی دیری کیے بنا صحن سے اٹھ کر گھر میں آگیا۔ ارحم اگلی صبح کراچی پہنچنے والا تھا۔ دانیال کو اسی کا انتظار تھا۔ وہ سب کچھ ہینڈل کر لیتا تھا، وہ سب کچھ سنبھالنے آ رہا تھا، ہر بار کی طرح، وہ سب حل کر لے گا۔

وہ امید تھامے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

~~~~~
~~~~~

(لاہور، حال)

ایرج کو کراچی سے گم ہوئے آج چوتھے دن کا سورج لاہور میں چڑھ چکا تھا اور تمام لاہور کو جھلسا رہا تھا۔

وہ اوندھے منہ بستر پہ لیٹا تھا جب میسج کی رنگ کانوں میں گونجی۔ وہ ہاتھ کے بل اٹھا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے دو تکیے سر کے پیچھے ٹکا لیے، اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا جو اب روز کا معمول تھا۔ اس نے ایک بازو سر کے پیچھے ٹکایا اور دوسرے ہاتھ سے موبائل پہ وقت دیکھا۔ صبح کے گیارہ بج گئے تھے۔

منہ پہ ہاتھ رکھتے اس نے جمائی روکی اور بیڈ کی دوسری طرف پڑی سفید شرٹ اٹھائی۔ فون کو بستر پہ رکھا اور شرٹ کو ہاتھوں سے پار کرواتے تن پہ ڈال دیا۔

موبائل واپس اٹھاتے اس نے رات سے صبح تک آئے تمام میسجز ایک ایک کر کے کھولے اور پڑھنے لگا۔

وہ اسکرول کرتا گیا، معمول کی خبریں، کچھ خاص نہیں۔

بالوں میں ہاتھ پھیرتے وہ کچھ بے زار سا فون رکھنے لگا تھا کہ ایک دم پیغام کی گھنٹی بجی۔

تارا کے میسج کی نوٹیفکیشن چمک رہی تھی، اس نے پیغام کھولا۔اور وہ جو بستر سے اٹھ رہا تھا، واپس بستر پہ گر گیا۔

تارا کا پیغام دوروس کے چہرے کو روشن کر رہا تھا، یا شاید منہ چڑا رہا تھا۔

"باس، ایرج از ڈیڈ۔ بہت زیدہ خون بہہ چکا تھا، میں نے کہا تھا کہ ہمیں۔۔۔۔"

اس نے بقیہ میسج پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ موبائل کو بستر پہ پھینکتے ہوئے وہ وارڈروب کی طرف بڑھا۔سیاہ ٹو پیس سوٹ نکالا اور واشروم کی طرف چل دیا۔

اس وقت اس کے دماغ میں جھماکے ہو رہے تھے۔وہ کچھ سوچنا چاہ رہا تھا مگر سوچنے سے قاصر۔

اس نے سفید شرٹ تقریبا پھینکی۔اس کی پیٹھ پہ ایک ڈریگن ٹیٹو تھا جس نے اپنے منہ میں تلوار تھامی ہوئی تھی۔اس ڈریگن کا منہ اس کے شانے تک آتا تھا اور اس کی دم کمر پہ ختم ہو جاتی تھی۔اس کا چہرہ اس کے شانوں پہ ختم ہوتا تھا جیسے پیچھے سے کوئی اس کے شانوں سے آگے کو جھانک رہا ہو۔اس کی پوری پیٹھ پہ اس سیاہ ڈریگن کا راج تھا۔اور صرف دو روس جانتا تھا کہ وہ ٹیٹو اس نے کیوں بنوایا تھا۔

وہ شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ڈریگن گرم پانی میں بھیگنا شروع ہو گیا۔پانی تیز رفتار سے بالوں کو تر کرتے پورے جسم پہ بہہ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں سامنے دیوار پہ جمی تھیں۔وہ ہاتھ بالوں سے گزارتا پانی کو آنکھوں میں جانے سے روک رہا تھا۔

"ِتھنک،دوروس،ِتھنک۔"شیمپو کا جھاگ آنکھوں میں پھر بھی گھسنے لگا،اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

"ڈیم اٹ اسٹوپڑ۔"ایک بار،دو بار،وہ خود کو گالیاں دینے لگا۔

شاور سے نکل کے اس نے تولیے سے پورے جسم کو پونچھااور واش روم سے باہر آ کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔سیاہ پینٹ پہ اس نے سیاہ شرٹ شانوں پہ پہنی اور بٹن کھلے چھوڑ کے ڈریسنگ ٹیبل تک آگیا۔

اسکے پورے جسم پہ چھوٹے موٹے زخم تھے، کچھ سینے کے پاس، کچھ کندھے کے پاس، کچھ ایبز پہ، کچھ اس سے نیچے، کچھ نئے جرح، کچھ پرانے جرح۔

ان زخم کو نظرانداز کرتے اس نے تولیے سے بال پونچھے اور اُن کو سیٹ کرنے لگا۔ پھر نیچے سے اوپر تک شرٹ کے بٹن بند کیے۔

بستر پہ پڑی سیاہ بیلٹ کو بکل لگاتے اس نے کوٹ سے بازو نکالے اور کندھے اچکاتے ہوئے کوٹ درست کیا۔

پرفیوم کی بوتل کھولی اور شرٹ کے دو بٹن کھول کہ سینے پہ پرفیوم چھڑک دیا۔ بٹن کو ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا۔

وہ گھڑی نہیں پہنتا تھا، اس کے سرمئی گھر میں کہیں کوئی وال کلاک نا تھی۔ وہ سورج سے وقت کا اندازہ لگاتا یا تو موبائل پہ وقت دیکھ لیتا۔ اسے گردن میں چین، ہاتھوں میں بریسلٹ یا انگلیوں میں انگوٹھیاں پہننا ناپسند تھا، اسے الجھن ہوتی تھی ان سب چیزوں سے۔ اس کے جسم پہ صرف ایک بڑی سی پینٹنگ تھی، وہ ڈریگن اس کے جسم کے ان مٹے زخموں کو چھپاتا تھا۔ وہ زخم جنہوں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، وہ زخم جو اسے ان راتوں کی یاد دلاتے تھے۔ وہ زخم جو اسے روزمنہ چڑاتے تھے۔

اس نے ان نشانات کو چھپانے کے لیے پوری پیٹھ پہ ایک سیاہ ڈریگن بنوایا تھا، وہ ہر چیز کو پیچھے چھوڑ کے آگے بڑھ رہا تھا، اور وہ ڈریگن اس کی زندگی کے سب سے بدترین وقت پہ پردہ ڈال دیتا تھا۔

اس نے اپنا عکس آئینے میں دیکھا۔اور مسکرایا۔

وہ پرفیکٹ نہیں تھا۔ مگر دکھ رہا تھا، کم از کم دیکھنے والوں کے لیے۔

یہ اس کا گوٹو (عام) حلیہ تھا۔

تیار ہوتے اس نے اگلے آنے والے چند لمحات کے سو سینیریوز اور ان کے حل نکال لیے تھے۔ وہ خود کو کام ڈاؤن کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا، سوچ رہا تھا، حالات کو سمجھ رہا تھا۔ مگر دل۔۔۔ دل شاید تارا کے اس پیغام پہ رک سا گیا تھا۔

مگر دل کی کبھی دوروس نے پرواہ نہیں کی تھی۔

دل کی اور دل والوں کی پرواہ تو ارمغان کرتا تھا۔ جس کا دل دنیا والوں نے اینٹوں کی طرح توڑ کے رکھ دیا گیا تھا کہ وہ واپس جڑ نہ سکا۔ جوڑنے کی ہمت باقی کہاں رہی تھی۔ نہ ارمغان میں، نہ دوروس میں۔

(لاہور، ماضی)

~نرم مزاج تھا حالات نے بنایا سخت ہے،

کوئی نہیں سگا میرا دیکھایا مجھے وقت نے

ارمغان اور ہادیہ گھر کی چھت پہ کھیل رہے تھے۔ یہ لاہور کی ایک حسین شام تھی، آسمان پہ جامنی، زرد اور گلابی رنگ کے امتزاج کی جیسے بادلوں کی چادر بچھی تھی۔ اور لاہور کی عام دھول اس جھلی جیسے تھی جو منظر کو اور خوبصورت بنانے لگی۔

لاہور حسین تھا۔ پھر بات ہو نئے لاہور کی یا پھر پرانے لاہور کی۔ کھلی کھلی چھت، صاف پکی چارکول کی سڑکیں اور ٹھنڈی ہواؤں میں ڈوبا شہر اپنی خامیوں پہ اپنی خوبصورتی کا پردہ ڈال دیتا تھا۔ پرانی دیواروں میں بہت سے پوشیدہ راز دفن تھے، اچھی اور بری یادیں۔

"میرے بہنوئی آئے ہوئے ہیں۔" ارمغان اسے کھیلتے کھیلتے بار بار چھیڑ رہا تھا، وہ بینچ پہ بیٹھے مسکرا رہی تھی، شرما رہی تھی۔

"کوئی شرما رہا ہے۔" وہ اپنی نئی آئی فٹ بال کو لات مارتے ہوئے کہہ رہا تھا جو اسے کچھ دیر پہلے ہی تحفے میں ملی گئی تھی۔ وہ دوپٹہ بار بار شانوں پہ درست کرتی کبھی روشن دان سے نیچے اپنے سسرال والوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ عظیم کو دیکھتی اور

جب ارمغان اسے پھر چھیڑتا تو وہ بہانہ بنا کر منہ پھیر لیتی۔شاید زندگی میں پہلی بار وہ اتنا کھل کے مسکرانے لگی تھی،زندگی کی پہلی خوشی پہ۔

پھر عظیم اوپر آگیا تو ارمغان چھت کی دوسری طرف چلا گیا اور ہادیہ اور وہ باتیں کرنے لگے۔

ہادیہ کی تاریخ پکی ہو چکی تھی۔تین ماہ بعد وہ رخصت ہو کر جہنم سے جنت میں جانے والی تھی۔ایک جہنم جیسے گھر سے اس کی جان چھوٹ رہی تھی۔ہاں وہ ارمغان کو مس کرے گی مگر جو اس کے ساتھ اس گھر میں ہوتا تھا وہ اس کی قوت برداشت سے پار ہو گیا تھا۔بس تین مہینے،بس تین مہینے بعد وہ جہنم سے ایک خواب نگر منتقل ہونے والی تھی۔خدا کی آزمائش ختم ہونے جا رہی تھی۔

ارمغان کے نویں جماعت کے بورڈ کے امتحانات دو ماہ پہلے ہی مکمل ہو گئے تھے،
پیر کٹکل بھی کچھ دنوں میں شروع ہونے والے تھے اور رزلٹ بھی جلد آنے والا
تھا۔اس کی بھی الگ زندگی تھی۔بہت خوش رہتا تھا وہ۔اس کی زندگی میں ایسا کچھ
تھا ہی نہیں جس پہ وہ دکھی یا مایوس ہوتا۔

پھر وقت وقت کی بات تھی،اسے فٹبال کا شوق ہو گیا۔عظیم کی لائی فٹبال سے وہ
گلی میں دوست جمع کر کے فٹبال کھیلتا،پھر اسکول کے انٹر کیمپس میں پلیئر آف دا
میچ جیت گیا۔

مگر اسے اب پروفیشنلی فٹبال کھیلنی تھی۔نو عمری کا شوق کب پیشن اور پھر جنون
بن گیا تھا اسے اندازہ نہ ہوا۔

ہفتے کی رات تھی۔ مطاہر آفس سے گھر جلدی آ گئے تھے۔ کھانا لگایا گیا تو سب نے ساتھ بیٹھ کر کھایا، معمول کی باتیں ہوتی رہیں، مگر ارمغان کا دماغ کہیں اور لگا ہوا تھا۔

کھانے کے بعد جب چائے بننے لگی تو وہ فوراً کچن میں داخل ہوا اور ہادیہ کے ہاتھ سے طشتری لی،

''آج میں لے کر جاؤں گا چائے۔'' اور وہ پیالی اٹھائے ابا کے کمرے تک چل دیا۔

چائے کی پیالی قریب رکھتے وہ اُن کے سامنے کھڑا رہا۔ ابا نے اس کی موجودگی پہ نظریں اخبار سے ہٹاتے ہوئے، چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا۔

"اباوہ۔۔۔ایک چیز کی اجازت چاہیے"اس نے مسکراتے ہوئے انہیں مخاطب تو وہ بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔

"ابا مجھے فٹبال اکیڈمی میں داخلہ لینا ہے، آپ نے اس دن مجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے زندگی میں آگے جا کر کیا بننا ہے۔۔۔تو ابا۔۔۔مجھے فٹبالر بننا ہے۔"

وہ جو اسے دیکھتے مسکرا رہے تھے، بے ساختہ ہنس دیے۔ارمغان انہیں حیرانی سے دیکھنے لگا۔

"فٹبالر کوئی بننے کی چیز تھوڑی ہوتی ہے۔ہاں شوق ہے،اچھا شوق ہے،اچھی سرگرمی ہے، مگر فٹبال انسان شوق میں کھیلتا ہے،یہ نہیں ہوتا کہ فٹبالر ہی بننے نکل جائے۔ فٹبالر بننے سے زندگی کامیاب نہیں ہوتی۔"

وہ نا سمجھی سے انہیں دیکھتا رہا۔

"ہاں تو مجھے کامیاب نہیں بننا،مجھے فٹبالر بننا ہے۔"

ابا چپ ہوگئے۔ان کے تاثرات سخت ہوتے گئے۔

"یہ اول فول کس نے تمہارے دماغ میں بیٹھایا ہے، ابھی اپنی پڑھائی پہ دھیان دو، پھر ڈاکٹری یا انجینئرنگ میں سے انتخاب کرنا۔ وہی ہوتا ہے اصل، اس سے ملتی ہیں نوکریاں۔ فٹبالر بن کے ایک سوکھی روٹی نہیں کما پاؤ گے۔ دوستوں کے ساتھ کھیلتے ہو، وہ کافی ہے۔ زندگی آگے بہت مشکل ہے، فٹبالر بننے نکلو گے تو زمانہ تمہیں فٹبال بنا کر ادھر ادھر پھینکتا رہے گا۔ جاؤ اب۔"

ان کے کمرے سے باہر نکلتے اسے پاؤں پہ ٹھوکر لگی تھی، دل پہ بھی۔ ارمغان کی فیری ٹیلز جیسی زندگی میں ایک زہریلا کانٹا آہی گیا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں کبھی 'نہ' نہیں سنا تھا۔

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اکیڈمی تو میں جاؤں گا۔“اس نے ارادہ کیا تھا۔

(لاہور، حال)

دوروس نے سر جھٹک دیا۔دماغ ایک سیکنڈ میں ماضی سے حال میں آگیا۔اس نے سیاہ چشمہ آنکھوں پہ درست کیا اور گاڑی کی چابی اٹھاتے گھر سے نکل گیا۔جہاں وہ جارہا تھا، وہاں وہ اکیلا جاتا تھا،اس کے راستے میں کوئی باڈی گارڈ نہیں ہوتا تھا۔

”ایرج از ڈیڈ۔“اسے بے ساختہ تارا کی بات یاد آئی تھی۔اس نے بے چینی سے گردن مسلی۔

"دس کانٹ بی ٹرو۔" اس نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔

~~~~~

(کراچی، حال)

ایرج کو گم ہوئے چوتھا دن آگیا تھا جب ارحم کراچی پہنچا۔ اس نے آسمانی رنگ کی ڈریس شرٹ پہ سیاہ پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ سلور لاکٹ کھلے گریبان سے جھانک رہا تھا اور فریم لیس گلاسز آنکھوں پہ جمے تھے، بال رف اینڈ ٹف سے، ماتھے پہ بکھرے ہوئے تھے، ہر بار کی طرح وہ آج بھی اتنا ہی پر کشش تھا۔
~~~~~

داخلی دروازے سے صحن پار کرتے وہ جاوید چاچو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ صحن اب بھی پچھلی رات ہوئی بارش سے بھیگا ہوا تھا۔ گیلی کچی مٹی کی خوشبو ہر سو پھیلی تھی۔ صحن پہ کچھ جگہ زمین سوکھ گئی تھی اور کچھ جگہ اب بھی نم سی۔

دروازے کے قریب پہنچتے ہی جاوید چاچو اور دانیال کی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔ ان کی باتوں کا موضوع ایرج ہی تھی۔ وہ بات کر رہے تھے، امید لگا رہے تھے، ایک دوسرے کو تسلی اور حوصلہ دے رہے تھے۔

کمرے کے وسط پہ ٹھہرتے ارحم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جاوید جو ہاتھوں سے اپنی سوجی اور آنسو سے پر آنکھیں مسل رہے تھے، اس کی طرف دیکھا۔ دانیال نے بھی اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں کچھ چمکا۔

جاوید نے ارحم کو شانوں سے لگایا اور ماتھا چوما، وہ بس مسکرا سکا۔ ان کی آنکھوں میں کوئی آس ٹھہری تھی جو صرف ارحم کو دیکھ کر ہوا تھا۔ کیونکہ وہ سب سنبھالتا آیا تھا۔ بچپن سے جوانی تک۔ وہ گھر کا بڑا تھا، سب سے بڑا نہیں تھا مگر ہر معاملے کو پرکھنا اور حل کرنا جانتا تھا۔ اسے آج تک کسی فرد پہ غصہ نہیں آیا تھا۔ نا اسے کسی نے غصہ کرتے دیکھا تھا۔ وہ اپنی الجھن، اپنی پریشانیاں خود تک رکھتا اور خود ہی اپنی الجھنوں کو سلجھا لیتا۔ وہ تو دوسروں کو سنبھالتا، ان کی مدد کرتا آیا تھا، اپنے مسئلے دوسروں کو بتا کر ان کو کیسے الجھا سکتا تھا؟

ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے حنا چاچی اور اپنی امی کا پوچھا تھا کیونکہ وہ اسے نہ کمرے میں دکھے، نہ صحن میں۔

جاوید نے اسے بتایا کہ وہ ایرج کے کمرے میں ہیں۔اور اس خیال پہ ہی کہ وہاں اب صرف ایرج کا کمرہ تھا۔۔۔اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔اس نے ایرج کے کمرے تک جانے کا خیال ترک کر دیا۔

"ابھی نہیں۔"اس نے سوچا۔

"اس کمرے میں قدم تب ہی رکھوں گا جب اس کمرے کا مالک مجھے اس کمرے میں آنے کی اجازت دے گا۔"

بار بار دل میں پکار گونج رہی تھی۔

وہ ایرج کو بچائے گا۔اسے معلوم تھا وہ ایسا کر سکتا ہے۔اسے امید تھی۔۔۔کم از کم امید تو تھی۔

دانیال کو ساتھ لے کر وہ فوراً گھر سے باہر آگیا۔

ایرج کراچی میں ہو گی۔وہ کہاں جا سکتی ہے۔اغواکار پیسے مانگیں گے،وہ انہیں دے دیگا۔مگر وہ رابطہ تو کریں۔ارمغان۔۔۔جس شخص نے ایرج کو پھنسایا تھا وہ ارمغان ہی تھا،اسے یقین تھا۔وہی اس کا اغواکار تھا۔اس نے پہلے ایرج کو پھنسایا ہو گا،اور پھر اغوا کر لیا ہو گا۔ہاں،ایسا ہی ہوا ہو گا۔مگر کوئی ثبوت،کوئی نشان نہ تھا۔اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ رہتا کہاں ہے۔

مگر وہ اسے بچا لے گا۔وہ ایرج کو بچا سکتا ہے۔

اسے امید تھی،اور ڈر بھی۔

~~~~~

(لاہور،حال)

”ابا میری بات سنیں۔۔۔۔پلیز۔۔۔۔۔ہاں میں جھوٹا ہوں۔۔۔میرے ساتھ یہ مت کریں۔۔۔۔دیکھیں۔۔۔۔۔دیکھیں میں نے اپنا جرم مان لیا۔۔۔دیکھیں میں جھوٹ بول رہا تھا مگر میں وہاں نہیں جاؤں گا۔۔۔۔“
~~~~~

گاڑی کے ٹائر سڑک پہ گھسے اور جھٹکا لگا تو اسے ہوش آیا۔اس کی گاڑی آدھی فٹ پاتھ پہ تھی اور آدھی روڈ پہ۔اس نے ذہن سے پرانی یادوں کی دھول کو پھونک مار کر اڑا دیا۔گاڑی کو ریورس کرتے واپس سڑک پہ چڑھایا اور خود کو ایک بار پھر کمپوز کیا۔لاہور اس کا شہر تھا۔مگر اسے لاہور سے نفرت تھی۔یہاں کی ہر چیز سے۔

موبائل پہ کسی کا نمبر ملاتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا۔

"آ گئے ہیں وہ؟"فون کے دوسری طرف سے کنیکٹ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

"یس باس۔ڈیلیورڈ۔وہ آ چکے ہیں۔جیسا آپ نے کہا تھا، بالکل ویسا ہی کیا جارہا ہے۔"

”مجھے ان سے کسی چیز کی شکایت نہیں ملنی چاہیے، وہ وی آئی پیز ہیں۔“اس نے کال کاٹتے ہوئے فون برابر والی سیٹ پہ ڈال دیا۔

ایک زخمی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بجھ گئی۔ بائیں طرف ایک ڈمپل ابھرا جو داڑھی کی وجہ سے اتنا واضح نہیں ہوتا تھا۔اسے داڑھی سے الجھن ہوتی تھی مگر صرف اس وجہ سے رکھی تھی تاکہ کسی کو اس کا چھوٹا سا ڈمپل نظر نہ آئے، خود اسے بھی نہیں۔اسے اس ڈمپل سے نفرت تھی، اپنی مسکراہٹ سے نفرت تھی۔

اسے تو۔۔۔

خود سے بھی نفرت تھی۔

مگر وہ جی رہا تھا، ایک امید کے سہارے۔

~~~~~

(کراچی، حال)

ارحم نے گاڑی کی رفتار کم کر دی تھی مگر اس کا بس چلتا تو تو گاڑی کو کسی کھمبے میں دے مارتا۔
~~~~~

کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔کچھ بھی نہیں۔

پولیس سے ایف آئی آر کٹوانے کے بعد بھی پولیس ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھی۔ اگر کاروائی چل رہی تھی تو کچھوے کی رفتار سے۔ چھاپہ مارنے تک میں انہیں موت آرہی تھی۔ بار بار ایک ہی بات دہرائی جاتی کہ کام چل رہا ہے، کاروائی ہو رہی ہے۔

ایرج بس ارحم اور اس کے گھر والوں کے لیے اہم تھی۔ پولیس والوں اور دیگر لوگوں کے لیے تو وہ ایک عام سی ہی لڑکی تھی جوان کے خیال سے یا تو اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا مر گئی ہے۔ایسی درجنوں رپورٹس تو روز معمول کے حساب سے درج ہوتی تھیں۔کام ایک پہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

پاکستان کا ایک اصول تھا۔اگر پیسہ آجاتا تو غیرت مر جاتی،اگر غیرت جاگ جاتی تو پیسہ جل جاتا۔

''سعد کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا،سارہ آپی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔اور اب ایرج آپی کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔میں ایرج آپی کو بچا سکتا تھا۔۔۔میں انہیں روک سکتا تھا۔پولیس کچھ نہیں کر رہی ہے،نا کچھ کرے گی۔۔۔چار دن ہو گئے ہیں بھائی۔۔چار دن۔اور تین سے زیادہ دن اغوا ہونے والے افراد کا ملنا بالکل ایسا کہ سمندر میں کنکر تلاش کرنا۔۔''

ارحم کے دل پہ کتنی چوٹ لگ رہی تھی اس کے چہرے سے واضح ہو رہا تھا۔اس کا چہرہ زرد ہو چکا تھا،دانیال کا چہرہ سرخ۔آنکھوں میں آنسو ٹھہرے ہوئے تھے اور دانیال کی انہیں نہ بہانے کی جنگ چل رہی تھی۔وہ بس دل کی باتیں اپنے دوست

جیسے بھائی کے ساتھ شئیر کر رہا تھا۔ مگر ارحم میں نہ اب سننے کی سکت رہی تھی، نہ کسی کو کنسول کرنے کی۔ وہ بس برداشت کر رہا تھا۔

"ہم سب کو کھوتے جا رہے ہیں۔ اور ہم کچھ نہیں کر رہے۔ سعد بھی ایسے ہی گم ہوا تھا، سارہ آپی بھی ایسے ہی مر گئیں تھیں۔۔۔ یہ کون ہے جو ہمارے گھر کے پیچھے ہے۔۔۔ کون ہے جو ہماری سانسوں کو ختم کرنا چاہتا ہے؟ ایرج آپی بھی۔۔۔ یہ کیوں ہو رہا ہے بھائی؟"

وہ اپنے بھائی سے سوال کر رہا تھا۔ مگر اس کے پاس کوئی جواب ہی نہیں تھا دینے کے لیے۔

سورج سر کے اوپر چمک رہا تھا، دل مغرب کے سورج کی طرح ڈوب رہا تھا۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے، مگر فاطمہ منزل تو اب زندہ قبرستان بن چکی تھی۔

~~~~~

(لاہور، حال)

سلائڈنگ ڈور سے اندر داخل ہوتے اس کے قدموں میں لرزش پیدا ہوئی تھی۔ وہ جواب تک خود کو کمپوز کرتے آرہا تھا، اب ایک عجیب سا کھنچاؤ تھا جو دل میں محسوس ہونا شروع ہوا۔ سب آسان لگ رہا تھا، مگر جیسے جیسے وہ حقیقت کے قریب آرہا تھا، سب اتنا آسان نہیں لگ رہا تھا۔
~~~~~

قدموں میں تیزی آگئی۔آج خلاف توقع اس نے ریسپشن پہ جا کر سلام اور حال نہیں پوچھا تھا بلکہ وہ تیزی سے لفٹ کی بجائے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

"ایرج از ڈیڈ۔"تارا کے الفاظ دل پہ بھاری ہوتے جا رہے تھے۔وہ چاہ کر بھی ان کو جھٹک نہیں پا رہا تھا۔وہ ایرج کو دیکھنا چاہتا تھا؟کیا تبھی اسے تارا کی بات پہ یقین آنا تھا؟یا شاید وہ یقین کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔شاید وہ ایرج کو دیکھنا چاہتا تھا،مگر مردہ نہیں۔

عجیب معاملہ ہے دل کا،

پہلے کھائی سے بچاتا ہے،

پھر بچا کر اسی میں گراتا ہے،

پہلے طبیعت بڑھاتا ہے،

پھر مزاج سے جوگ دلاتا ہے،

پھر محبت کے دھاگے بنواتا ہے،

اور پھر روگ بھی خود ہی لگاتا ہے،

پھر عشق کے لیے تڑپا کر،

عاشق بھی بنواتا ہے،

عجیب معاملہ ہے دل کا،

خود بھی نہیں جانتا ہے کہ،

آخر خود کیا چاہتا ہے۔

کاریڈور کے آخری کمرے تک پہنچتے اس کی سانسیں پھول گئی تھیں۔ماتھے سے پھسلتا پسینہ شرٹ کے کالر پہ ٹپک رہا تھا۔اس نے ماتھے سے بال ہٹائے اور شرٹ کا ایک اور بٹن کھول دیا۔کندھے سے جھانکتا ڈریگن اب واضح ہو رہا تھا۔

اس نے دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کے اندر کے طرف دھکیلا،دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ایک ایک کر کے منظر میں شامل چیزوں پہ نظر پڑنے لگی۔

کمرہ بالکل سفید تھا۔سکون دہ۔کونے پہ ایک بیڈ تھا اور ساتھ ایک دراز اور ٹیبل۔ برابر میں واش روم تھا اور بیڈ کے سائڈ پہ ایک کرسی تھی۔اس نے پہلے کرسی کی طرف دیکھا،وہاں تارا ٹانگ پہ ٹانگ جمائے،کانوں میں ائیر فونز ٹھوسے،مزے سے فون پہ کچھ دیکھ کر دھیمی ہنسی ہنس رہی تھی۔

دروازہ کھل کے جب پیچھے دیوار سے ٹکرایا تو تارا کی نظر دروازے کے ساتھ کھڑے وجیہہ شخص پہ پڑی جو اس کے برابر بیڈ پہ پڑے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی نظریں تارا تک آئیں۔ اس کی آنکھوں میں بہت سے سوالات واضح تھے۔ آنکھیں حیرت زدہ، تھکی اور بیزار سی تھیں۔

"یہ سانس لے رہی ہے۔۔۔ شی از فائن۔" وہ کہہ تو تارا سے رہا تھا مگر یاددہانی خود کو کروا رہا تھا۔ جیسے خود کو تسلی دے رہا ہو۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی، کسی کھائی سے آتے ہوئی۔

دوروس کی شکل دیکھتے ہی تارا کا قہقہہ چھوٹا تھا جسے وہ روک نہیں پائی۔

"واٹ از دس؟" اس کی آنکھوں میں انجان سا غصہ تھا، بیزاریت بھی۔

”ٹائم دیکھا ہے آپ نے؟ نیند سے اٹھانے کا اور یہاں لانے کا واحد راستہ یہی تھا۔“
وہ ٹانگ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کھڑی ہوئی، اب بھی مسکرا رہی تھی۔

”تم سیریس نہیں ہو سکتی۔۔۔ میں تمہیں فائر کر رہا ہوں۔“ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتے ہوئے اس نے گہری سانس بھری۔

”لک، میرا آئیڈیا کام بھی کر گیا۔“ وہ فاتحانہ سا مسکرائی۔

”میں اٹھ گیا تھا۔۔۔ آ رہا تھا میں آفس۔۔۔“

"تم اس کی اتنی کئیر کیوں کرتے ہو، دوروس؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے اس نے سوال کیا تھا، مسکراہٹ اب چہرے سے غائب ہو گئی تھی۔

"کیونکہ یہ میرا مارک ہے۔" اس نے ایرج کو بیڈ پہ لیٹے گہری سانسیں لیتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ چمکا تھا۔

"اور بھی مارک ہیں تمہارے، مگر تم اس کی کئیر سب سے زیادہ کرتے آئے ہو۔ میں نوٹ کر لیتی ہوں۔۔" وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ایسا نہیں۔۔۔"

''ڈویو لو ہر؟'' تارا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''آئی ہیٹ ہر۔'' اس نے فوراً سے چہرہ پھیر کر تارا کی طرف دیکھا۔ چہرے پہ تاثرات پل میں پتھر ہو گئے تھے۔

''اگر نفرت کرتے تو اتنی کئیر نہیں کرتے۔ خیر اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو میں۔۔۔''

''میں ایرج سے نفرت کرتا ہوں، مگر میں اس کی حفاظت کروں گا۔'' اس نے بہت دھیمے لہجے میں ایرج کو دیکھتے ہوئے کہا تھا، جیسے تارا کہ بجائے ایرج سے مخاطب ہو۔

''لگتا ہے کوئی طویل خواب دیکھ رہی ہے۔''اس نے ایرج کے چہرے کو اب بغور دیکھا تھا۔

''مجھے لگتا ہے تم بھی کوئی طویل خواب دیکھ رہے ہو۔''تارا نے نظریں فون پہ جھکا لیں۔دوروس اسے دیکھتا رہا۔

''خیر،وہ آ گئے ہیں۔میٹنگ میں آدھا گھنٹہ رہتا ہے۔''تارا اس کو کراس کرتے دروازے کی طرف بڑھنے لگی کہ دوروس نے اسے پکارا۔

"تارا، تم ایک قابل اور ذہین ساتھی ہو میری۔ میرے ساتھ بہت عرصے سے کام کر رہی ہو۔ مگر میرے ساتھ آئندہ ایسا مذاق نہیں کرنا۔ یو کین لیو ناؤ۔" اس کی نظریں واپس ایرج پہ آ گئیں۔

"آف کورس، مسٹر وہیپٹ۔"

اور اس سے پہلے کے دوروس اس کا قتل اسی وقت سر انجام دیتا، وہ ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

دوروس اکیلا کھڑا رہ گیا۔ گہری سانس لیتے ہوئے وہ کرسی پہ آ بیٹھا اور فون نکال کر کسی کا پیغام پڑھنے لگا۔ وقفے وقفے سے اس کی نظریں سامنے بیڈ پہ آٹھ جاتیں جنہیں وہ فوراً جھکا دیتا اور واپس فون پہ غور کرنے لگتا۔

~~~~~

(کراچی،حال)

ایک نئی صبح،ایک نئی مسافت

ارحم گاڑی چلاتے کسی سوچ میں گم تھا جبکہ برابر بیٹھا دانیال کھڑکی سے باہر دیکھتے کل رات موصول ہوئی کال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
~~~~~

پچھلی رات ارحم کو ایک کال موصول ہوئی تھی۔اس شخص نے انہیں ایڈریس بھیجا اور وہاں آنے کا کہا۔ساتھ اپنا نام بتایا۔ارحم نہ اسے اس کی آواز سے پہچان پایا تھا،نہ اس کے انداز گفتگو سے۔وہ شخص بہت صاف گو اور سیدھی بات کرنے والا تھا۔ آواز بھاری تھی اور اس میں عجیب سا تاثر تھا جو ارحم کے ذہن پہ نقش ہوتا چلا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایرج کے بارے میں کچھ جانتا ہے اور ان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس کی آواز،اس کے لہجے میں ایک امید تھی جو ارحم اور دانیال کے ساتھ ساتھ جاوید،حنا اور مریم کے دل سے بھی جڑ گئی تھی۔

وہ شخص جھوٹا بھی ہو سکتا تھا۔۔فریب کار اور غلط انسان بھی ہو سکتا تھا۔مگر پتا نہیں کیوں،وہ مسیحا لگتا تھا۔۔ایسا فرشتہ جو مدد کرنے آیا ہو۔اور جس حالات میں ارحم اس وقت تھا،وہ اس شخص کا یقین فوری طور پہ کر چکا تھا۔

دھوپ کے باعث دانیال نے چہرہ گاڑی کے اندر کر لیا۔ڈیش بورڈ پہ ایک چھوٹی سرمئی پستول رکھی ہوئی تھی۔کچھ بھی ہو سکتا تھا جہاں وہ جا رہے تھے۔انہیں اپنی حفاظت میں کوئی کمی نہیں رکھنے چاہیے تھی۔

ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ ایک ڈھکے چھپے علاقے میں پہنچ گئے جو لیاری سے تھوڑے اندر جا کر تھا۔گلیاں بہت تنگ تھیں۔سڑکیں چند دن پہلے ہوئی بارش کی وجہ سے پانی اور کیچڑ میں گم ہو گئی تھیں۔اتنے گڈھوں کے باعث ارحم کو گاڑی گلی سے تھوڑے دور پارک کرنی پڑی۔

دونوں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے گلی میں داخل ہو گئے اور گھر گھر کا نمبر دیکھنے لگے۔

چھوٹی سی پستول بیلٹ میں مہارت سے پھنساتے ہوئے اس کی نظریں ہوشیار تھیں۔اس نے آج سفید ٹی شرٹ پہ سرمئی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔جبکہ دانیال ٹی شرٹ اور ٹراوزر میں تھا۔

گلی کے آخری گھر سے پہلے ایک سفید دروازے والا خستہ سا مکان تھا جس کی دیواریں بے رنگ تھیں اور سیمنٹ اور پتھر دکھ رہے تھے۔اس مکان کا نمبر ایڈریس والے نمبر سے مل گیا تو وہ دونوں سامنے آگئے اور ایک نظر اوپر سے نیچے اس مکان کو دیکھا جو گھر جیسا لگ رہا تھا۔دانیال نے آگے بڑھ کے گھنٹی بجائی۔

پہلی گھنٹی پہ کوئی باہر نہیں آیا۔دانیال نے دوسری گھنٹی بجانے کے لیے قدم بڑھائے مگر تبھی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

دروازے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ایک لڑکی سامنے آئی۔اس نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ تھامااور منہ چھپالیا۔

"جی۔۔؟ کس سے ملنا ہے آپ کو؟"اس لڑکی نے،جو سفید رنگت اور شفاف چہرے سے پچیس چھبیس سال کی لگ رہی تھی،جس کی آنکھیں سرمئی تھیں اور اس نے جامنی کامدار جوڑا پہنا ہوا تھا،ارحم سے پوچھا۔

"ہمیں یہاں بلایا گیا ہے۔"ارحم نے نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔

"کس نے بلایا ہے؟"دروازہ کھولنے کے بجائے اس نے پھر سوال کیا۔

اس کے سوال پہ ارحم نے اس شخص کا نام سوچا جس نے اسے کل کال پہ اپنا نام بتایا تھا،اسے وہ نام یاد تھا۔

"ایس پی حیدر ذوالفقار نے۔"

اس نے بہت ہلکے سے کہا اور پھر ارحم نے اس لڑکی کو دیکھا جس کی آنکھیں اس کے نام لینے پہ پل بھر کو چمکی تھیں۔ان سرمئی آنکھوں میں کچھ عیاں ہوا تھا جسے وہ جانچ نہیں پایا۔

لڑکی نے کوئی اور سوال کئے بغیر دروازہ کھول دیا اور خود ایک طرف کھسک گئی۔

وہ اندر آئے تو انہیں مکان کا اصل اندازہ ہوا۔ گھر باہر سے جتنا خستہ اور کچا لگ رہا تھا اندر سے اتنے ہی اچھے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ شاید اس کا کام چل رہا تھا اسی لیے باہر سے وہ ایسا تھا۔ داخلی دروازے سے سامنے ایک لمبی راہداری تھی اور چند کرسیوں پہ اکا دکا عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ دیواروں پہ رنگ برنگی تصویریں آویزاں تھیں جو اکثر اسکول و مدارس میں لگائی جاتی ہیں۔ داخلی دروازے کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں جو دوسری اور پھر تیسری منزل تک جاتی تھیں۔

''سیکنڈ فلور پہ سامنے والے کمرے یا پھر آفس میں ہونگے وہ۔'' ارحم نے غور کیا تھا کہ اس لڑکی کی آواز بہت پھٹی پھٹی سی ہے، جیسے کسی مرد کی بھاری آواز ہوتی ہے۔ اس لڑکی کے بال ڈھکے ہوئے تھے مگر جھلکیوں سے واضح ہوتا تھا کہ اس کے بال گہرے بھورے اور لمبے ہیں۔

وہ دونوں ایک کے بعد ایک سیڑھی پھلانگتے ہوئے دوسری منزل تک پہنچ گئے تھے۔ ارحم کا ہاتھ پینٹ میں چھپی پستول پہ بار بار پہنچ رہا تھا۔

دوسری منزل تک پہنچتے جو سب سے پہلی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی وہ بچوں کے بے ہنگم شور شرابے اور اساتذہ کی زوردار آواز میں کوئی سبق پڑھانے کی تھی۔ جیسے وہ واقعی کوئی اسکول تھا اور وہاں کلاسز چل رہی تھیں۔ دوسری منزل پہ دو الگ الگ کاریڈورز نمارا ہیں تھیں جن کے شروع میں ایک کمرہ تھا اور سیڑھی کے پاس ایک آفس تھا۔

آفس کے اندر دو لوگ کسی بات میں مصروف تھے۔ ایک شخص ڈیسک پہ جھکا کوئی کاغذات دیکھ رہا تھا اور دوسرا شخص ڈیسک کی کرسی پہ براجمان تھا۔

ارحم نے جیسے ہی دروازے پہ دستک دی۔ڈیسک پہ جھکا ہوا مردان کی طرف مڑا۔ اوراس کا چہرہ اور جسم ان دونوں کو واضح ہوا۔

وہ کوئی تیس سے اوپر کی عمر کا نوجوان تھا جس نے کریم کلر کی ڈریس پینٹ پہ سفید رنگ کی ڈریس شرٹ پہن رکھی تھی۔کالر کا بٹن کھلا ہوا تھااور گردن سے کریم کلر کی ٹائی لٹک رہی تھی جس کا ناٹ ڈھیلا تھا۔شرٹ کی آستینیں کہنیوں سے تھوڑے نیچے تک فولڈ تھیں۔

اس شخص کی رنگت گندمی تھی اور چہرے کے نقوش لوہے کی دھار کی طرح سخت۔ماتھے سے آنکھوں کو پار کرتے،اور لبوں تک ایک بہت ہلکا سا نشان تھا جو کسی بہت پرانے زخم کی نشاندھی کررہا تھا جسکا اب صرف نشاں رہ گیا ہو۔چہرے پہ موجود ہلکی سیاہ داڑھی جو نفاست سے تراشی ہوئی تھی۔

بال چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے تھے جو زیادہ تر سیاہ تھے مگر سفید بالوں کی جھلک دکھ رہی تھی۔

اس شخص کو جو چیز سب سے منفرد بنا رہی تھی، وہ اس کی آنکھیں تھیں۔اس کی آنکھیں دور سے تو سیاہ لگتی تھیں مگر وہاں کھڑے اس کی آنکھوں پہ کھڑکی سے آتی سورج کی روشنی اُن کا اصل رنگ واضح کر رہی تھیں۔

اس کی آنکھیں کسی گہرے سمندر کی طرح نیلی تھیں۔بے حد گہری۔اور اس کی شخصیت بھی کسی ٹھہرے سمندر جیسے تھی۔خاموش، یخ بستہ، گہری۔

"آپ ارحم ہیں، رائٹ؟" وہ جب بولا تو اس کی آواز بے حد بھاری تھی۔ اور اس کا دھیما اور خاموش لہجہ اس کی آواز کو اور گہرا کرتے جا رہا تھا۔ وہ ایسے بولتا تھا جیسے سرگوشیوں میں بات کر رہا ہو۔

"اور آپ۔۔۔"

"ایس پی حیدر ذوالفقار۔" اس نے دانیال کے سوال کا جواب سوال مکمل ہونے سے پہلے دے دیا تھا۔

"میرے ساتھ چلیں۔" وہ ڈیسک پہ بیٹھے شخص کو اشاروں میں کچھ کہتا آفس سے نکل گیا اور ارحم سے مختصر گفتگو کرنے لگا۔ دانیال کو ان دونوں نے اپنی باتوں سے ایسے نکال باہر کر دیا تھا جیسے بریانی میں الائچی۔

وہ تینوں اب ساتھ چل رہے تھے، حیدر اور ارحم ہم قدم بات کر رہے تھے اور دانیال ادھر ادھر کا جائزہ کے رہا تھا۔

امید، شاک، خوف اور اطمینان کی ایک عجیب سی کیفیت تھی جو دانیال کے ذہن میں بیٹھتی جا رہی تھی۔

~~~~~

(لاہور، حال)
~~~~~

کاریڈور کی جانب بڑھتے ہوئے اسے آفس میں عجیب سی ایک چھٹی حس محسوس ہوئی تھی کہ کچھ غلط تھا۔۔۔کچھ ہوا ہو، کچھ غلط۔

اس نے ذہن سے خیالات جھٹکتے ہوئے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور لفٹ کی طرف قدم بڑھائے۔

یہ ہیرامنڈی سے فاصلے پہ ایک جگہ کی عمارت تھی جس کی دیواریں پست اور مضبوط تھیں۔پوری عمارت گہرے سفید رنگ میں رنگی ہوئی تھی مگر اس عمارت کے اندر تمام کام سیاہ ہوتے تھے۔

دوروس ابھی تیسری منزل کے کاریڈور میں چل رہا تھا۔اس منزل پہ صرف تین کمرے تھے۔اور اس منزل تک آنے کی اجازت دوروس تک محدود تھی۔

ان تین کمروں میں سے دو کمروں کے دروازے سیاہ تھے۔اوران کے درمیان میں جو کمرہ تھا،اس کے دروازے کا رنگ سرخ تھا۔

ایک وی آئی پی میٹنگز کے لیے۔

ایک کولڈ روم تھا۔جہاں کیمیلز کے ڈرم ہوتے تھے تاکہ بوڈی ڈسپوز ہو جائے۔

اور تیسرا۔جو سب سے منفرد تھا۔وہ ریڈ روم تھا۔

وہ کاریڈور کے آخری والے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ سیاہ دروازے کے قریب آیا اور دروازہ کھولا۔ یہ واحد کمرہ تھا جس کی دیواریں سیاہ تھیں۔ اس کمرے میں کوئی روشنی نہ تھی نہ کوئی بلب۔ کمرہ ایک چوکور ساڈبہ لگتا تھا جس کی ایک دیوار کے بالکل اوپری کونے پہ ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو برائے نام روشنی کا ذریعہ تھی۔

یہ میٹنگ روم تھا۔ یہاں باسز، لیڈرز اور بائیرز کی میٹنگز ہوتی تھیں اور ان میٹنگز کا ایک وقت مقرر تھا۔ ہر میٹنگ صرف دن کے وقت تین بج کر دو منٹ پہ ہوتی تھی۔ ہر ملاقات کا ایک ٹائم لمٹ تھا۔ صرف چار منٹ۔ نہ ایک سیکنڈ اوپر، نہ ایک سیکنڈ نیچے۔ کیونکہ یہ وہ واحد وقت تھا جب اس کھڑکی سے آتی سورج کی روشنی کا زاویہ سیاہ کمرے کے درمیان رکھی ٹیبل پر ہوتا تھا۔ ٹیبل کے آمنے سامنے دو کرسیاں تھیں۔ سورج کی روشنی صرف ٹیبل کو چمکاتی تھی، اس کی روشنی کرسیوں تک نہیں آتی تھی۔ کرسیاں سائے میں رہتیں جبکہ ٹیبل روشن۔ اس سے وہاں بیٹھے

لوگوں کے چہرے واضح نہ ہوتے۔ٹیبل کی روشنی صرف اس لیے کام آتی تاکہ روشنی کے بدولت دیکھا جاسکے اور پیسے دیے اور لیے جاسکیں اور ان کو روشنی میں گنا جاسکے۔یا تو دھمکانے کے لیے پستول کا برانڈ شو آف کیا جاسکے یا کانٹریٹ پیپر پہ دستخط کیے جاسکیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا جو خود بخود لاکڈ ہو گیا۔کمرے میں اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔بس ایک لمبی سی میز پہ روشنی کی کرن پڑ رہی تھی۔وہاں دو وجود بیٹھے تھے،وہ اُن کی موجودگی کو محسوس کر سکتا تھا۔

دوروس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے،پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے میز تک آیا۔اس کا کوٹ غائب تھا اور ابھی وہ صرف ڈریس پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھا

حالانکہ شرٹ کے کلف بند تھے۔دونوں ہاتھ کلائی تک چھپے ہوئے۔وہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ اور وجیہہ لگ رہا تھا۔

گھپ اندھیر کمرے میں قدم بڑھاتے وہ ایک کرسی پہ براجمان ہو گیا۔اس کے سامنے دو وجود تھے جن کو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا مگر محسوس کر سکتا تھا۔اُن کے نقوش تھوڑے تھوڑے واضح ہوئے تھے۔کھڑکی سے آتی روشنی واحد راہ نور تھی۔

''وہ کہاں ہے؟''اس زنانہ آواز سے اندازہ ہوا تھا کہ ان دو میں سے ایک عورت ہے۔

''ریسٹنگ۔''دوروس نے یک لفظی جواب دیا۔

”ہمیں اس سے ملنا ہے۔“اندھیروں میں سے دوسرے وجود کی آواز آئی۔وہ مردانہ تھی۔

”ابھی نہیں۔وہ سو رہی ہے۔“دوروس نے پر سکون لہجے میں کہا۔

”ہمیں اس سے ملنا ہے،ابھی!“اس عورت نے آگے جھکتے ہوئے ٹیبل پہ ہاتھ مارا جس سے کمرے میں آواز گونجی۔دوروس نے دیکھا مرد نے عورت کے شانے تھامے تھے۔

''آپ لوگ ریسٹ کریں۔جب وہ ہوش میں آجائے گی،میں آپ لوگوں کو اس سے ملوادوں گا۔'' وہ کہہ کر اٹھ گیا۔اس کی جیب میں ایک سیل فون بج رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کا وجود گم ہو گیا۔کرسی پہ بیٹھے وجود خلاء میں دیکھتے رہ گئے۔

چار منٹ کی ملاقات میں دوروس نے کوئی بھی ایسی میٹنگ نہیں کی تھی جو تیس سیکنڈ میں مکمل نا ہو گئی ہو۔

~~~~~

(کراچی،حال)
~~~~~

اب وہ دونوں ایک بیڈروم نما کمرے میں آ گئے تھے۔ایک سنگل بیڈ، برابر میں ایک اسٹڈی ٹیبل۔دیوار کے کونے میں الماری تھی اور گیلری کے دروازے کے پاس بھی ایک چھوٹی سی ٹیبل تھی جس پہ قرآن مجید اور چند کتابیں سیٹ ہو کر رکھی ہوئیں تھیں۔ گیلری کے دروازے کے برابر ایک کھڑکی، جس کا پردہ کھلا ہوا تھا ایک دھوپ چھن کر آتی حیدر کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔وہ گرل پکڑے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا،ارحم اور دانیال اس کی پشت۔

وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ کھلے دروازے پہ دستک ہوئی۔حیدر نے چہرہ موڑ کہ دیکھا،اور اس کے چہرے پہ کوئی سایہ سا گزرا،اس کی نیلی آنکھوں میں سمندر سی لہریں اٹھیں جو ظاہر ہونے سے پہلے ہی بیٹھ گئیں۔

دروازے کے قریب وہی لڑکی کھڑی تھی جس سے ارحم اور دانیال پہلے ملے تھے۔ اس نے اب بھی وہی لباس پہنا ہوا تھا بس ایک شال اوڑھ لی تھی اضافی۔

''روم ٹین میں آپ کو بلا رہے ہیں۔''اس کی آواز سنتے ہی انہوں نے حیدر کو دیکھا۔اس کے چہرے پہ مسکراہٹ سی تھی۔پھر اس نے ارحم اور دانیال کو دیکھا تو مسکراہٹ فوراسمٹ گئی۔وہ اُن کی سوالیہ نظریں دیکھتے ہوئے گویا ہوا؛

''شی از۔۔۔۔شی از النساء''وہ کہتے ہوئے ہچکچایا تھا اور پھر اس کی طرف،اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

اس کی سرمئی آنکھوں میں شعلے اٹھ رہے تھے۔اس نے دانت کچکچائے اور لب بھینچ لیے تھے۔اچانک سے ایک عجیب سی کیفیت اس ماحول پہ طاری ہونے لگی کہ وہ لڑکی فوراً رخ موڑ کہ دوسری طرف بڑھ گئی،اور وہ تینوں اسے جاتا دیکھتے رہ گئے۔

حیدر نے ہاتھ مٹھی بناتے ہوئے ڈیسک پہ جمادیے اور واپس کھڑکی کے پار دیکھنے لگا۔

ارحم اور دانیال وہاں کسی بت کی طرح بس شو دیکھ رہے تھے،انہیں کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ کونسی جگہ تھی اور یہ کون سے لوگ تھے۔

سامنے کھڑے مرد نے ایک ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ اور ڈھیلی کی اور بٹن کھولا۔گہری سانس بھرتے ہوئے وہ کہنا شروع ہوا۔

”مجھے نہیں پتا ایرج کا آپ لوگوں سے کیا رشتہ ہے مگر مجھے علم ہوا ہے کہ آپ لوگ اس کی تلاش میں ہیں۔“

اس نے چہرہ موڑ کہ ان دونوں کو باری باری دیکھا۔

”اور مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔“

~~~~~
~~~~~

(لاہور، حال)

کاریڈور میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس نے ہاتھ میں پکڑے فون پہ نمبر اور نام دیکھا، ایک نظر آفس کے ماحول پہ دوڑائی۔ ہر جگہ ایک افراتفری پھیلی تھی۔ شیشے سے باہر وہ اپنی مینیجر، حیات کو کبھی ادھر، کبھی ادھر بھاگتے دیکھ رہا تھا۔

اس نے کال کا ہرا بٹن دبایا اور فون کان اور گردن سے پھنساتے ہوئے ہاتھوں کے کلف کھولے، آستینوں کو کہنیوں تک فولڈ کرتے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو بغور دیکھا۔

دونوں ہاتھوں پہ کلائی سے کہنیوں تک الگ الگ زاویوں سے آڑھے ترچھے کٹس لگے ہوئے تھے۔ کچھ نئے، کچھ پرانے زخم، کچھ چھوٹے، کچھ بڑے زخم۔

وہ اب بھی سیلف سیڈ سٹک تھا، اسے بلیڈز اور نوکیلی چیزوں سے خود کو درد دینے میں آرام حاصل ہوتا تھا۔

سیلف ہارم انسان اس سکون، اس لطف کے لیے کرتا ہے کہ جب وہ اپنے ہاتھ پہ کٹ لگائے اور نس پھٹے، نس کے پھٹنے سے ایک نرمی اور گرماہٹ کا احساس انسان کو سکون دیتا ہے کیونکہ اس چھوٹے سے لمحے میں خون اپنا راستہ جلد سے باہر بنا رہا ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ سیلف ہارم کے لیے کلائی سے تھوڑے اوپر والی جگہ کا انتخاب کرتے ہیں کیونکہ وہ سخت اور نرم دونوں ہوتی ہے۔ سیلف ہارم کے لیے کبھی بھی ہتھیار استعمال نہیں ہوتا، جیسے کہ چھری۔ سیلف ہارم زیادہ تر کم نقصان دہ چیزوں سے کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ شارپنر کا بلیڈ، چشموں کا شیشہ اور کانٹا۔ اس سے

اسکن آہستہ آہستہ پھٹتی ہے اور کٹ لگنے میں اور خون نکلنے میں وقت لگتا ہے جس سے انسان کو زیادہ آرام ملتا ہے۔

دوروس نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے فون ہاتھ سے پکڑا۔ ہاتھوں میں اور پورے جسم میں جلن ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بار بار گردن اور ہاتھ مسل رہا تھا۔ پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا۔

"جو میں نے سنا ہے، کیا وہ سو فیصد درست خبر ہے؟"

وہ پر سکون لہجے میں بولا تھا۔ جبکہ دل تیز رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

"ہاں." دوسری طرف سے جواب آیا تو اس نے فون کان سے ہٹا لیا۔اس کے دل اور دماغ میں پہلی بار ڈر بیٹھا تھا۔موت کا ڈر۔

کیا ہوا اگر اسے ہوش نہیں آئے۔۔۔

کیا ہوا اگر وہ اسے سب نہیں بتا پائے؟

کیا ہوا گر وہ کچھ کہنے سے پہلے ہی مر جائے؟

نہیں۔۔۔وہ ایسے نہیں مرنا چاہتا تھا،اسے موت قبول تھی، مگر ایک پر سکون اختتام کے ساتھ۔

وہ ابھی نہیں مر سکتا۔

ابھی نہیں۔

اس نے فون پہ ایک اور نمبر ملایا۔

"پلین ہائی جیک کروانی ہے،امید ہے تم اس کام میں ماہر ہو گے۔" کال کنیکٹ ہوتے ہی اس نے کہا تھا۔

~~~~~

(کراچی،حال)

"مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔"
~~~~~

وہ اب بھی دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا جو بت بنے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"اور صرف ایرج اغوا نہیں ہوئی ہے۔ایرج کے علاوہ چالیس عورتیں اور بچے ہیں جو پچھلے پانچ سالوں میں اغوا ہوتے گئے ہیں۔"

اس نے سانس لینے کا وقفہ لیا۔ارحم اور دانیال کی جیسے سانسیں رک چکی تھیں۔

"ایک پولیس آفیسر ہوتے ہوئے مجھے یہ کہتے افسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کی پولیس،خاص کر کہ کراچی کی،چلان کاٹنے کے لیے ہر وقت،ہر جگہ موجود ہوتی ہے مگر چھاپہ مارنے اور فورینسک نکالتے انہیں موت آتی ہے۔آپ کی درج کی گئی ایف-آئی-آر پہ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے کام کیا جائے گا،اگر ان میں وکٹم مل گیا تو واہ واہ،اور نہیں ملا تو منہ پہ آپ کو خدا حافظ کہہ دیا جائے گا۔آپ زیادہ پیسے مانگنے

نکلیں گے تو یہ تو الزام آپ کے اوپر آئے گا، یا پیسوں کا ریل پیل لگانے کا کہا جائے گا۔"

ارحم نے کرسی کا کونا تھام لیا، حیدر نے منہ موڑ لیا، دانیال نے سر جھکا لیا۔

"یہ ریسکیو اور لرننگ سینٹر ہے، پرائیوٹ۔ جن سب کو آپ نے اب تک دیکھا ہے وہ تمام ریپ اینڈ اسالٹ وکٹمز ہیں، بشمول بچے اور بوڑھے، لڑکے اور لڑکیاں۔ ہمارے معاشرے میں پیڈوفائلز اور ریپسٹ پائے جاتے ہیں، ہر دس میں سے تین لوگوں نے کسی نا کسی طریقے سے وائلنس اختیار کیا ہوتا ہے، چاہے وہ گھر ہو یا ورک پلیس۔"

اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور ارحم کی آنکھوں میں کچھ جل رہا تھا۔ شاید نفرت، شاید بدلے کی آگ۔۔۔ یا شاید کچھ اور۔ اسکے جسم پہ کچھ رینگا تھا۔۔۔

"ڈیڑھ سال کی کوشش کے بعد ہم نے ایرج کے ساتھ ساتھ ان چالیس وکٹمز کو بھی مارک کر لیا ہے جو پچھلے پانچ سالوں سے گم ہیں۔ ان میں ایرج کا سب سے آخری اور نیا نمبر ہے۔"

اس نے دونوں کے تاثرات دیکھنے کے لیے پھر چہرہ موڑا۔

"وہ ٹھیک ہیں؟" اب کی بار دانیال نے پوچھا تھا جبکہ ارحم کسی سوچ میں گم تھا۔ ان دونوں کا خیال تھا وہ کوئی تاوان والے اغوا کار ہیں، ان کا خیال تھا ایرج کراچی میں ہے۔۔۔

"میں جھوٹی امید اور دلاسہ نہیں دے سکتا۔ ہم انہیں ٹریک کر رہے ہیں، وہ ہیرا منڈی اور لاہور کے نہایت چھپے ہوئے علاقے میں بس رہے ہیں۔" اس نے سر جھکایا۔

"مگر۔۔۔یہ سب کون چلا رہا ہے۔"

"یہ بزنس ہے۔ جیسے ڈیٹنگ ایپس ہوتی ہیں، یہ کاروبار ہے۔ یہاں سے ڈارک ویب کا لنک بھی جڑتا ہے، اس کو کوئی ایک آدمی یا پارٹی نہیں چلا رہا، بلکہ سب نے اس میں اپنا حصہ لیا ہوا ہے اور گروپس میں بٹے ہوئے ہیں۔ کچھ گروپس پیڈوفائلز کے ہیں جو بچوں پہ تشدد کے پیسے دیتے ہیں، کچھ پورن اڈکٹ ہیں جو پورنوگرافی کے لیے پیسے دیتے ہیں، کچھ سیڈسٹک ہیں جو دوسروں پہ ٹارچر کرواتے ہیں۔ اور

کچھ سیلف سیڈسٹک ہیں جو خود پہ ٹارچر کر کے پیسے کماتے ہیں۔ یہ سب، یہ سارے وکٹمز، یہ سارے معصوم لوگ "مال" ہیں، یہ اسمگل ہوتے ہیں، بینکاک، ہانگ کانگ، ٹوکیو، نیپال، اوہایو اور نجانے کہاں کہاں۔ سمجھو یہ ایک سوسائٹی ہے، جیسے syndicate ہوتی ہے۔"

امید بھی کیا شے ہے،

جھوٹ اور تسلی کے درمیان،

ڈگمگاتے رہتی ہے،

دل کی دو شاخوں کو،

ایک دھاگے سے باندھے رکھتی ہے۔

"مگر ہماری مدد کیوں کر رہے ہیں آپ؟" تجسس بھرے لہجے میں ارحم نے اس سے پوچھا۔ وہ ارحم سے قد میں تھوڑا چھوٹا تھا، پانچ فٹ نوانچ۔ بال سیاہ تھے، چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ مگر اسکا دھڑ کسرتی تھا۔

"آپ کو اپنی کزن زندہ سلامت نہیں چاہیے؟"

"مگر ہماری مدد سے آپ کو کیا فائدہ، آپ کیوں کر رہے ہیں مشقت مفت کے لیے؟" ارحم کا دل شاید پہلی بار منفی سوچ رہا تھا۔

"اغواکار کے پاس میری ایک چیز ہے، جو مجھے اس سے حاصل کرنی ہے۔" اس نے طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور وہ کیا ہے؟"

"ناٹ یور میٹر۔" وہ کہتے ہوئے ان دونوں کے قریب آیا۔

"آپ لوگوں کو ابھی صرف ایرج کی خیریت کی فکر ہونی چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں، چائے پی کے جائیے گا، آپ لوگ میرے مہمان ہیں آج کے لیے، مگر امید ہے کہ جلد پارٹنرز بننے کے لیے تیار ہوں گے۔"

وہ کندھے پہ ہاتھ رکھ کر دروازے سے سلام کرتے نکل گیا۔

~~~~~

(حال،لاہور)

خود کو نارمل کرتے اس نے سیکنڈ فلور پہ موجود سفید کمرے کا دروازہ دھکیلا جہاں بے ہوش،بے جان ایرج دنیا کے اصل سے بے خبر ایک طویل خواب کے سلسلے میں کھوئی ہوئی تھی۔

وہ دروازے سے ٹیک لگائے،دل میں ایک امید جگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ساتھ ساتھ فون پہ بات کر رہا تھا جبکہ دماغ کہیں اور الجھا ہوا۔
~~~~~

”سر کو انفارم کرو۔۔ جا کر حل تلاش کرو، میرا سر کیوں کھا رہے ہو؟ یہ میرا سر درد نہیں ہے۔ برانچ میری ہے مگر اب اگر ہم پکڑے جانے والے ہیں تو اس کو روکنے کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ وہ بہت دھیمے اور آہستہ آہستہ بات کر رہا تھا۔

”ہم لاہور سے بین کاک زندہ جائیں گے یا نہیں، یہ سر کے ہاتھ میں ہے۔اور مجھے تو موت کا کب سے انتظار ہے، مجھے نہیں پتا کہ اس (گالی) ایس پی نے ہمیں کیسے ٹریک کیا، میرے پاس اس حوالے سے کوئی پلین نہیں تھا۔ سیکیورٹی از ناٹ مائی ڈیپارٹمنٹ۔ یہ میرا کام نہیں۔“ وہ دوسرے شخص کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ سیاہ شرٹ پہ اب سیاہ کوٹ بھی موجود تھا۔

اس نے نگاہ واپس بیڈ پہ لیٹے وجود پہ مرکوز کی، اور پھر اس نے وہ ہوتے دیکھا جس کو دیکھنے کے لیے اس نے نجانے کتنے دن انتظار کیا تھا۔ اس نے لمحوں میں لائن کاٹ کہ فون جیب میں ڈال دیا۔

ہاتھوں کی مٹھی لبوں پہ سمیٹے وہ اسے دیکھے گیا۔

ایک آخری موقع۔

~~~~~
~~~~~

پہلی بار جب اس کی آنکھ کھلی تو آنکھوں میں پانیوں نے سب دھندلا کر دیا۔اسے بس کچھ سفید سی جھلک نظر آئی۔

~~~~~

دوسری دفعہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے تو اسے اپنے سر کے اوپر گھومتا پنکھا دکھائی دیا۔آنکھوں اور منظر کے ارد گرد سب سفید تھا۔موت جیسا سفید۔

وہ کہاں تھی؟

بے حد تکلیف کے باعث اس نے آنکھیں پھر موند لیں۔
~~~~~

~~~~~

تیسری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے یخ ہوا کا احساس ہوا۔ جیسے اس کا پورا جسم سردی میں جم رہا ہو۔ اس نے آنکھوں کو اوپر، نیچے، دائیں، بائیں گھمایا۔ اسے اس سفید کمرے میں ایک سیاہ وجود کی جھلک نظر آئی۔ وہ کیا تھا؟ کوئی سایہ؟ کوئی وہم؟ یا کوئی شخص؟

وہ کہاں تھی؟ کیا وہ زندہ تھی؟

اس نے آنکھیں پھر موند لیں، مگر اب دماغ جاگ رہا تھا۔
~~~~~

~~~~~

چوتھی بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے منظر صاف دکھائی دیا۔ سیلنگ سے لٹکا پنکھا سست رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر اس نے خود پہ اوڑھی سفید چادر کو دیکھا۔ کیا وہ کفن تھا؟ کیا وہ مر چکی تھی؟

اس نے آنکھوں کو ایک بار اور جھپکا، پانی کی ایک بوند آنکھ سے بہہ کر کان کی لو میں چلی گئی۔ اس نے اپنے پاؤں کو ہلانے کی کوشش کی، پھر ہاتھوں کو اٹھانے کی کوشش کی۔ حرکت ہو رہی تھی مگر شدید درد بھی تھا جو کہیں اندرونی جسم میں اٹھ رہا تھا۔
~~~~~

اسے اپنے سے دور ایک آہٹ سنائی دی۔دروازہ،ہاں کوئی دروازہ بجا تھا۔لکڑی کا۔۔۔درازی بند ہونے کی آواز۔۔۔اس نے آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں۔

~~~~~

پانچویں بار جب اس کی آنکھ کھلی تو حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی جھلکیاں بھی ذہن میں ابھرنے لگیں۔وہ کہاں تھی، نہیں جانتی تھی، مگر اس کے ساتھ آخری دفعہ کیا ہوا تھا،اسے یاد آنے لگا تھا۔

ٹرک، سڑک، چیخ،شور، صدر، سفید، خون، سیاہ،اندھیر۔
~~~~~

ایک درد کی ٹھیس پاؤں کی رانوں میں اٹھی۔اور اسے یاد آنے لگا۔آخری بار جب وہ ہوش میں تھی تو اسے کسی چیز نے ٹکر ماری تھی۔۔۔اس کے سامنے کچھ ہوا تھا تو وہ اس کا ٹرک سے ہوا حادثہ تھا۔

مگر اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟وہ صدر کیوں گئی تھی؟وہ بھاگ کیوں رہی تھی؟

اس کے ماتھے پہ لکیریں ابھری تھیں۔اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”تم نے۔۔۔۔ارمغان۔۔۔۔ہوس۔۔۔۔دوروس“

اس کی آنکھیں ایک بار پھر کھلیں۔

"قتل۔۔۔۔سعد۔۔۔۔سارہ۔۔۔۔ارمغان"

اس کی آنکھیں ایک بار پھر بند ہو گئیں۔

"کیفے۔۔۔۔گھڑی۔۔۔۔موت۔۔۔۔دوروس"

اس کی آنکھیں ایک بار پھر کھلیں۔تکیے سے سر اٹھا کر اسنے ادھر ادھر دیکھا۔اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

"قتل۔۔۔۔خون۔۔۔۔ہوس۔۔۔۔ارمغان۔۔۔؟"

اس کی ناک سردی کی وجہ سے سرخ ہو گئی۔اس کا جسم یخ ہو رہا تھا۔اس نے جھٹکے سے ہاتھ ناک پہ رکھا اور نظر گھما کر کمرے کو دیکھا۔

اس کی نظریں اس سفید کمرے کے دروازے پہ گئیں، جہاں ایک سیاہ وجود ٹیک لگائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ارمغان۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔دوروس"

"دوروس۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔ارمغان"

پھر اس کی سانسیں چند پل کو ٹھہر گئیں۔

ہاتھوں کے ذریعے جسم کو جان دیتے اس نے خود کو سیدھا بیٹھایا۔ ہر ہر پل، ہر ہر بات، ہر ہر یاد ذہن کے گہوارے میں رقصاں تھیں۔

گردن کے پیچھے، تلوں کے نیچے۔ شانوں سے ٹانگوں تک، انگلیوں سے ہاتھوں تک۔ جسم کا ایک ایک حصہ درد کر رہا تھا۔

مگر دماغ؟

بستر پہ بیٹھے اس کے دماغ کے ہر خانے میں، ہر کونے میں سامنے کھڑے اس شخص کا بسیرا تھا۔اس کی باتیں، اس کی حرکات، اس کی جھلکیاں، اس کا ہر کچھ صاف صاف دل و دماغ میں بس چکا تھا۔

ایرج نے اپنے پیروں سے موٹی چادر ہٹائی۔ پھر اس نے اپنے لباس کو دیکھا۔وہ سفید لباس میں ملبوس تھی مگر وہ والا نہیں جس میں اس نے خود کو آخری بار دیکھا تھا، یہ ڈھیلا ڈھالا سا لباس تھا جو اکثر ہسپتال میں ہوتا ہے۔اپنے وجود سے نظر ہٹاتے اس نے دروازے سے ٹیک لگائے شخص کو دیکھا جس کے لب "وا" تھے اور سیاہ آنکھیں کسی سوچ میں گم تھیں، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر کہہ نہیں پا رہا ہو۔

اسے مسلسل ایسے کھڑا دیکھتے اس کی آنکھیں ماضی کی یادوں سے جل اٹھی تھیں۔ گرم پانی آنکھوں میں جمع ہونے لگا۔

وہ لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے قدموں سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اس کی طرف لنگڑاتی ہوئی بڑھنے لگی۔ دل میں ایک طوفان مچا تھا، دل میں نفرت کے سوا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا۔

سیاہ شرٹ پہ سیاہ کوٹ پہنے، دیوار سے بازو ٹکائے، پاؤں کو قینچی کی صورت ملائے وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ کوٹ کی جیب سے سیاہ سن گلاسز جھلک رہے تھے۔ شاید وہ کہیں جا رہا تھا، یا کہیں سے آ رہا تھا۔ سیاہ شرٹ کے اوپری دو بٹن کھلے ہوئے تھے جن سے گردن پہ بنا ڈریگن صاف دکھ رہا تھا۔ ساتھ سینے اور کسرتی دھڑ کی ایک جھلک واضح ہو رہی تھی۔ گردن سے سینے تک اس کی جلد سرخ ہو رہی تھی، جیسے کسی نے بے رحمی سے گردن کو مسلا ہو۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئی اس کے قریب آئی۔ حتیٰ کہ وہ اس کے اتنے نزدیک آگئی کہ سانسوں کا خارج ہونا دل کی دھڑکن سے زیادہ صاف سنائی دینے لگا۔ ذہن میں کیفے سے سڑک تک اور روشنی سے اندھیرے تک کے تمام واقعات ترتیب پانے لگے تھے۔

اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے ارمغان کا گریبان تھاما تھا۔

"جانور۔۔۔۔ تم جانور ہو۔۔۔۔ تم مجھے مار دینے والے تھے، تم مجھے قتل کرنے والے تھے۔"

وہ اتنے زور سے چلائی تھی کہ سفید کمرہ گونج اٹھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، حلق پھٹ رہا تھا۔ اس کی کالر پہ گرفت اور بھی مضبوط اور جاہرانہ تھی۔

وہ بار بار ایک ہی بات دہرائے جارہی تھی۔اور وہ تھوڑا آگے جھکا اور مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔جیسے اس کے عمل،اس کی حرکت،اور اس کے لبوں سے نکلتی گالیوں اور جملوں کا اس پہ کوئی اثر نہیں ہو رہا ہو۔

دوروس بس اسکی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا،وہ زندہ تھی۔وہ اٹھ گئی تھی،اسکے پاس ایک موقع تھا۔۔وہ زندہ تھی۔۔اسکے پاس ایک چانس تھا۔۔وہ کسی طلسم میں ڈوب چکا تھا۔

ایرج کی آواز میں اب بھی گونج اور بھاری پن تھا۔

اسکی آواز اسکے حسین طلسم کو خراب کر رہی تھی۔

ارمغان نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ سے ایک ہاتھ پینٹ کی جیب سے نکالا، نظریں قریب کھڑے وجود پہ ہی جمی ہوئی تھیں۔اس کا ہاتھ پستول ہولڈر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"میں مر جاتی۔۔۔۔تم مجھے مارنے والے تھے۔۔۔تم نے مجھے۔۔۔"

وہ چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی۔

"یہ سب تمہارا پلین تھا۔۔۔۔تم نے مجھے ٹریپ۔۔۔."

اچانک اس کے بولتے لب تھم گئے۔ چلتی زبان کسی ٹھنڈے، کڑوے ذائقے کی وجہ سے رک گئی۔ کوئی عجیب سی شے اس کے حلق میں رفتہ رفتہ گھستی جا رہی تھی۔ وہ کوئی نالی جیسی سخت چیز تھی، شاید کوئی لوہا۔

کمرہ ہر آواز سے پاک، بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ سانسوں کی آواز بھی تھم گئی تھی۔

ایرج نے اپنی پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا کہ ارمغان کا ایک ہاتھ اب بھی پینٹ کی جیب میں ہے جبکہ دوسرا ہاتھ۔۔۔

اس کا دوسرا ہاتھ ایک چھوٹی سی پستول پہ جما ہوا تھا جسے اس نے ایرج کے بولتے لبوں کے درمیان منہ کے اندر گاڑھ دیا۔ پستول لمحوں میں ایرج کے لبوں کو جدا کرتی، اپنا راستہ بناتی، زبان اور پھر زبان سے حلق تک جا پہنچی تھی۔ لب بالکل جدا ہو گئے تھے اور ان زرد لبوں کے درمیان پستول کا سرمئی لوہا پھنسا ہوا تھا۔

دوروس گہری مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ کو جنبش دیتے رفتہ رفتہ پستول کو اوپر اور ایرج کے حلق کے اور اندر تک گھساتا جا رہا تھا۔ اور ایرج کی گردن سے جڑا منہ پستول کے اشارے سے اوپر کے طرف اٹھتا جا رہا تھا۔

دوروس کا ایک بازو اب بھی دروازے سے ٹکا ہوا تھا۔ وہ ترچھا، پاؤں کو ایک ہی انداز میں کراس باندھے کھڑا اپنی سیاہ آنکھوں سے اسے اپنی پستول کے اشارے کی

پیروی کرتے دیکھ رہا تھا۔ایک جوتا زمین کو چھو رہا تھا،دوسرے جوتے کی محض صرف نوک۔

ایرج کی دبی دبی سی چیخ اور کراہ سے محظوظ ہوتے اس نے دوسرے ہاتھ کو جیب سے نکالتے ہوئے ایک انگلی کو لبوں پہ رکھا،اور اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے مسکراہٹ دبائی۔

”جب تم چپ رہتی ہو،خدا کی قسم بس تبھی اچھی لگتی ہو۔“

وہ اس کے کان کے قریب جھک کر سرگوشی میں بولا تھا۔ایرج کے یخ جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑا اٹھا۔

دوروس نے اپنا سر پیچھے کر لیا۔

کمرے کے سناٹے میں پستول کے لوڈ ہونے کی آواز گونجی تھی۔ساتھ ایرج کی التجائی آواز اور چیخ،اس کی آنکھیں حیرت سے اور پھٹ گئی تھیں۔اس نے دو لمحوں میں اس کے سینے سے اپنے ہاتھ اٹھائے اور اس کے سامنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ دیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔

"ہمم۔۔۔تو ایکیورس، کیا تمہیں یہاں،ایسے ہی شوٹ کر دوں؟"

اس کے لب اب ایک گہری مسکان میں ڈھل گئے تھے۔

”یونہی۔۔۔۔حلق کے اندر؟“اس نے ایک بار پھر ایرج سے پوچھا۔وہ اپنی گردن حیرت اور شاک سے ہلا نہیں پائی۔

”بولوایکویریس،میں نے تم سے سوال کیا ہے۔“

اب کی بار اس نے گردن نفی میں ہلائی،حلق میں شدید درد اٹھا تو اس نے آنکھیں موند لیں۔

''اوکے۔۔۔پھر اب سے تم میری ساری بات مانو گی، پکا پرامس؟''اس نے اپنی آواز کو بچکانہ بناتے ہوئے کہا۔

''جو میں کہوں گا، تم وہ کرو گی؟''اس کی بات پہ ایرج کی گردن اثبات میں ہل گئی۔ حلق میں اب بھی پستول اٹکی ہوئی تھی۔

''تمہارے پاس اور کوئی چوائس ہے بھی نہیں!''ایک جھٹکے سے اس نے ایرج کے حلق سے پستول کھینچی۔

ایرج کا پورا منہ خون کا تالاب بن گیا۔اس نے نیچے جھک کہ منہ بھرتے کرنے کی کوشش کی مگر منہ سے صرف خون کے قطرے نکلے۔پستول کے کھچاؤ سے اس کی

زبان چھل گئی تھی جس کی وجہ سے پورا منہ خون خون ہو گیا تھا۔ اسے درد اور خون کو روکنے کی کوشش میں اپنے کپڑے کا گچھا بنا کر منہ میں پھنسا لیا۔

"تارا، جلدی آؤ ادھر۔" وہ فون پہ تارا کو کہہ رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ بھاری بھر کم عورت دروازے کے پاس کھڑی ششدر نگاہوں سے ایرج کو زمین پہ پڑے دیکھ رہی تھی اور اس کے ارد گرد خون کو۔ پھر اس نے دوروس کو دیکھا۔

"اس کو اٹھاؤ، and aid her۔" وہ اس سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ تارا ایرج کو بستر پہ لٹاتے اس کے منہ کے اندر لگے زخموں کو مرہم لگانے لگی۔

~~~~~
~~~~~

(کراچی،حال)

کھلی کھڑکی کے باہر مکمل چاند،ستاروں کی گردش میں چمک رہا تھا۔کمرہ اندھیرے سے ڈھکا ہوا تھا۔

بالکنی کا دروازہ کھلا تھا جس کے سامنے وہ جائے نماز بچھائے عشاء کی آخری رکعات میں بیٹھا درود شریف پڑھ رہا تھا۔آدھی جائے نماز کمرے کے اندر اندھیرے میں تھی اور سجدہ والی جگہ کھلی فضا میں چاند کے نیچے۔سرمئی ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہ سیاہ ٹراوزر پہنے وہ شاید نماز پڑھ کے سونے جا رہا تھا۔

سلام پھیر کے اس نے ماتھے پہ ہاتھ رکھا اور بے آواز، لب ہلائے دل میں کچھ پڑھنے لگا۔ پھر انگلیوں کی تسبیح بنا کر ذکر و اذکار کرتے اس نے انگلیوں سے شرٹ کا کالر کھینچا اور شرٹ کے اندر خود کو پھونکا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا لیے۔ اس کا آدھا چہرہ چاند کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ چہرے پہ سب سے نمایاں اس کی گہری نیلی آنکھیں تھیں جن سے وہ چاند کو دیکھتے کچھ سوچ رہا تھا۔

پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"آپ کو میرا آج بھی معلوم ہے، میرا گزرا کل بھی، اور میرا آنے والا کل بھی۔"

لب ہل رہے تھے، آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔

”پھر میری زندگی میں اتنی ان دیکھی چیزیں کیوں ہو رہی ہیں اللہ؟ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ میں درست راستے پہ ہوں یا غلط راستے پر،“

”اگر ایک طرح سے میں سوچوں، تو میں ٹھیک ہوں، مگر پھر دوسری سوچ پہ غور کروں، تو میں غلط ہوں۔ میں کس راہ کا مسافر ہوں آخر؟ میں حق پہ بھی ہوں، مجرم بھی ہوں۔ میں انصاف بھی کر رہا ہوں، میں ناانصافی بھی کر رہا ہوں،“

”مگر میں اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہوں اللہ۔۔۔ وہ تو میرا دوست ہے، میرا بھائی جیسا دوست۔۔۔ میں اس کے ساتھ ایسے کیسے کر سکتا ہوں۔۔۔ میں اسے کیسے مار سکتا ہوں۔ ہم ساتھ تھے، یہ کیا ماجرا ہے، سب اتنا مشکل کیوں ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ مجھ سے یہ مت کروائیں اللہ۔ میں یہ نہیں کر پاؤں گا..“

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے، اس نے ہاتھوں سے آنکھیں دبالیں۔منہ کو ہاتھوں کے پیالے میں چھپالیا۔

اور اللہ کے سامنے تو دنیاوی سب رک جاتا ہے۔انسان اللہ کے سامنے ایک چھوٹا سا بچہ بن جاتا ہے۔

"وہ کیوں ایسی راہ پہ آیا اللہ، اس نے آپ سے ہدایت کی دعا کیوں نہیں مانگی، آپ نے اسے گمراہی سے کیوں نہیں بچایا۔۔۔میرے پیارے۔۔۔پیارے دوست کو کیوں گمراہ ہونے دیا۔۔۔اس کے حصے کی دعا تو میں مانگتا تھا آپ سے۔۔پھر میری دعائیں قبول ہوئیں، مگر اس کے لیے کی گئی دعا کیوں نہیں ہوئی۔۔"

وہ رونا نہیں چاہتا تھا، مگر وہ رو رہا تھا۔ کیا اسے آخری موقع نہیں مل سکتا تھا؟

"میری خاطر۔۔۔۔ میری خاطر اسے بچالیں اللہ۔ وہ تو مومن تھا، وہ تو ایمان والا تھا۔۔ اس کو واپس راہ دیکھا دیں اللہ، اس کو اتنی جلدی، گناہوں کے ساتھ خود تک نہ بلائیں۔۔"

"اس پہ جہنم معاف کر دیں۔۔۔۔ اسے۔۔۔ اسے دنیا کی سزا دے دیں مگر اسے آخرت کی سزا سے بچالیں۔۔"

"اس کے لیے اور میرے لیے یہ آسانیاں پیدا کر دیں۔۔ وہ مرنا ڈیزرو نہیں کرتا۔۔۔ ہاں وہ سزا ڈیزرو کرتا ہے۔۔۔ مگر موت نہیں، اتنی جلدی نہیں۔۔۔ ہمیں تو ابھی ملنا تھا دوبارہ، ہمیں تو باتیں کرنی تھی اتنی ساری۔"

اس کے لبوں سے اب آواز نکل رہی تھی، آنکھوں سے آنسو۔اور چاند بس خاموشی سے اسے گڑگڑاتے دیکھ رہا تھا۔ایک دوست کے لیے۔

آج ایک فرشتہ ایک شیطان کے لیے دعا کر رہا تھا۔

”اسے مارنا ہے، اگر آپ نے اس کا انجام ایسے لکھا ہے، تو مجھے اس کی کہانی کا ریپر مت بنائیں اللہ۔۔۔میرے لیے راستہ آسان کر دیں۔۔۔اسے ہدایت دے دیں“

”اگر اس کا انجام میرے ہاتھوں لکھا ہے تو مجھے سکون دے دیں، مجھے اطمینان پہنچا دیں۔مجھے لگتا ہے میں ایک الوژن میں پھنس چکا ہوں۔کہ جو میں درست سمجھ رہا

ہوں وہ گناہ ہے، میں اسے موت دینے کا حقدار نہیں ہوں۔۔۔میں اس کی زندگی لینے کی سکت نہیں رکھتا۔ایک ایس پی ہوتے ہوئے بھی مجھے ڈر لگتا ہے، مجھے پہلی بار اپنی پستول سے ڈر لگ رہا ہے، مجھے پہلی بار اپنے منصوبے سے خوف آرہا ہے۔"

چاند اداس تھا، بادل اسے ڈھک رہے تھے۔

"مجھے ان مظلوموں کو بچانا ہے، مگر میں۔۔۔۔"

اس کی آواز گلے میں پھندے کی طرح اٹک گئی۔

"میں کیا کروں۔۔۔"اس کے ہاتھ پہلو میں گر گئے، سر جھک گیا۔

"میں تو آپ کے بندوں کو بچاتا ہوں، پھر مجھ پہ یہ وقت کیوں آگیا کہ مجھے اپنے سب سے قریبی دوست کو کھونا پڑے؟"

"وہ میرا ساتھی تھا اللہ، آپ جانتے ہیں میرا ماضی۔۔اس نے مجھے جینے کی امید دی تھی جب میں سب کھو چکا تھا۔آپ سب جانتے ہیں۔۔۔وہ نیک نہیں ہے مگر وہ شیطان بھی نہیں ہے۔۔۔"

"یا اللہ، میرے دل سے یہ بوجھ اتار دیں، میری نیت میں سے شک پاک کر دیں، یا میرے دل پہ یہ بوجھ کم کر دیں۔۔"

اس نے گہری سانس خارج کی اور ہاتھوں کو واپس پیالہ بنا کر کوئی دعا پڑھنے لگا۔

''آمین۔'' ہاتھ پھیرتے وہ جائے نماز تہہ کرنے لگا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

''آجائیں۔'' اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں اس کی سیکریٹری دانیہ کھڑی تھی۔ وہ اب بھی اپنے صبح والے لباس میں ملبوس تھی، سیاہ شلوار قمیص پہ سرخ دوپٹہ، لمبے بالوں کی چوٹی بنی ہوئے تھی اور آنکھوں پہ چوکور چشمہ۔

''سر، آپ کی کل لاہور کی فلائیٹ بک ہو گئی ہے۔ کل رات سات بجے۔'' وہ چہرے پر گلاسز درست کرتے حیدر سے بول رہی تھی۔

اوراس کاایک ایک لفظ حیدر کو خنجر کی طرح محسوس ہوا تھاجو اس کے دل کے آر پار جارہا تھا۔

اسے اب وہ کام سرانجام دینا تھا۔حیدر کو خدا کا پیغام آگیا تھا۔

بدقت مسکراتے ہوئے،خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے دانیہ کی طرف دیکھا۔

"اوکے، تھینک یو دانیہ۔اب آپ گھر چلی جائیں مگر کل صبح جلدی آجایئے گا۔کل بہت اہم دن ہے ہم سب کے لیے۔" وہ کہتے ہوئے دروازے کے قریب آیا۔

"مجھے اندازہ ہے سر، گڈ نائٹ۔" وہ شب بخیر کہتے وہاں سے چلی گئی۔اس کے پیچھے حیدر نے دروازہ بند کر دیا۔

"آپ نے تو جواب اتنی جلدی دے دیا اللہ، میرے دل کا سوچا بھی نہیں؟" وہ زخمی سا مسکرایا۔جائے نماز کرسی پہ رکھتے ہوئے وہ فون پہ کسی کا نمبر ملانے لگا۔

~~~~~

فاطمہ منزل کے افراد اس وقت رات کا کھانا کھا رہے تھے جب دستر خوان کی خاموشی کو ارحم کے فون کی رنگ ٹون نے توڑا۔وہ معذرت کرتے کھانے سے اٹھ کر صحن میں چلا آیا۔پھر نام دیکھتے ہوئے فون کان سے لگایا۔
~~~~~

"وقت آگیا ہے، ارحم۔" نہ سلام، نہ دعا۔ بس ایک جملہ۔

"تم کل میرے ساتھ چل رہے ہو ارحم۔ کل رات سات بجے فلائٹ ہے۔ میری ٹیم، تم اور باقی لوگ۔" وہ جیسے اسے بس انفارم کر رہا تھا۔

"تمہارا میرے پارٹنر بننے کا وقت آگیا ہے، تمہاری مدد کے لیے ہی سہی۔" وہ اس کی بنا سنے اپنی کہے جا رہا تھا۔

"اپنا مقصد بتاؤ مجھے، حیدر۔" اب کی بار ارحم بولا، اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”یہ تمہیں ایرج بتائے گی۔میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔اللہ کے امان میں۔“اور اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

ارحم موبائل کی چمکتی اسکرین کو دیکھتے کچھ سوچ رہا تھا۔

~~~~~

(لاہور،حال)
~~~~~

''نیچے آو۔ میں انتظار کررہا ہوں۔'' وہ کہہ کے پلٹا ہی تھا کہ اسے پیچھے سے اس کی آواز آئی:

''میں نہیں آؤں گی، میں تمہاری غلام نہیں ہوں۔'' وہ دوروس سے آنکھیں ملائے مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔ زبان پہ لگے زخم کی وجہ سے بولتے ہوئے درد ہو رہا تھا۔ دل اندر سے کانپ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ سامنے کھڑے شخص نے اس کی فیملی کو کس بے دردی سے قتل کیا ہے اور وہ اس کے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔ مگر اسے ہمت کرنی تھی، مضبوط بننا تھا۔ اسے یہاں سے نکلنا تھا۔

''میں اپنی بات نہیں دہراؤں گا، ایرج۔'' وہ اس کی طرف مڑا۔ اس نے نیلے رنگ کی کارگو پینٹس پہ سفید شرٹ اور سیاہ لیدر کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سفید ٹی شرٹ کے گریبان سے سیاہ گلاسز جھلک رہے تھے۔

''میں بھی اپنی بات نہیں دہراؤں گی، ارمغان۔'' اس کی سیاہ آنکھوں کی تاریکی کا سامنا کرتے ایرج کا ہاتھ اس کے پیچھے پڑے ایڈ باکس تک جا رہا تھا۔

''اب کی بار پستول حلق میں صرف گھساؤں گا نہیں، فائیر بھی کر دوں گا۔'' اس نے ایرج کی طرف دو قدم بڑھائے، ایرج نے دو قدم پیچھے لیے۔

''تم سے اس کی امید بھی ہے۔'' اب کی بار وہ مسکرائی تھی۔ دلیر، تیز، مضبوط سی مسکراہٹ۔

"تم ظاہر کررہی ہو کہ تم مجھ سے ڈر نہیں رہیں۔" اس نے اپنے قدم اتنی تیزی سے ایرج کی جانب بڑھائے کہ اسے پیچھے ہٹنے کا موقع بھی نہیں ملا۔

وہ اس کے عین مقابل کھڑا تھا، اس پہ جھکتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ دیوار پہ رکھا، کہ ایرج اسکے حصار کے پنجرے میں قید ہو گئی۔اور پھر دوسرے ہاتھ سے چٹکی بجائی۔

"یہ دیکھو، مسکراہٹ ختم!"

ایرج کی پشت دیوار سے ٹکی تھی۔۔۔نہیں۔۔۔ابھی نہیں۔۔اسے اتنی جلدی ہار نہیں ماننی تھی۔

"اچھا چلو ایک ٹیسٹ کرتے ہیں" وہ اس پہ جھکا دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔اس کا ہر ایک لفظ ایرج کے اعصاب پہ طاری ہو رہا تھا۔

ان کے درمیان بس سانسوں کا خلل باقی تھا۔

دوروس نے ہاتھ لیدر جیکٹ کے نیچے گھسایا اور بیلٹ پہ لگے گن ہولڈر سے پستول نکالی۔پھر اسے تھامتے ہوئے اس نے پستول لوڈ کی۔ایک جھٹکے سے اس نے ایرج کا پہلو میں گرا ہاتھ تھاما اور اس کے ہاتھ پہ پستول رکھتے اس کا رخ اپنے سینے کی طرف کر لیا، بالکل دل کی جگہ پہ۔پستول سینے پہ دب چکی تھی۔اور ایرج آنکھیں جھکائے اپنے ہاتھ میں پکڑی پستول دیکھ رہی تھی۔اور وہ اسے۔

"لو، چلاؤ۔ پوری چار گولیاں ہیں اس میں۔ ان سے کم از کم دل تو چھلنی ہو ہی جائے گا۔ گو آن، ٹرائی۔"

وہ مسکراتے ہوئے اس کی سانسوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔ اور دیوار سے ٹیک لگائے ایرج کا پورا وجود سن ہو رہا تھا۔ آنکھیں درد سے آنسو بہا رہی تھیں۔

اس کے پاس موقع تھا۔ وہ یہ کر سکتی تھی۔ اس کے پاس چانس تھا۔۔ بدلے کا، انتقام کا، انصاف کا، جیت کا۔ اس نے ٹریگر دبانا تھا، اور اس کا اور نجانے کتنے لوگوں کا حساب مکمل ہو جانا تھا۔

بس ایک دفعہ کی بات تھی، بس تھوڑا سا اور حوصلہ چاہیے تھا، وہ قتل نہیں کر رہی تھی، وہ انصاف لے رہی تھی۔ وہ یہ کر سکتی تھی۔

اس نے پستول پہ اپنی انگلیاں مضبوط کی۔وہ سامنے کھڑے شخص کی منحوس ہنسی سن سکتی تھی۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے ٹریگر کی طرف انگلیاں بڑھائیں۔بس ایک فائیر۔بس ایک جھلک۔اس کی اذیت کا حساب،اس کے زخموں کا حساب۔

ایرج کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔پستول ہاتھ سے چھوٹ رہی تھی۔

"تم۔۔۔۔"اس کے لب کھلے مگر جملہ ترتیب نہ دے پائے۔

"میں 'تم' نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں، تم حیوان ہو۔ تمہارے پاس دل نہیں ہے۔۔۔ میرے۔۔۔۔ پاس ہے۔۔۔ میں ایرج ہوں۔ میں مومن ہوں۔ تم ارمغان ہو، جس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ تم نہ مومن ہو، نہ تمہارے پاس ایمان ہے، تم ابلیس کی اولاد۔۔۔۔۔"

"شٹ اپ!" وہ پہلی بار اس پہ چیخا تھا، وہ پہلی بار اتنی بلند آواز میں چلایا تھا۔ جیسے آگ پہ پانی ڈال دیا گیا ہوں۔ جیسے آگ میں کچھ جھلس رہا ہو۔

ایرج کا پورا جسم کانپ اٹھا تھا، اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گئی۔

"ہاں۔۔ نہیں ہے میرے پاس دل، کیونکہ میں لوزر نہیں ہوں، آئی ایم ناٹ ڈیٹ ایڈیٹ جس نے۔۔۔۔ جس نے۔۔۔ تم سے۔۔۔"

"محبت کی تھی؟" ایرج نے لرزتی آواز میں کہا تھا۔

کیا یہ وہی ارمغان تھا جس نے اس سے محبت کی تھی۔؟ کیا یہ وہی ارمغان تھا جس نے اسے ماضی کو دماغ میں دفن کرنے اور موو آن کرنے میں مدد کی تھی؟ وہ ارمغان تو "مرہم" تھا، یہ ارمغان تو "زخم" ہے۔

اسے ارمغان سے محبت ہوئی تھی یا نہیں، مگر اسے دوروس سے نفرت ضرور ہوئی تھی۔

"یس۔۔۔ آئی ایم ناٹ دیٹ لوزر، (گالی)۔ مگر تم ایرج ہی ہو۔ وہی ایرج۔ دا گریٹ ایرج جاوید صدیقی۔ داسوئٹ ہوپلیس رومانٹک۔ بزدل، ٹوٹی ہوئی، کمزور، ٹریش۔"

اس کا جملہ، اس جملے کا ایک ایک لفظ ایرج کے کان میں کسی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح آر پار ہوا تھا۔اس کا ہر ایک لقب ایرج کے دل پہ کسی زہریلے تیر کا وار تھا جو اس کے دل کو چکنا چور کر چکے تھے۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں کی جلن سے بھاری ہو رہی تھیں۔اس نے اپنے ہاتھ پھر سے پیچھے ٹیبل تک لائے اور کچھ تلاش کیا۔پہلے اس کے ہاتھ نرم روئی پہ لگے، پھر کسی دوائی پہ، پھر کسی ڈبے پہ، اور پھر۔۔۔

اس نے نوکیلی قینچی پہ اپنی گرفت مضبوط کی، اور پھر ایک جھٹکے سے اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، اگلے ہی لمحے اس نے اپنے سامنے کھڑے شخص پہ وار کیا تھا۔

''ٹو بیڈ۔'' دوروس نے ہوا میں ہی ایرج کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما۔ ننھی سی قینچی ہوا میں ہی آدھ وارہ گئی تھی۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے ایرج کی انگلیوں میں پھنسی قینچی چھینی اور اپنی جیب میں ڈال لی۔

ایرج نے بے دم سے ہوتے ہوئے اپنی پشت دیوار سے ہٹائی۔ ایک زوردار جھٹکے سے اس نے اپنا ہاتھ دوروس کی گرفت سے چھڑایا اور پھر دونوں ہاتھوں کو اس کے مضبوط سینے پہ جماتے ہوئے اس کو جان لگاتے ہوئے دوسری طرف دھکّا دیا اور خود کو اس کے حصار سے آزاد کروایا۔ وہ دو قدم پیچھے ہوا تھا۔

''کمینے!'' پل بھر کی خاموشی کے بعد وہ چیخی تھی۔ دونوں ہاتھ بالوں میں پھنساتے اپنے درد سے پھٹتے سر کو قابو کرنا چاہا۔

اس کا پورا چہرا لال ہو گیا تھا۔آنسو قطار در قطار بہہ رہے تھے۔

''جانور!''وہ ایک بار پھر باآواز بلند دھاڑی تھی۔اسے زبان پہ کچھ کڑواسا ذائقہ محسوس ہوا تھا،زخم خراب ہونے کے اس سے باعث خون رس رہا تھا۔

وہ بال نوچتے ہوئے،کسی پاگل کی طرح اپنے پیر زمین پہ مار رہی تھی،پھر دیوار کا سہارا لیتے وہ بیٹھتی چلی گئی۔

''مجھے واپس لے جاؤ۔۔۔پلیز۔۔۔مجھے میرے گھر لے جاؤ۔''اس نے اب دونوں ہاتھوں کو بالوں سے نکالتے ہوئے ساتھ جوڑے،اس کا جسم دیوار سے ٹیک لگا کر اب زمین کو چھو رہا تھا۔

”مجھے اور تکلیف مت دو۔۔۔مجھے میرے گھر لے جاؤ ارمغان.“اس کا جسم زمین پہ لیٹ چکا تھا، منہ سے خون نکل رہا تھا، مگر ہاتھ اب بھی ویسے ہی معافی میں جڑے ہوئے تھے۔

”میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔۔۔میں نے۔۔۔“اس کے جملے آنسو اور ہچکیوں کی وجہ سے ادھورے رہے جا رہے تھے۔

دو قدم دور کھڑا دوروس آنکھیں جھکائے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور دیکھ رہا تھا،

اور دیکھ رہا تھا۔

اس نے ایساری ایکشن اپنے وہم و گمان میں بھی نہیں سوچا تھا۔

وہ تو اس کی حفاظت کر رہا تھا۔۔

اس نے پھر کیسے ایرج کو خود ہی اذیت میں ڈال دیا تھا؟

اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو۔۔۔

اس کے لب کبھی آپس میں ملتے، کبھی جدا ہوتے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر کیا؟

اس کے سامنے گھٹنے کے بل بیٹھتے اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے چہرے پہ آئے بال ہٹائے۔

اور پہلی بار دوروس کو ایرج جاوید صدیقی کی تکلیف کا احساس ہوا تھا۔

وہ لب آپس میں دبائے بے آواز رو رہی تھی۔

''اچھا۔۔اچھا چلو۔''اس نے بولتے ہوئے اپنے حلق میں کانٹے محسوس کیے تھے۔

"اچھا۔۔۔اچھا اٹھو۔۔چلو۔" وہ اسے شانے سے تھامتے ہوئے اٹھا رہا تھا۔ پھر اس نے ایڈ باکس اٹھایا اور جلدی جلدی کوئی مرہم تلاش کیا۔

ایرج نے دوروس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔

"مجھے۔۔۔مجھے میری فیملی کے پاس لے جاؤ، مجھے میری جان بخش دو۔" وہ کھانستے ہوئے خود کو خود کے رحم و کرم پہ اٹھا رہی تھی۔

"اوکے۔۔۔" دوروس نے پھر سے اس کو شانوں سے تھاما، ایرج نے پھر اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

''میں خود اٹھ سکتی ہوں۔''اس کی نظریں دوروس پہ نہیں تھیں۔ مگر دوروس کی اسی پہ تھیں۔

''میں بھی اٹھا سکتا ہوں، اسی لیے اٹھا رہا ہوں۔''اس نے ایک بار پھر ایرج کو شانوں سے تھاما، اب کی بار اس کی گرفت مضبوط تھی۔

''مجھ پہ ایک احسان کر دو، مجھے یہاں سے جانے دے دو۔ مجھے میری فیملی کے پاس لے جاؤ۔''وہ اب رو نہیں رہی تھی مگر اس کی آواز ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس نے اب کی بار دوروس کا ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔

"او کے، مگر پہلے تمہیں میرے ساتھ کہیں چلنا ہو گا۔" اس نے تحمل سے ایرج کو بستر پہ بٹھایا اور خود گھٹنوں کے بل بیٹھتے اس کے ہاتھ پہ لگے زخم پہ مرہم لگانے لگا۔

اس کی کہی بات پہ ایرج نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

"ٹرسٹ می۔۔۔ میں تمہیں کوئی اذیت، کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔" اس نے چہرہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا، اس کے ماتھے پہ سلوٹیں ابھری ہوئی تھیں اور بال بکھرے ہوئے۔

"اذیت اور تکلیف تو تم دے چکے ہو دوروس، ایسا وعدہ کرو جس پہ میں یقین بھی لا سکوں۔" سر دوسری طرف جھٹکتے اس نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ سے ہٹا لیے تھے۔

اس نے پہلی بار اسے 'دوروس' کہا تھا۔اور دوروس کے دل نے التجا کی تھی کہ وہ اسے ہمیشہ ارمغان کہے۔

وہ اس کے لیے تو کبھی بھی دوروس بننا نہیں چاہتا تھا۔

"میں تمہیں تمہاری فیملی سے ملواؤں گا ایرج، ابھی ہماری کہانی کا ایک آخری باب ادھورا رہتا ہے جس کا انجام تم نے لکھنا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا۔

ایرج نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہی۔

اس نے انگلی پہ دوا لگاتے ایرج کے منہ کی طرف کی اور اس سے اجازت چاہی۔

"اسکو بلادو جس نے پہلے دوا لگائی تھی۔"

اس نے دوروس کو منہ پہ انکار کر دیا۔وہ ضبط کرتے وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

~~~~~
~~~~~

دوروس کے جانے کے بعد کمرے میں تارا آئی تھی۔ فوراً سے ایرج کے ساتھ کرسی رکھ کر بیٹھی اور دوا لگانا شروع کر دی۔

ایرج منہ کھولے اسے دوا لگاتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اوورویٹ نہیں تھی مگر ہیلدی تھی۔ آنکھیں بھوری تھیں اور بال سیاہ، نہایت کرلی۔

جب اس نے دوا لگالی تو ایرج اسے چند لمحوں بغور دیکھتی رہی۔

"تمہیں بھی اغوا کیا ہوا ہے نا؟ تم بھی یہاں زبردستی لائی گئی ہو۔" وہ افسوس اور دکھ سے اسے دیکھتے کہہ رہی تھی۔

تارا کو چند سیکنڈ تو سمجھ نہیں آیا وہ کیا بات کر رہی ہے۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے ایرج سے وضاحت مانگی۔

"میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔۔"

ایرج اسے اب بھی بغور دیکھ رہی تھی۔ ضرور وہ دوروس کے ڈر سے چپ تھی۔

"تمہیں دوروس نے اغوا کیا ہے نا؟" اس نے ایسے کہا جیسے یہی حقیقت ہو۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ باس مجھے اغوا کیوں کریں گے؟" وہ حیرت اور نا سمجھی سے اسے دیکھتے رہی۔

"تم یہاں اپنی مرضی سے ہو؟" ایرج کو اس کی بات عجیب لگی تھی۔

"جی ہاں۔ میں یہاں خوش دلی سے ہوں۔ میں اس جگہ رہ کر ناخوش کیسے ہو سکتی ہوں؟" تارا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم ایک سیریل کلر کے ساتھ کام کر رہی ہو، اور کہہ رہی ہو کہ تم خوش ہو!" ایرج نے جیسے اسے دوروس کی حقیقت بتائی تھی۔

"سیریل کلر؟ کون؟" وہ پھر اسے ناسمجھی سے دیکھنے لگی۔

اب کی بار ایرج کو شاک لگا تھا۔یعنی یہاں کسی کو علم نہیں تھا کہ دوروس ایک قاتل ہے؟

''دوروس! دوروس قاتل ہے! ایک سیریل کلر۔''اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔

''دوروس قاتل نہیں ہیں مس! انہیں نے لوگوں کو مارا ضرور ہے مگر انصاف کے لیے۔''تارا نے جیسے اس پہ اصلیت کھولی تھی۔

''دوروس قاتل ہے،اس نے میرے بھائی اور میری کزن کو قتل کیا ہے،وہ معصوم تھے۔ان کا کوئی جرم نہیں تھا۔''

”دیکھیں مس مجھے آپ کے ذاتی معاملے میں دخل دینے کی اجازت نہیں، لیکن اگر باس نے آپ کی کزن اور بھائی کو مارا ہے تو یا تو وہ کوئی مجرم ہوں گے، اور اگر وہ کوئی مجرم نہیں تھے تو باس نے انہیں نہیں مارا، ہاں کوئی اور آپ کی فیملی کا قاتل ہو سکتا ہے۔“

اس نے کہتے ہوئے ایرج کا ششدر چہرہ دیکھا۔

”میری کزن اور میرا بھائی معصوم تھے۔ اور دوروس نے خود قبول کیا ہے کہ اس نے انہیں مارا ہے۔ وہ ایک اساسن ہے۔ وہ ناانصاف ہے اور حیوان ہے۔“ وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔

~~~~
~~~~

کاریڈور میں چلتے اسے شدید گرمی کا احساس ہوا تھا۔اس نے لیدر جیکٹ اتارتے ہوئے ہاتھ میں فولڈ کی اور لفٹ میں داخل ہوا۔

”میں جانور نہیں ہوں۔۔۔میں۔۔۔“

اس نے انگلیوں سے آنکھوں کو مسلا تھا۔

~~~~~
~~~~~

”میں بینکاک میں رہتی تھی۔ میری شادی کی دوسری رات میرے شوہر نے مجھ پہ تشدد کیا تھا اور اس نے اور اس کے دوستوں نے میرا ریپ۔ تب، اس وقت مجھے دوروس نے اسمگل کروا کہ یہاں منتقل کروایا اور مجھے منہ چھپانے کے لیے، ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے چھت فراہم کی۔ انہوں نے میرے ریپسٹ کو قتل کیا۔ باس نے قتل کیے ہیں۔ مگر صرف ظالم کے۔ اور اگر آپ ظلم کے قتل کو غلط سمجھتی ہیں تو آپ بھی ظالم ہیں۔“

وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی، اور ایرج پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہی۔

~~~~~

وہ فوراً سے پارکنگ لاٹ میں آیا تھا اور فون نکالتے ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔
~~~~~

فون کان سے لگتے وہ بار بار جوتوں سے زمین بجا رہا تھا۔

فون کنیکٹ ہوتے ہی اس نے کہا تھا؛

”میں ایرج کو آپ لوگوں کے پاس لا رہا ہوں۔۔۔ کیونکہ میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔۔“

~~~~~
~~~~~

"دوروس دنیا کے لیے ایک سیریل کلر ہیں، مجھے لگا آپ کو یہ معلوم ہوگا، مگر انہوں نے انجان لوگوں، اور دنیا کو یہ مینیپولیٹ کر کے خود یہ ظاہر کروادیا ہے کہ وہ ایک اساسن ہیں، ایک کرایے کا قاتل،"

~~~~~

"میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتی ہے۔۔۔" اس کی آواز میں کچھ ٹوٹا ہوا سا تھا، کچھ گلٹ سا۔

اسکوایرج کے الفاظ جسم پہ لگے زخموں سے زیادہ چبھے تھے۔
~~~~~

~~~~

"مگر وہ اس لیے تاکہ دنیا کے اصل حیوان باس کو کرایے کا قاتل سمجھ کر ان کو حکم دے دیں کسی معصوم کو قتل کرنے کا یا ریپ کرنے کا، اس سے باس کو یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ محفوظ نہیں، اسی لیے دوروس انہیں اسمگل کروا کے کسی محفوظ جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ اور مجھے نہیں لگتا یہ کام کوئی حیوان کرتا ہے۔ وہ ہیرو نہیں ہیں، مگر ولن بھی نہیں ہیں، وہ ایک سروائور ہیں، ایک سروائور جو دوسروں کی زندگی بچا رہا ہے، جو خود ایک سروائور ہے، اور جو دوسروں کو زندگی جینے کا موقع دے رہا ہے،"

ایرج کو لگا تھا اس کا دماغ اب پھٹ جائے گا۔ مگر تارا بولتی رہی۔
~~~~

~~~~~

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ لوگوں سے ملنے اور آپ لوگوں کو دیکھنے کی سکت رکھتی ہے یا نہیں، مگر میں اسے اب کھو نہیں سکتا، جب میں اس کے اتنا نزدیک ہوں، میں اسے اب کھو نہیں سکتا۔۔۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں تھیں۔

~~~~~

''اگر آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ کی کزن اور آپ کے بھائی معصوم تھے اور دوروس نے اُن کا "قتل" کیا ہے تو مجھے لگتا ہی کہ آپ کی کزن اور آپ کا بھائی کسی حیوان کی پہنچ کے قریب تھے اور محفوظ نہیں تھے۔آپ کی فیملی شاید اب بھی زندہ ہو، آپ کی کزن اور بھائی مرے نہ ہوں۔شاید وہ وکٹم ہوں اور آپ کو اندازہ نہ ہو۔شاید ان کے پیچھے کوئی حیوان ہو جو ان کو مروانا چاہتا ہو۔آپ بھی اسمگل ہوئی ہیں کراچی سے لاہور۔یعنی آپ کے پیچھے بھی کوئی ایسا شخص تھا جو آپ کو مروانا چاہتا تھا اور اس نے ڈارک ویپ کے ذریعے آپ کو مارنے کا حکم دوروس کو دیا ہو۔''

~~~~~

''میں ایرج کو آپ سے ملوانے لا رہا ہوں، سارہ۔اور پھر میں اسے اپنی کہانی سناؤں گا۔۔۔وہ میرا یقین کرے گی نا؟''
~~~~~

اس کی آواز میں ایک التجاء، ایک امید سی آگئی تھی۔ وہ دوروس سے ارمغان بن گیا تھا، جس کے پاس دل تھا، جو احساس رکھتا تھا۔ کیا وہ کبھی دوروس بنا بھی تھا؟

~~~~~

"میرے پیچھے تو کوئی نہیں ہے۔۔" وہ بمشکل بولی تھی۔ دماغ بالکل الجھ گیا تھا۔

"شاید آپ کو اس کا پتا نہیں ہو۔ مگر مجھے نہیں لگتا دوروس آپ کو کبھی کوئی نقصان پہنچائیں گے، کیونکہ آپ ان کے لیے خاص ہیں۔"
~~~~~

تارا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”مطلب؟“ ایرج اس کو دیکھتے ہوئے ناسمجھی سے بولی۔

”پچھلے پانچ سالوں میں دوروس نے چالیس ریپ وکٹمز جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے، اسمگل کیے اور شیلٹر دیا۔ مگر وہ کبھی بھی کسی کو اپنے اتنے قریب نہیں لائے، انہوں نے آپ کے لیے اس آفس میں یہ کمرہ بنوایا، پچھلے پانچ سالوں میں انہوں نے کسی کے لیے اتنی مشقت نہیں کی۔ وہ منہ سے نہیں کہتے، مگر آفس میں سب جان چکے ہیں کہ۔۔۔“

~~~~~

''وہ آپکا یقین ضرور کرے گی، ارمغان۔'' دوسری طرف سے کسی نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا تھا۔

وہ زخمی سا مسکرایا تھا۔

''مگر شاید نہ کرے۔۔۔میں نے اسے تکلیف دی ہے، وہ مجھے قبول نہیں کرے گی کیونکہ۔۔۔''

~~~~

"کہ ؟" ایرج نے اس کی بات کاٹی تھی۔اس کی حیرانی پہ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

"کہ وہ آپ کو پسند کرتے ہیں، مس!"

~~~~~

"میں اس کو پسند کرتا ہوں، مگر وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔"
~~~~~

اس کی آواز میں ایک خراش سی آئی تھی، ایک زخم تھا اس کی آواز میں جس کا کوئی مرہم نہیں۔

~~~~~

"ہو نہیں سکتا۔۔" ایرج نے سوچا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے، کیا ریکٹ کرے۔

اس نے تارا کا ہاتھ تھاما تھا۔
~~~~~

"مجھے آپ کے لیے افسوس ہو رہا ہے، آئی ایم سوری کہ آپ کو ایک ٹاکسک ریلیشنشپ میں رہنا پڑا۔ آپ یہ ڈیزرو نہیں کرتی تھیں۔۔۔" اس نے تارا کی آنکھوں میں دیکھا تھا، ان میں نمی جھلک رہی تھی۔

"کوئی بھی شخص چاہے کتنا بھی اچھا ہو، کتنا بھی برا، وہ ریپ ڈیزرو نہیں کرتا، مس۔۔" اس نے ایرج کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھاما تھا۔

ان چند لمحوں میں، تارا کی چند باتوں نے، ایرج کا دل پلٹنا شروع کر دیا تھا۔

اسے ارمغان سے محبت ہوئی تھی یا نہیں، اسے دوروس سے نفرت کم ہونے لگی تھی۔

مگر اب بھی چند سوالات تھے جن کا جواب اسے ارمغان سے پوچھنا تھا۔

~~~~~

(لاہور، حال)

"اگر تمہیں لگ رہا ہے کہ میں اس پہ بیٹھوں گی تو بھول ہے تمہاری۔"

وہ دونوں اب لاہور کے ہلکے سرد، ہلکے خشک موسم میں پارکنگ میں کھڑے تھے۔ دوروس نے لیدر جیکٹ واپس پہن لی تھی اور اب ہاتھوں پہ دستانے پہن رہا
~~~~~

تھا۔ایرج کا چہرہ پہلے سے کافی تروتازگی لگ رہا تھا۔وہ اب سفید یونیفارم کی جگہ جینز کے کپڑے کی فراک میں ملبوس تھی۔ساتھ سفید ٹراوزر اور سرخ دوپٹہ گلے میں مفلر کی طرح پہن رکھا تھا۔وولف کٹ بال جواب کافی لمبے ہو گئے تھے،وہ اونچی پونی ٹیل میں بندھے تھے اور آنکھوں پہ بڑے بڑے چشمے موجود تھے۔

وہ دوروس سے سب پوچھنے والی تھی مگر اس نے کہا تھا کہ اسے کوئی اہم بات کرنی ہے تو اس نے پہلے پوچھنے کا خیال ترک کر دیا۔شاید وہ اسی سلسلے میں بات کرنے والا ہو؟اس نے سوچا تھا۔

دوروس نے بھی اسے کچھ نہیں کہا تھا،البتہ اس کا لہجہ اب بہت دھیمہ اور نرم ہو گیا تھا۔

"میں اس پہ بیٹھ ہی نہیں سکتی۔" ایرج نے دوروس کے اکتائی ہوئی شکل دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔

وہ اسے گہری سانس لیتے غور سے دیکھنے لگا۔

پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اس کی خوشامد کر رہا تھا کہ وہ اس کی بائک پہ بیٹھ جائے، مگر وہ اپنی بات پہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔

دوروس نے ہیلمٹ اتارا اور اپنی یاماھا آر سیون (سپر بائک) سے ٹیک لگاتے اسے دیکھنے لگا۔

"ہم گاڑی میں نہیں جا سکتے کیونکہ وہ موجود نہیں ہے، ایکویرس۔" اس نے کہا۔

"ہم انتظار کر لیتے ہیں، اور میرا نام ایرج ہے، مجھے وہی بولو، ایکیورس کیا ہے یہ؟"

وہ مفلر نما دوپٹے کو ٹھیک کرتے مشورہ دینے لگی۔

"گاڑی رات میں آئے گی، اور ہمیں ابھی جانا ہے، اور میں ایکویرس اس لیے بولتا ہوں کیونکہ اس میں تم منفرد لگتی ہو۔" وہ بائک پہ کہنی ٹکائے اسے مدھم مسکراہٹ سے دیکھنے لگا۔

"کیسے۔۔؟" وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم ایکویرس ہو، میں ایریس۔

تم آب ہو، اور میں آگ ہوں۔

تم ایرج ہو، میں ارمغان ہوں۔"

اس نے ایرج سے نظریں ملاتے وضاحت کی۔

"دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے۔" وہ فراک کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالتے بولی تھی۔ اسکی آواز میں طنز عیاں تھا۔ مگر اسکے اگلے جملے پہ اسکی آنکھوں میں کچھ ابھرا تھا؛

"میں اپنی آگ کو راکھ کرنا چاہتا ہوں، ایرج۔" اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

وہ اسے عجیب سی مسکراہٹ سے دیکھتے رہی، اس نے کچھ نہیں بولا تو دوروس نے اس کو ایک چھوٹا سا سفید ہیلمٹ تھما دیا۔

"چلو، بیٹھو۔" وہ خود بائک پہ بیٹھتے، ہیلمٹ پہنتے بولا تھا۔

"میں اس پہ گر جاؤں گی" وہ سپر بائک کو دیکھتے کہنے لگی۔

"نہیں گرو گی، اگر مضبوطی سے تھامے رکھا۔" اس نے ایرج کو ہیلمٹ پہنتے دیکھا۔

"مگر میں تھاموں گی کیا؟" اس نے مشکلوں سے اپنا منہ اس ڈبے میں ڈالا۔

"مجھے تھام لینا۔ یا میری جیکٹ کو۔" اس نے چابی گھماتے ہوئے کہا۔

"مر کے بھی تمہیں ہاتھ نہ لگاؤں۔" اس نے کہا تو سرگوشی میں تھا مگر دوروس نے سن لیا۔

"ہینڈل ہے پیچھے، اسے پکڑ لینا۔" اور پھر اس کے ہیلمٹ کا شیشہ نیچے کر لیا۔

وہ گھبراتے ہوئے بائک پہ بیٹھی اور ہینڈل تھاما ہی تھا کہ بائک کی زناٹے دار آواز سے اس نے فوراً اس کے شانے تھامے تھے۔

وہ مسکرایا۔

پارکنگ سے بائک باہر نکالتے ہی اس نے رفتار تیز کر دی تھی۔

جس رفتار پہ وہ بائک چلا رہا تھا اس پہ ایرج بائک کا ہینڈل پکڑتی تو گر کے مر جاتی۔ ایرج نے اس کے شانوں کو اور مضبوطی سے تھاما اور "آہستہ چلاؤ" کی پکار لگائی جسے دوروس نے مہارت سے اگنور کر دیا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" اسے چلانا پڑا تھا تب جا کہ دوروس کو اس کی آواز پہنچی۔

"جہاں جہاں ہم جا سکتے ہیں!" اور پھر اس نے لاہور کی سڑکوں پہ اپنی بائیک بھگا دی۔

~~~~~

وہ دونوں بائک پر تقریباً پورا لاہور گھومے، اندرون لاہور سے مینار پاکستان تک، بادشاہی مسجد سے چھوٹے موٹے پارک تک۔

وہ دونوں اب بائیک پارک کرتے اترے اور ہیلمٹ سر سے اتارا۔ ایرج نے بھی ہیلمٹ اتارا اور ہوا سے پھڑ پھڑاتے مفلر کو بار بار درست کرنے لگی۔
~~~~~

''ہم پورا لاہور کیوں گھوم رہے ہیں؟'' وہ پریشان نظروں سے اس کی پشت دیکھ رہی تھی۔اس نے جیکٹ اتار دی تھی اور سفید شرٹ سے آر پار اس کے کسرتی پیٹھ پہ بنا سیاہ ڈریگن ایرج کو دکھ رہا تھا۔پتا لگتا تھا کہ وہ جم فریک ہے کیونکہ جب بھی وہ چلتا تو جسم کے ایک ایک مسلز ساتھ ساتھ کسی مشین کی طرح ہل رہے ہوتے تھے۔اس کی جیکٹ ہاتھ میں فولڈ تھی۔

''دوروس، میں نے کچھ پوچھا ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں؟''اس نے اس کے پیچھے قدم روکے تو وہ بھی ٹھہر گیا۔پھر پلٹ کر اسے دیکھا، چہرے پہ سیاہ سن گلاسز ٹکے تھے اور بال ہوا سے بکھر رہے تھے۔

''اتنا بڑا بڑا لکھا ہوا ہے ''ریڈ نگز'' ظاہر سی بات ہے یہاں ہی آئے ہیں۔''اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''کیوں؟'' وہ ہاتھ باندھے اسے دیکھنے لگی۔

''میں نے کہا تھا تمہیں میرے ساتھ کہیں چلنا ہوگا۔'' وہ اب پلٹ کر چلنے لگا۔

''تو وہ یہ جگہ تھی جہاں تم مجھے لانا چاہتے تھے؟'' وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے ہم قدم آئی۔

''نہیں، وہ تو مجھے یہاں کافی پینی تھی اسی لیے آئے ہیں۔'' وہ اب دروازے کے اندر داخل ہو گیا، اور وہ اسے گھورتی رہ گئی۔

ایرج نے گہری سانس بھری اور مفلر نما دوپٹہ ایک اور بار درست کرتے دروازہ دھکیلا۔

نجانے کیسے مگر وہ ارمغان کی طرح دوروس پہ بھی بھروسہ کرنا شروع ہو گئی تھی۔

ریڈ نگز کا دروازہ کھلا تھا یا کسی خواب نگر کا، وہ فرق نہ کر پائی۔ اسے کتابوں سے پہلے ہی لگاؤ تھا اور پھر اس نے لاہور کی یہ خوابیدہ جگہ صرف تصویروں میں دیکھی تھی۔ وہ قدم قدم چلتی اندر آئی اور گول گھوم کے ہر زاویے سے اس جگہ کو دیکھا۔ وہاں صرف کتابیں تھیں۔ ایک طرف کاؤنٹر تھا جہاں پہ کھڑے لڑکے نے مسکرا کے اسے سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دے کر بک شیلف کے اندر گھس گئی۔ اس کے پیچھے وہاں کا ایک ورکر آیا تھا جسے اس نے نظر انداز کر دیا۔

پھر وہ ایک ایک ریک میں گھس کر کتابیں دیکھنے لگی۔ کچھ اٹھاتی، اُن کی خوشبو سونگھتی اور واپس رکھ دیتی۔ پھر وہ کچھ کا بلرب پڑھتی اور واپس رکھ دیتی، نظر نظر میں اسے وہاں رکھی ڈارک ورس کی تمام کتابیں نظر آئیں اور اس کا دل مچل گیا۔ اس نے اس سیریز کی پہلی دو کتابیں پڑھی ہوئی تھیں وہ بھی انٹرنیٹ سے ڈاؤنلوڈ کر کے۔ وہ تیز تیز چلتے وہاں آئی اور ڈارک ورس کی ایک ایک کتاب اٹھا کر چیک کی، اس کے چہرے پہ خوشی تھی۔ پھر اس نے کتاب پلٹ کر پرائس چیک کی، تو اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

ہر کتاب دو ہزار سے اوپر کی تھی اور اس کے پاس اس سیریز کی ایک کتاب بھی خریدنے کے پیسے نہ تھے۔ خواب نگر کے خواب تو دیکھ لیے تھے مگر ان کی قیمت ادا کرنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ وہ کتابیں تھامے اداسی سے دیکھتی رہی اور پھر رکھنے ہی لگی تھی کہ اس کے پیچھے کھڑے ور کر نے اسے مخاطب کیا۔

"میم آپ کو یہ چاہیے؟" وہ اس کی طرف پلٹی تو اسے مسکراتا ہوا دیکھا۔ وہ بھی مدھم سا مسکرا دی۔

"نہیں، ابھی میرا بجٹ نہیں ہے، پھر کبھی۔۔۔" اس نے معذرت کرنا چاہی مگر اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے اسکی بات کاٹی۔

"مگر سر تو پہلے سے ہی دس بکس کی پے منٹ کر چکے ہیں، اور انہیں نے کہا ہے کہ جو بکس آپ کو پسند آئیں، وہ پیک کر دیں۔"

وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"کون سر؟" اسے معلوم تھا وہ کس کی بات کر رہا ہے پھر بھی اس نے پوچھا۔

"وہ جو وہاں کھڑے ہیں۔" اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔ ایرج نے چہرہ پلٹا۔

اس نے چہرہ اٹھا کر دیکھا تو سیکنڈ فلور کے کاونٹر پہ وہ کھڑا غور سے کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس نے لڑکے کو بکس تھمائی اور خود سیکنڈ فلور تک آئی۔

لیدر جیکٹ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی، سیاہ گلاسز اب بھی آنکھوں پہ ٹکے ہوئے تھے اور بلو جینز پہ سفید ٹی شرٹ پہنے وہ دراز قد شخص وجیہہ لگ رہا تھا۔ وہ اس تک چلتی آئی اور آنکھوں میں بے زاری سمیٹے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس سے کچھ

انچ لمبا تھا اسی لیے ایرج کو گردن اٹھانی پڑی۔ وہ دونوں اب کیفے "فسانہ" میں کھڑے تھے۔ ایک طرف بکس کے ریکس تھے اور ایک طرف میز اور کرسیوں کا سیٹ اپ۔ شیشے سے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی وہ مسکرایا اور آنکھوں سے چشمہ ہٹایا تو سیاہ آنکھیں واضح ہوئیں۔

"کون سی بکس لیں پھر؟" وہ مدھم آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"کس لیے کر رہے ہو تم یہ سب؟" وہ ہاتھ باندھے اسے دیکھتی رہی۔

"جو کچھ آفس میں ہوا، اس کے لیے سوری۔" دوروس کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

”کس لیے سوری؟ مجھے اپنی پستول سے اسالٹ کرنے کے لیے؟اوہ، یا پھر مجھے گالیاں دینے کے لیے؟ نہیں بلکہ مجھے اغوا کرنے کے لیے؟ نہیں بلکہ شاید میری جان لینے کی کوشش کرنے کے لیے، ہے نا؟ان سب کے لیے جو تم نے میرے ساتھ کیا، تم اس کے لیے "سوری" ہو۔“وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔

”بیٹھو۔“اس نے جبڑے دبائے تھے۔وہ اس کی بات سنتے ہوئے ایک ٹیبل کے قریب آیا اور کرسی کھینچ کہ اسے بیٹھنے کا کہا۔

”مجھے نہیں۔۔۔۔“

''بیٹھو۔''اس نے اب سخت لہجے میں کہا تھا۔

وہ ابھی بیٹھی تھی کہ پیچھے سے ایک ورکر آیا اور ان کی ٹیبل پہ ایک شاپر رکھ کر چلا گیا۔ان میں ڈارک ورس کی پانچوں کتابوں کے ساتھ ''آ لٹل لائف''، ''بلیک بیوٹی''، ''بک تھیف''، ''فیر نکسٹائن''اور''پرفیوم''بھی تھیں۔

وہ اس کے مقابل آکر بیٹھ گیا۔

''ڈارک ورس تمہاری فیورٹ بکس ہیں، میں نے ان کو پڑھا تھا۔مجھے ریپر سب سے زیادہ اچھی لگی،اور ایپیرر بھی اچھی تھی۔ تمہاری چوائس اچھی ہیں کافی۔ڈارک ورس کے علاوہ جو کتابیں ہیں وہ میری پسندیدہ ہیں،شاید تمہیں پسند آئیں''۔وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا اور الگ الگ کتابوں کے تبصرے پیش کیے۔

"آر یو سیر س؟" وہ اس کو حیران نظروں سے دیکھتی گئی، اپنا غصہ ضبط کرنا اب مشکل ہو رہا تھا۔

"آف کورس آئی ایم!"

اس کی بات پہ اس نے کچھ نہ کہا، بس اسے گھورتے رہی۔

"اچھا بتاؤ اور کتابیں لینی ہیں؟" اس نے ہاتھ سر کے پیچھے ٹکائے اور پشت کرسی سے۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا،اسے دوروس کی مسکراہٹ سے چڑ آنے لگی تو اس نے سر جھکا لیا۔وہ اب اپنے سفید پمپس کو دیکھنے لگی۔

”آئسکریم کھاؤ گی؟“۔اس نے ایرج کی بات کو نظر انداز کرتے پھر سے پوچھا۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“ایک ہی جواب،وہی سرد لہجہ۔

”تمہاری فیورٹ کافی بھی ہوتی ہے یہاں،ایسپریسو ود ایکسٹرا کیریمل!وہ پینی ہے؟“ایسا لگ رہا تھا دوروس نے ایرج پہ دس سالوں کی ریسرچ بٹھائی ہو۔اس نے اب ایرج کی جھکی آنکھوں میں دیکھا۔

''ایرج۔۔۔''

''تم نے سنا نہیں؟ مجھے میری فیملی کے پاس جانا ہے!'' وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی، خاموش کیفے میں اس کی آواز اور بلند سنائی دی۔ لوگ ان کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگے تھے۔

دوروس کے لب جو مسکراہٹ سجائے ہوئے تھے، اب سختی سے سل گئے۔ اس نے جیکٹ کو شانوں پہ سجایا اور جیب سے چابی نکالتے اسے مخاطب کیا۔

''چلو۔'' اس کے لہجے میں اچانک سے سرد پن اور خشکی آ گئی تھی۔

''اب کہاں لے جا رہے ہو مجھے تم؟''اس نے بیٹھے بیٹھے پوچھا تھا۔

''جہاں جانے کی تم نے رٹ لگائی ہوئی ہے، تمہاری فیملی کے پاس!''وہ اس کو وہیں چھوڑ کے سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔ایرج اس کی آنکھوں میں اٹھتے انگاروں کو دیکھ سکتی تھی۔

~~~~~

اس کی بائک سرمئی گھر کے عین سامنے آکر رکی،اس نے ہیلمٹ کو تقریباً کھینچتے ہوئے اتارا۔
~~~~~

"اترو۔"اس نے ایرج کو بائک سے اترنے کا کہا۔لہجہ نہایت سرد تھا۔اس کا انداز عجیب سا ہو گیا تھا۔ایرج نے اسے نفرت سے بھی بات کرتے دیکھا تھا اور نرمی سے بھی، مگر یہ کچھ الگ تھا۔جیسے کسی مردے کی آواز ہو۔

وہ بائک سے اترتے ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔وہ اسے کچھ کہے بنا گھر کا دروازہ کھولنے لگا۔

"چلو۔"دروازہ کھولتے ہوئے اس نے باہر کھڑی ایرج کو اندر آنے کا کہا۔

"میں۔۔۔یہاں نہیں جاؤں گی۔۔۔مجھے گھر جانا ہے۔۔۔"گھر کے اندر بالکل گھپ اندھیرا تھا،اور دھول مٹی اڑ رہی تھی۔

وہ گھر کے اندر جھانک رہی تھی کہ اسے اپنی کلائی پہ کسی کی انگلیاں محسوس ہوئیں۔ اوراس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی،وہ گھر کے اندر تھی۔دوروس نےاس کی کلائی کو اتنی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی نسیں ابھرنے لگی تھیں۔وہ ایک ہاتھ سے دروازہ بند کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے تھاما ہوا تھا۔

اسے اندھیرے میں بس دوروس کی سلوٹیں نظر آ رہی تھیں۔

اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے ایرج کا ہاتھ چھوڑ دیا۔اندھیرے کے باعث کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا۔مگر وہ اپنے قدم پیچھے لینے لگی کہ اس کی پشت کسی شیشے سے ٹکرائی،وہاں کھڑکی سے روشن کرنیں آ رہی تھیں،اس نے گردن گھما کے دیکھا تو اس کی پشت کسی تصویر سے ٹکی ہوئی تھی۔

اور پھر اس نے اندھیرے سے ابھرتے دوروس کو دیکھا۔ایک وحشت اس کے پورے جسم پہ رینگ گئی۔

"یہ۔۔تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے ڈر اور دلیری کے ملے جلے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

دوروس چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرتا اس کے قریب آتا گیا۔دوروس قدم بڑھاتے گیا اور وہ دیوار میں دھنسنے کی کوشش کرتی رہی۔پھر اس کے قدم ایرج سے دو قدم کی دوری پہ رک گئے۔

اس نے جیب سے ایک لائٹر نکالا۔

اس نے ایک ہاتھ ایرج کے سر کے تھوڑے اوپر، دیوار پہ لگی تصویر پہ ٹکایا اور دوسرے ہاتھ سے سے لائٹر اس کی گردن کے قریب جلانے لگا۔ایرج اپنی گردن پہ شعلے کی گرماہٹ محسوس کر سکتی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔تم۔۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"تمہیں جاننا تھا کہ میں تمہیں لاہور کیوں لایا اور تمہیں قید کیوں کر لیا؟" اس کی آواز میں خون سی روانی اور کھائی سی خاموشی تھی۔

"تمہیں جاننا تھا کہ میں نے تمہارے بھائی اور کزن کو کیوں مارا۔" وہ اب ویسے ہی لائٹر جلا بجھا رہا تھا، اور ایرج کے دل میں تارا کی باتوں سے جو امید اجاگر ہوئی تھی، وہ ٹوٹ گئی، اس کے سامنے ایک قاتل کھڑا تھا۔۔

وہ اس کی آنکھوں میں جلتے انگارے کو دیکھ رہی تھی جو لائٹر کے شعلے کو آئینہ دے رہے تھے۔

"میں بتاؤں گا تمہیں۔ ایک ایک بات، ایک ایک راز۔" وہ کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ ایرج نے ایک سانس خارج کی، مگر اگلی سانس ہی حلق میں اٹک گئی۔ دوروس اپنی پستول نکال رہا تھا۔ اور پھر اس نے پستول لوڈ کی

''پھر تمہیں معلوم ہو گا کہ میں جانور ہوں، حیوان ہوں۔۔۔یا پھر ایک عام سا انسان۔'' وہ اس سے دو قدم اور دور ہوا مگر ایرج کی پشت شیشے کی تصویر سے نہ ہلی۔

''آو ایرج،'' اس نے ایرج کے دائیں گال کی طرف کا نشانہ لیا اور ٹریگر دباتے فائیر کیا۔ گولی ایرج کے کان سے کچھ فاصلے پہ جا کر دیوار میں پیوست ہو گئی، مگر ایرج کا کان سن ہو گیا اور گولی کی گرماہٹ محسوس ہونے لگی۔ اسکی آنکھیں اتنے زور سے بند تھیں کہ آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ وہ مدھم سا چلائی تھی

شیشے کے کریک ہونے کی آواز آئی۔

''میں تمہیں سناؤں اپنی کہانی۔''اس نے پستول کا نشانہ ایک بار پھر ایرج کی طرف کیا، مگر اس بار بائیں گال کی جانب۔اور دوروس نے پھر سے فائر کیا۔اور اس بار اس نے شیشے کے چکنا چور ہونے کی آواز سنی، ساتھ اس نے اپنے سر پہ شیشے کا ٹکرا محسوس کیا تھا کہ اس نے دوروس کو اس کی کلائی تھامتے دیکھا۔

دوروس نے ایک جھٹکے سے ایرج کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ایرج اس کے جھٹکے کی وجہ سے اس کی دھڑ اور گردن سے جا لگی۔اور ایرج کے پیچھے آویزاں شیشے کی تصویر، جس پہ کوئی بوڑھا آدمی تھا، چکنا چور ہوتے زمین بوس ہو گئی۔پوری زمین سے دھول کی ایک لہر اٹھی۔مگر وہ دونوں ارد گرد سے نے نیاز ایک دوسری کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے، ایرج کا ہاتھ اس کے کندھے پہ تھا۔مگر دوروس نے اسے چھوا بھی نہیں تھا، اس نے ایرج کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا تھا۔

"میں تمہیں سناتا ہوں ارمغان کی کہانی، ارمغان سے دوروس بننے تک کی کہانی۔"
ایرج نے اس کی آنکھوں کو محسوس کیا تھا، جو شعلہ ان میں جل رہا تھا، وہ اب راکھ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اب سنسان ہو گئی تھیں۔ جیسے ان آنکھوں سے جان نکل گئی ہو۔ نہ نفرت، نہ محبت۔

"اور پھر میں تم سے ایک سوال پوچھوں گا کہ،" اس کی آواز پہ ایرج کی سانس رکی تھی۔ نجانے کون سی دل کی شاخ کسی لڑی سے جڑ گئی تھی؟

"کہ کیا میں تمہاری زندگی کا حصہ بن سکتا ہوں؟" اس کی آواز پہ ایرج نے آنکھیں بند کر لیں اور کان اس کے دل سے لگا یا۔ اس کا دل برق رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے دل کی آواز اور اس کی گہری سانسیں ایرج کے دل و دماغ میں بستی جا رہی تھیں۔

دوروس نے گہری سانس لیتے بولنا شروع کیا؛

(لاہور، ماضی)

تو اُن کے پیچھے بھاگا، بے چینیوں میں راتیں جاگا

رشتوں میں پیار نہیں دیکھا بھرم زیادہ

ہادیہ آپی کے علاوہ مجھے شاید ہی کسی اور پہ اتنا یقین تھا۔ وہ میرے لئے کسی سپر و من سے کم نہیں تھیں۔ جب سے میں اس گھر میں پیدا ہوا ہوں، تب سے میں نے

صرف ایک ہی انسان کو اتنا مثبت سوچ رکھے دیکھا ہے۔ہادیہ آپی، میری راہ، میری گائیڈ، مجھے بچپن سے صحیح غلط کی تمیز کرواتیں، مجھے حلال حرام کی تصدیق کرواتیں، مجھے اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ سکھایا، مجھے انصاف کے لئے لڑنا سکھایا، مگر بات جب اُن کی زندگی کی آئی تو انھوں نے زندگی کے اصول چھوڑ کا صبر کا پیمانہ تھام لیا۔

مجھے کبھی کبھی ان پہ بہت غصہ آتا ہے مگر میں اُن کو کبھی کچھ نہیں کہتا، پھر مجھے ان پہ ترس آتا ہے۔میری آنکھوں کے سامنے جو ان کے ساتھ ہوا ہے اس نے میری نظروں میں میرے گھر والوں کو گرا دیا تھا اور ہادیہ آپی کو آسمان پہ پہنچا دیا تھا۔

ہادیہ آپی کو ابا بیلٹ سے مارتے ہیں۔روز۔

مسجد میں مولانہ بنتے ہیں مگر گھر میں۔۔۔

امی بھی ہادیہ آپی کو بہت ڈانٹتی ہیں۔

ان کے چہرے پہ نیل پڑ گئے ہیں۔ان کا جسم زخموں سے بھر گیا ہے۔۔۔

میرا گھر تین منزلہ گھر تھا، جس کی سرمئی دیواریں اس گھر میں رہنے والے لوگوں کی غیرت کہ عکاسی کرتی تھیں۔سب سے نیچے والے حصے میں، میں، ہادیہ آپی، ابا اور امی رہتے تھے، اس سے اوپر والے حصے میں چاچو اور آمنہ چاچی رہتی تھیں۔ چاچو کی شادی کو دو سال ہی ہوئے تھے مگر ان کے بچے نہیں تھے، پتا نہیں کیوں مگر ان کی وجہ سے گھر کا ماحول ہمیشہ خراب رہتا تھا، وہ دونوں بے حد جاہلانہ انداز میں لڑتے تھے اور تھپڑ کی آواز پر ابا اوپر جاتے اور لڑائی ختم کرواتے۔میں جب اوپر جانے لگتا تو امی مجھے بازو پکڑ کے روک لیتیں، نجانے وہ ایسا کیوں کرتی تھیں۔میں نے کبھی ہادیہ آپی سے بھی نہیں پوچھا، ہادیہ آپی تو گھر سے اتنا لاتعلق اور کٹی کٹی

رہتیں کہ مجھے کبھی کبھار لگتا کہ وہ اس گھر کی فرد نہیں یا جیسے وہ اس گھر کی نوکرانی ہیں۔

ہادیہ آپی تمام گھر کے سارے کام خود کرتی تھیں۔ کبھی کبھار میں ان کی مدد کرتا تو امی بولتیں کہ یہ لڑکیوں کے کرنے کے کام ہیں۔ وہ ہادیہ آپی کو سسرال جانے کے لئے ٹرین کر رہی ہیں۔ مجھے امی کی یہ باتیں بھی بچکانہ لگتیں۔ سرف ڈال کے مشین گھمانے میں، اسپنج صابن سے لگا کے پلیٹ دھونے میں، اور جھاڑو کو زمین پہ رینگوانے سے کونسا لڑکا لڑکی بنتا ہے بھلا؟

مگر پھر ہادیہ آپی بھی مسکرا کے مجھے کام کرنے سے روک دیتیں، اُن کا انداز بہت نرم تھا، تھکا ہارا سا۔ اُن کی آنکھیں بھی میری طرح بڑی بڑی سیاہ تھیں۔ وہ میک

اپ نہیں کرتی تھیں بلکہ وہ گھر سے باہر ہی کہاں جاتی تھیں۔۔۔انھوں نے پڑھائی چھوڑدی تھی اوراب گھر کا خیال رکھتی تھیں۔

پھر عرصہ گزر گیااور میرے اور ہادیہ آپی کے پاس ایک چھوٹاسا کزن آگیا۔اس کا نام خالد چاچو نے حماد رکھا تھا۔حماد خالد۔

مجھے تو چھوٹے بچے ویسے ہی بہت کیوٹ لگتے ہیں اور پھر حماد تھا بھی اتنا گولو مٹولو سا۔ہم تین ساتھ کھیلتے، مگر میرے ذہن میں ایک بات بہت کھٹکتی، حماد کا خیال زیادہ تر ہادیہ آپی ہی رکھتیں، آمنہ چاچی جاب پہ چلی جاتیں تھیں اور چاچو بظاہر تو ہمیں کہتے کہ "کام" سے جارہے ہیں، لیکن ہم سب کو علم تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے پیسے جوامیں اڑارہے تھے۔اُن کی فیملی میں بس کماؤپوت آمنہ چاچی ہی تھیں جن کو ہر وقت ہی غصہ چڑھا ہوا رہتا، وہ ہادیہ آپی پہ بہت غصہ کرتی تھیں، ایک دن

توانھوں نے ہادیہ آپی کو تھپڑ بھی مارا تھا۔ میں نے جب امی سے اُن کی شکایت کی تو امی ان کے سامنے ایسے بھیگی بلی بن گئیں جیسے وہ ہی اس گھر کی مالکن ہوں۔

میں نے ایک دن غصے میں آ کر ہادیہ آپی کو کہا کہ وہ خود کے ساتھ ظلم کیوں ہونے دیتی ہیں، خود کو اذیت میں کیوں رکھتی ہیں، وہ برداشت کیوں کرتی ہیں۔ توانھوں نے اٹھ کہ مجھے گلے سے لگایا۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کے روئیں۔ زندگی میں پہلی بار میں نے ہادیہ آپی کے آنکھوں میں آنسو جے دیکھے تھے۔ پھر ہم کتنے ہی لمحے روتے رہے۔ انھوں نے مجھے جدا کرتے ہوئے کہا؛

"میں اللہ کے انعام کی منتظر ہوں ارمغان.. مگر تم یاد رکھنا۔ خود کو کبھی ایسے اذیت میں مت رکھنا۔ جو تمہارے ساتھ غلط کرنا چاہے، اس کے خلاف تم آواز اٹھانا، تم لڑکے ہو، تم مرد ہو، تم طاقتور اور دلیر ہو۔"

پھر انھوں نے میرا ماتھا چوما پھر وہ اٹھ کے جانے لگیں۔

"کہاں جا رہی ہیں۔" میں نے ان سے پوچھا۔

"حماد کے لئے سیریل بنانا ہے پھر چاچی آجائیں گی۔"

وہ بدقت مسکرائیں تھیں اور مجھے بے پناہ غصہ آیا تھا۔ آمنہ چاچی پہ بھی، خالد چاچو پہ بھی، اور اس گھر کے تمام افراد پہ بھی۔

سب سے پہلا خیال مجھے چاچو کا آیا کہ نجانے کیسے مرد تھے کہ اپنے ہی گھر کو پرایا سمجھتے تھے۔ میرا ایسے ان جیسے تمام مرد، شادی شدہ مردوں کو لعنت دینے کا دل چاہتا تھا۔۔۔ ہر اس شخص پہ لعنت جو خود کو مرد تو کہتا ہے مگر اُن کے گھر کی عورت گھر کے لئے کماتی ہے۔ لڑکی کا کمانہ ایک "choice" ہونا چاہیے۔ ایک مجبوری نہیں۔

پھر مجھے آمنہ چاچی پہ غصہ آیا جو خود کو خود ہی تباہ کر رہی تھیں، وہ خود مختار تھیں مگر وہ اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے کی زندگی بھی تباہ کر رہی تھیں۔ ایک عورت کا بچہ اس کی اولاد ہونا چاہیے کوئی بوجھ نہیں۔

پھر مجھے اپنی بہن پہ غصہ آیا۔ وہ اس گھر کی فرد تھیں وہ نوکرانی نہیں تھیں جو وہ ہر کسی کا کام اپنے سر لے لیں۔۔ وہ معصوم تھیں مگر یہ مطلب نہیں تھا کہ ان کی

مسکراہٹ اُن کی رضامندی ظاہر کرے۔ایک بیٹی گھر کی ملکہ ہوتی ہے کوئی نوکرانی نہیں۔

مگر اس کے گھر میں سب الٹ تھا۔سب کے سب پاگل تھے۔۔میں کرتا بھی تو کیا کرتا؟ سمجھاتا بھی تو کس کو۔۔۔؟

~~~~~

ٹھوکر تو پڑنی تھی ٹھوکر تو لازمی تھی

ٹھوکر نہیں پڑتی تو عقل نہیں آنی تھی
~~~~~

عرصے بیت گئے۔ عمریں بڑھ گئیں۔اور شاید خوشیوں نے بھی آخرکار ہمارے گھر دستک دے دی۔ مجھے اپنی خوشی سے زیادہ ہادیہ آپی کی خوشی عزیز تھی اور شاید ان کی زندگی نکھرنے والی تھی۔اُن کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ان کے منگیتر، عظیم بھائی نے انہیں نیانویلا موبائل دیا تھا جس پہ وہ دن چڑھے شام ڈھلے کبھی میسج یا کبھی فون پہ بات کرتے۔ان دونوں کی عمروں میں فرق زیادہ تھا مگر جب بھی میں ہادیہ آپی سے ان کی خوشی اور اطمینان کا پوچھتا تو وہ چہرے پہ ایسی مسکان سجا لیتیں جو میں نے ان کے چہرے پہ کبھی دیکھی نہیں تھی۔ مجھے اُن کے لیے بے حد خوشی ہوتی۔

ہادیہ آپی مجھے دین کی طرف لاتی رہتی تھیں مگر جب ہادیہ باجی کو دیکھا جو اتنی دین دار تھیں نماز اور قرآن پڑھتی تھیں اور پھر میں نے اُن کی زندگی کو دیکھا جس میں صرف غم تھا تو میں اللہ سے مایوس ہو جاتا۔ وہ مجھے سمجھاتی تھیں کہ یہ آزمائش ہے۔

مگر میں سوچتا کہ اللہ اپنے مومن بندوں کو ہی آزمائش میں کیوں ڈالتا ہے جن کا ایمان اتنا مضبوط ہو اُن کی زندگی میں اتنی مشکلات کیوں ہوتی ہیں۔

پھر میں نے ہادیہ آپی کے منگیتر کو دیکھا جو اپنے نام ہی کے طرح عظیم اور پر وقار تھے۔اور پھر میں نے آپی کو دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ جتنی مشکل آزمائش میں ڈالتا ہے۔اتنے ہی اچھے انعام سے نوازتا ہے۔ہادیہ آپی کی زندگی کو مثال بنا کے میں نے قرآن کو باقاعدہ پڑھنا شروع کیا۔میں چار نمازیں مسجد میں پڑھتا باقی فجر کی گھر میں۔پھر مجھے آپی بتاتی تھیں کہ وہ اللہ سے کتنی دعائیں مانگتی تھیں اور اب ان کی زندگی میں کتنی بہار آگئی ہے تو میں بھی پر امید ہو جاتا۔

میں اپنی زندگی کی بات کروں تو اس میں کچھ اتنا خاص نہیں تھا۔کچھ عرصہ پہلے ہی میرے بورڈ کے امتحانات ختم ہوئے تھے اور ساتھ ہی پریکٹیکل بھی۔اب زندگی

میں سکون سا تھا۔مجھے ایک نیا شوق بھی انہی دنوں چڑھا تھا جب عظیم بھائی کچھ دن پہلے دبئی سے میرے لئے فٹبال لائے تھے۔میں پھر گلی میں شام کو اپنے دوستوں کے ساتھ فٹبال کھیلتا۔

مگر پھر مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ مجھے فٹبال کھیلنا اور دیکھنا کتنا زیادہ پسند ہونا شروع ہو گیا تھا۔

کچھ زیادہ۔۔۔

میرے اسکول کا ایک دوست فٹبال اکیڈمی جاتا تھا اور وہاں جانا تو میری ضرورت سا بن گیا تھا۔میں پر سکوں سا ہو گیا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ آج تک جب میرے ابا نے میری خواہش نہیں ٹالی تو یہ چھوٹی سی خواہش بھی کیا چیز ہے۔ابا سے سیدھے

بات کرنا مشکل تھا مگر اس دن پتا نہیں کہاں سے ہمت جوڑ کے ابا کے پاس خواہش لے کر گیا تھا۔ چہرے پہ مسکراہٹ دل میں اطمینان اور پھر۔۔۔

ان کے منہ سے انکار کسی ٹھوکر کی طرح میرے منہ پہ پڑا۔

اور اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ میں خود کے لئے کافی ہوں۔

اپنے کمرے میں آیا۔ دراز کھول کے تین سو روپے نکالے۔ ان تین نوٹوں کو دیکھ کے مجھے خوشی بھی ہوئی تھی، غم بھی اور ڈر بھی۔ مجھے پتا تھا کہ ابا کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا تھا امتیاز ہاؤس میں۔ مگر مجھے اپنی خوشی ہر چیز سے زیادہ اہم لگی تھی۔ میں ہادیہ آپی کو دیکھ چکا تھا۔ اور میں ان کی طرح اپنے خواب نہیں مار سکتا تھا۔

اگلے دن سے ہی ہر شام میں نے فٹبال اکیڈمی جانا شروع کر دیا جو ختم تو مغرب کے کئی دیر بعد ہوتی تھی مگر کیونکہ میں چھپ کے وہاں جاتا تھا تو گھر جلدی آنا مجبوری تھی۔انہی دنوں بورڈ کے رزلٹ کی تاریخ بھی جاری ہو گئی تھی۔پانچ دن بعد ہفتے کو رزلٹ آنے والا تھا، حالانکہ پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے مگر دل مٹھی میں قید سا ہوا لگتا تھا۔

ہر دن سولی پہ اٹکتے ہوئے گزرنے لگا تھا۔

~~~~~~
~~~~~~

میں لڑتا رہا حق پہ، میں مرتا رہا حق پہ

پر کسی نے نہ بھی اس حق کی قدر کی

اس دنیا میں کون تیرا ساتھ دے گا

جب لوگ دفنا کے بھول جاتے ہیں

کہ کون سی قبر تھی۔

ہادیہ آپی اپنا دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھیں جبکہ میں ایڈمٹ کارڈ ہاتھ میں پکڑے کپکپا رہا تھا۔ ہم دونوں سست قدموں سے گھر کے باہر نکلے، اور دونوں میرے دوست کے گھر روانہ ہو گئے تھے۔ اسی کے گھر کمپیوٹر تھا۔ اور اسی کے گھر جانے کتنے لوگ آنے والے تھے اپنا رزلٹ دیکھنے۔

اس کے گھر پہنچتے ہی وہ ہمیں قریب کمرے میں لے آیا جہاں اس کا کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے ویب سائٹ کھولی۔ایک ایک کر کے ایڈمٹ کارڈ نمبر پر کیا۔اس وقت تک میرا دل حلق میں آ چکا تھا۔

ویب سائٹ لوڈ ہونے لگی اور وہ چند سیکنڈ میں کھل گئی۔اور پھر میں نے اپنا رزلٹ دیکھا۔۔

میں وہاں ہی زندہ موت مر گیا تھا۔

تقریباً بھاگتے ہوئے میں نے رکشہ پکڑا۔ہادیہ آپی کو میں نے دروازے کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔آج ہفتہ تھا،ایک امید،رکشہ مجھے اسکول تک لے آیا،میں نے جیب سے اسے چند پیسے ادا کیے اور اسکول کے گیٹ سے اندر بھاگا۔سامنے کوئی گارڈ

نہیں تھا۔ دل دھڑکنا بھول چکا تھا بس بے جان سانسیں تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی تھیں۔ جیسے تیسے کر کے میں اسٹاف روم تک پہنچا تھا اور پھر میری جان میں تھوڑی سی جان آئی تھی۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسٹاف روم میں بیٹھے واحد شخص نے میری طرف دیکھا اور مسکرائے۔

پھر مجھے اندر آنے کا کہا۔ میں ڈگمگاتے قدموں سے اندر آیا۔ وہ چیئر سے کھڑے ہوئے اور ڈیسک سے ٹیک لگالی۔

"ارمغان ؟ آپ آج یہاں ؟" سر نے مجھ سے سوال پوچھا تھا جس کا جواب دینا بھی شرم سے مر جانا تھا۔

"سر..."میری آواز گلے سے نکلتے ہی رندھ گئی۔

"کیا ہوا بیٹا؟"وہ فکر مندی سے قریب آئے اور میرا چہرہ اٹھاتے ہوئے پوچھا اور میں لفظوں کی کھوج میں گم رہا کہ کیا کہوں۔

"سر۔۔۔جسٹ فایو مارکس۔۔۔سر۔۔۔میرے پریکٹیکل میں پانچ نمبر بڑھا دیں سر۔۔۔"۔

"مگر بیٹا۔۔ہوا کیا ہے؟یوں اچانک..."وہ اب مجھے فکر مندی سے دیکھنے لگے۔

"سر۔۔رزلٹ آیا ہے اور۔۔۔اور کیمسٹری میں فیل ہوا ہوں۔۔۔" ہچکیوں کے درمیان میں نے خود کو کہتے سنا۔

"سر۔۔۔میں پریکٹیکل کے پانچ نمبرز سے پاس ہو جاؤں گا سر۔۔۔پلیز سر۔۔۔۔صرف پانچ نمبرز۔۔۔میری زندگی تباہ ہو جائی گی۔۔۔" میں کہہ رہا تھا، سر دروازے کے پاس گئے اور اسے بند کر دیا۔

شاید میں زیادہ تیز آواز میں رو رہا تھا، میں نے خود کو روکنا چاہا مگر ڈر تھا، خوف تھا، جو دل میں بیٹھا جا رہا تھا۔

میں سر کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔وہ کچھ بول ہی نہیں رہے تھے۔بس ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

پھر انھوں نے قدم بڑھائے اور ڈیسک کی طرف آئے۔انھوں نے ڈیسک سے اپنا والٹ اٹھایا اور اس میں سے کچھ نکالا۔آنسو منظر دھندلا کر رہے تھے، میں نے آنکھوں کو رگڑا تو سفید اور سرخ چیک شرٹ میں کھڑے میرے کیمسٹری کے سر کا چہرہ واضح ہوا،ان کے چہرے پہ فریم لیس گلاسس لگے تھے۔

وہ میرے قریب آئے۔

"اوکے میں کر دوں گا۔نو پرابلم۔مگر بچے آپ کو میرا ایک کام کرنا ہو گا"۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پہ کھڑے ہو گئے۔میں نے چہرہ اٹھا کے اُن کو دیکھا اور پھر ان کے ہاتھوں کی حرکت کو۔وہ اپنی شرٹ کے بٹن کھول رہے تھے۔

کچھ غلط تھا۔۔۔۔

مجھے کچھ محسوس ہوا۔۔۔کچھ غلط تھا۔۔

میں دو قدم پیچھے ہوتا گیا،وہ دو قدم آگے ہوتے گئے حتیٰ کہ میرا جسم دروازے سے چپک گیا۔

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے اور فریم لیس چشمہ اتار کر جیب میں ڈال دیا۔

پھر وہ میرے چہرے پہ جھکے۔

"میرے ساتھ کھیلو گے..؟"ان کی مسکراہٹ ٹھیک نہیں تھی۔ان کا لہجہ ٹھیک نہیں تھا۔پھر ان کا ہاتھ جو پینٹ کی بیلٹ تک جا رہا تھا۔۔

یہ سب ٹھیک نہیں تھا۔

میں نے دروازے کا ہینڈل تلاش کیا۔اس کو گھمایا مگر وہ لاکڈ تھا۔وہ کھڑے ہوئے اور میرے اوپر جھکے۔اس سے پہلے وہ مجھے ہاتھ لگاتے میں نے ان کی شرٹ گریبان

سے پکڑ کر پھاڑ دی۔ان کی گردن سے لٹکتا سلور لاکٹ میرے سامنے آیا۔ پھر میں نے اس پہ لکھی عبارت پڑھنی چاہی۔

"في ذکریات الجیدہ وفي ذکریات سیئة سأظل معک إلی الأبد۔"

(اچھی یادوں میں اور بری یادوں میں، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔)

وہ عربی میں کوئی عبارت تھی۔ میں اس پہ غور نہیں کر پایا اور وہ لاکٹ میری نظروں سے گم ہو گیا۔

میں نے ان کی انگلیاں اپنی گردن پہ محسوس کیں۔اور پھر اُن کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آیا۔پورے سال میں ان کی کلاس میں آگے بیٹھا تھا کیونکہ وہ میرے فیورٹ سر تھے۔وہ مجھ سے مسکرا کر سب سے زیادہ سوال پوچھتے، میں ان کا جواب دیتا۔مگر آج۔۔

آج یہ مسکراہٹ پہلے والی سادہ نہ تھی۔۔آج اُن کی مسکراہٹ سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

میں نے ایک ہاتھ گردن پہ محسوس کیا اور اُن کا دوسرا ہاتھ میری کمر تک اٹھا اور پھر انھوں نے مجھے ہاتھوں سے اٹھایا۔میرا سر الٹا ہو گیا تھا۔مگر میرا ہاتھ انکی کمر تک جا رہا تھا، میں ہاتھ پاؤں چلا کر اُن کو مارنے لگا کہ اُن کی پاکٹ میں رکھی کسی چیز سے میرا ہاتھ پھنس گیا۔میں نے ہاتھ زور سے کھینچا تو اُن کی پاکٹ سے ایک پاکٹ واچ

میرے ہاتھوں میں الجھ گئی۔ میں نے اس سنہری گھڑی کو دیکھا جس پہ بالکل وہی عبارت لکھے تھی جو انکے گلے میں لاکٹ پہ تھی۔ میں نے وہ پاکٹ واچ مٹھی میں تھامتے ہوئے چھپا لیا۔

وہ مجھے کرسی تک لائے اور چیئر پہ لا کر پٹخ دیا۔ میں پاؤں چلا رہا تھا۔ میں ہاتھ گھما رہا تھا۔ میں چیخنا چاہ رہا تھا مگر اُن کا ہاتھ میرے منہ کو مکمل ڈھک چکا تھا۔ میرے منہ سے سسکی نکل رہی تھی۔ آنکھوں نے آنسو بہہ رہے تھے، دل میں خوف اتر رہا تھا۔

پھر میں نے اپنے منہ پہ ڈکٹ ٹیپ محسوس کیا اور ہاتھ اور پاؤں پہ رسی۔ میرے دونوں ہاتھ اور پاؤں الگ الگ چیئر کے ایک دوسری طرف باندھے جا چکے تھے۔ میں خود کو ہلا رہا تھا خود کو کھولنے کی ناکام کوشش میں میں کرسی سمیت منہ کے بل زمین پہ جا گرا تھا۔

اور پھر میرا ذہن ماؤف ہونا شروع ہو گیا۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ مجھے کسی نے کرسی سے اٹھایا اور میں نے پردوں کے بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر میں نے کسی کے ہاتھ اپنی ٹانگوں پہ محسوس کیے۔

اور پھر مرد ہونے کے باوجود میں نے اپنے اندر کچھ غلیظ، کچھ دردناک اور کچھ داغدار سا احساس محسوس کیا۔

درد کی ہر ٹھیس جسم کے ہر کونے پہ اٹھنا شروع ہو گئی اور دل و دماغ پہ گھاؤ لگنا شروع ہو گئے جو نجانے کبھی بھولنے بھی تھے یا نہیں۔۔۔

ارحم نسیم صدیقی میرے جسم کو استعمال کرنے کے بعد اسکول کی پہلی منزل سے پھینک چکا تھا۔

~~~~~

(لاہور، حال)

وہ اسکے سینے سے الگ ہوئی تھی۔۔

اسنے ارمغان کی آنکھوں میں دیکھا جب میں آنسو ٹھہرے ہوئے تھے۔۔اسکے لب آپس میں بند تھے۔

وہ نفی میں سر ہلاتے اس سے دور ہوئی۔۔
~~~~~

نہیں۔۔۔۔

اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ منظر چھاتے دیکھا۔۔

ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔

وہ ارمغان کو دیکھ رہی تھی۔۔اسکی آنکھوں پہ سیاہی چھا رہی تھی۔۔

نہیں۔۔۔ارحم ایسا نہیں ہے۔۔۔یہ جھوٹ تھا۔۔۔ارحم ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔اس نے بچپن سے ارحم کو دیکھا ہے۔۔۔یہ جھوٹ تھا۔۔۔

اس سے پہلے اسکی آنکھیں بند ہوتیں،اسنے ارمغان کا ہاتھ اپنے بازو پہ محسوس کیا تھا۔اور پھر اس نے اپنا چہرہ اسکے دھر میں آرام سے لگتا محسوس کیا ہو جیسے کوئی تکیہ ہو۔

اسنے آنکھیں بند کر لیں تھیں،اپنے سر پہ اسنے ارمغان کا سر محسوس کیا۔۔

آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔۔

اسکی زندگی ایک جھوٹ تھی؟

~~~~~~

(لاہور، ماضی)

میری آنکھ کھلنے کے بعد جو پہلا منظر مجھے نظر آیا تھا وہ میرے کمرے کا منظر تھا۔ میرے برابر ہادیہ آپی بیٹھی تھیں۔ میں نے اُن کی طرف چہرہ گھمایا۔ وہ ویران نظروں سے مجھے دیکھ رہیں تھیں۔ پھر وہ زخمی سا مسکرادیں۔

انھوں نے مجھے اٹھا کر بٹھایا۔ جسم میں درد تھا مگر خلافِ توقع بہت کم۔ پھر مجھے ہادیہ آپی نے بتایا کہ میں دو ہفتہ ہسپتال اور چار دن گھر میں بے ہوش رہا ہوں۔ مجھے
~~~~~~

ہوش آتا بھی تو چند سیکنڈ، اس عرصے میں جو زخم میرے جسم پہ لگے تھے وہ زیادہ تر مندمل ہو چکے تھے۔ مجھے گھر میں ہادیہ آپی کے علاوہ کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر ہادیہ آپی مجھے چھت پہ لے آئیں۔ میں چل رہا تھا۔۔۔ بس جسم کے پیچھے والے حصے میں درد تھا۔ میں چل رہا تھا۔۔۔ مجھے حیرانی تھی۔ مگر میرا دماغ کہیں گم تھا۔۔۔ وہ حال میں نہیں تھا۔۔۔ ماضی میں تھا۔

پھر ہادیہ آپی نے فٹبال مجھے پاس کی۔ انھوں نے مجھے لات مارنے کا کہا۔ میں نے لات ماری، ٹانگوں کے بیچ ایک درد کی ٹیس اٹھی مگر میں نے اسے نظر انداز کیا اور ایک اور لات ماری۔ پھر مجھے سیڑھیوں پہ کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کے دیکھا تو دروازے کے پاس ابا اور امی کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں بدقت مسکرایا ہی تھا کہ ابا میرے سر پہ آ کھڑے ہوئے۔ اُن کی نظروں میں کچھ عجیب تھا۔

"کیوں!"اُن کا لہجہ میں نے کبھی اتنا بدلا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"تیری ہر بات مانی۔۔۔ تیری ہر خواہش پوری کی۔۔۔اور تو نے یہ کیا؟"اُن کا ہاتھ میرے بالوں پہ پہنچا۔وہ میرے منہ پہ گرجے تھے۔اور پھر انہوں نے میرے منہ پہ تھوک دیا۔

"تجھے شرم نہیں آئی؟پہلے اپنے استاد پہ الزام لگایا پھر خودکشی کر کے انہیں پھنسانے کی کوشش کی؟تجھے شرم نہ آئی؟"وہ میرے بالوں کو کھینچ رہے تھے۔میرے سر میں درد کی لہر اٹھنا شروع ہو گئی۔مجھے ان کی باتوں کا ایک حرف سمجھ نہیں آیا تھا۔

"ابا چھوڑیں اسے!" ہادیہ آپی قریب آئی تھیں مگر ابا نے انہیں دھکا دے کر دور کر دیا۔

پھر ابا نے میرے بال چھوڑے۔

سر میں درد کچھ کم ہو ہی تھا کہ پھر میں نے درد کی ایک شدت اپنے چہرے پہ محسوس کی۔

پھر ہاتھ پہ۔۔

پھر پیٹھ پھر۔۔۔

پھر ٹانگ پہ۔۔

ابا نے مجھے اپنی پشاوری چپل سے تب تک مارا جب تک میری سسکیوں اور ان کی گالیوں سے پورا محلہ چھت پہ تماشہ دیکھنے نہ اکٹھا ہو گیا۔ان سب کے لب سلے ہوئے تھے۔میری ماں مجھے چھڑا رہی تھی۔میری بہن میرے ابا کی دھتکار کھا رہی تھی اور میں۔۔۔میں بس لاتیں کھا رہا تھا، چپلیں کھا رہا تھا۔۔

کس لیے؟اس کا جواب تو میرے باپ کے پاس بھی شاید نہیں تھا۔

اس دن مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے باپ نے میرے لاڈ، میرے نخرے اس لئے اٹھائے کیونکہ میں "لڑکا" تھا۔

ایک انا سا، ایک غرور سا فخر تھا میں۔کیا انھوں نے مجھ سے محبت کی بھی تھی؟

میں نے احترام کے قابل استاد کو ریپ کرتے دیکھ لیا تھا۔

میں نے حاجیوں کو تسبیح پڑھتے تشدد کرتے دیکھ لیا تھا۔۔

کیا زندگی میں اس سے بدتر اور کچھ ہو سکتا تھا۔

ہاں ہو سکتا تھا، اور وہ میری آگے کہ زندگی تھی۔

~~~~~

دیکھو نا زمانے نے کیا میرا یہ حال کیا ہے
~~~~~

قسمت کا جھنڈا ابھی کیا اونچا زوال دیا ہے

ارحم نے اپنی غلاظت میری زبان سے صاف کر کے اپنی تمام نشانیاں میرے جسم سے پونچھ کر مجھے پہلی منزل سے پھینک دیا تھا۔ جس سے نہ ہی میں مرا نہ ہی میری کوئی ہڈی ٹوٹی مگر اسے اپنے حق میں کہانی بنانے کا مکمل موقع مل گیا تھا۔ اس نے سب اتنی مہارت سے کیا تھا جیسے میں اس کا پہلا شکار نہیں تھا۔

اگلے پانچ ہفتوں کے لئے میں بیڈ ریسٹ پہ تھا۔ میری آنکھوں کے نیچے حلقے اور میرے چہرے پہ آنسوؤں کے نشان ایک داغ سے زیادہ نہ تھے جو میری زندگی پہ کوئی پندرہ منٹ میں لگا کہ چلا گیا تھا۔

مجھے خبر ملی کہ عظیم بھائی نے ہادیہ آپی سے منگنی توڑ دی تھی۔ان کا خیال تھا کہ جہاں ایک لڑکا اتنا گندہ کھیل کھیل سکتا ہے تو اس گھر کی لڑکی سسرال آکر کیا کیا تماشہ کرتی؟

ہادیہ آپی اب میرے کمرے میں نہیں آتی تھیں۔نہ اب وہ مجھے قرآن پڑھاتی تھیں۔نہ وہ میرا پوچھتی تھیں۔وہ میرا خیال رکھتی تھیں مگر میرا حال نہیں جانتی تھیں۔وہ جانتی بھی کیوں؟ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین لی تھی میں نے۔۔پھر وہ میری زندگی کی فکر کیوں کرتیں۔۔

میں دو ہفتوں سے اپنے سر کے اوپر چلتا سست پنکھا دیکھ رہا تھا اور اپنے بارے میں لوگوں کے خیالات سنتا رہا۔

بولنے کے لئے لب کھولتا تو دوسروں کی زبان سے آتی میرے لیے گالی میرا منہ بند کر دیتی۔مجھے تو اب صرف فیصلے سنائے جا رہے تھے۔کسی کو صفائی پیش کرتا تو کیا کرتا۔جس کو صفائی پیش کرنی چاہی،اس نے بھی منہ موڑ لیا۔جس نے زندگی بھر میرا ساتھ دیا وہ جب بدگمان ہو گیا۔۔تو دوسروں سے کیا امید رکھتا۔۔۔

اور پھر میں نے ابا کا اعلان سنا۔

میں بورڈنگ اسکول جا رہا تھا۔

"بڈھے مجھے بھیج کے دکھا۔"

اس دن مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھے غصہ بہت آنے لگا تھا۔

~~~~~

روح کو آزاد کر جسم کو سکون دے

قلندری اڑان بھر، کیا ہوا اگر پر نہیں

میں رویا تھا- فائدہ ندارد

میں نے معافی مانگی- فائدہ ندارد

میں نے جرم قبول کر لیا- فائدہ ندارد

میں نے خود کو جھوٹا کہلایا- فائدہ ندارد

میں چلایا- فائدہ ندارد
~~~~~

میں چیخا-فائدہ ندارد

میں پاؤں میں گر گیا-فائدہ ندارد

میں نظروں میں گر گیا-فائدہ ندارد

گھر میں سفید چاندنی بچھائی جا رہی تھی اور میں بس خالی نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔

"میرا دم گھٹتا ہے اس گھر میں ارمغان میری ساس رخصتی نہیں کر رہی ہیں"۔

اگربتیوں کو جلایا جا رہا تھا۔ان کو چاندی پہ سجایا جا رہا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں کتنی بہادر ہوں جو اس گھر میں زندہ سروائو کر لیا"۔

لوگ آہستہ آہستہ لاؤنج میں جمع ہو رہے تھے۔میں سیڑھیوں پہ بیٹھا انہیں قرآن پڑھتے دیکھ رہا تھا۔

"قرآن اور نماز کبھی مت چھوڑنا چاہے تم کتنے ہی گمراہ کیوں نہ ہو جاؤ۔قرآن اور نماز ہی تمہیں مسلمان بناتا ہے انہیں کسی حالت نہ چھوڑنا"

وہاں بیٹھے لوگ تسبیحوں کے دانے گرا رہے تھے۔

"پوری زندگی گزار کہ میں سوچتی ہوں کہ جو زندگی میں نے گزار دی ہے اس سے تو موت کہیں زیادہ آسان تھی"

پھر ایمبولینس سے میت اٹھا کہ لاؤنج میں لائی گئی۔

"اللہ نے مجھے موت کیوں نہیں دی؟"

ساتھ ساتھ مدھم سسکیوں کی آواز بلند ہوئی۔ان نقلی سسکیوں کی جنھوں نے کبھی اس مردہ انسان کی زندگی کے بارے میں فکر نہیں کی تھی۔جو رو رہے تھے۔۔وہ تو شاید اسی لئے رو رہے تھے کہ شاید اُن کی نوکرانی مر گئی۔

"مجھے جنت کا اتنی شدت سے انتظار ہے کہ دل چاہتا ہے خودکشی کر کے جلدی سے جنت پہنچ جاؤں۔مگر کیا کروں خودکشی حرام ہے۔۔۔"

میں نے سیڑھیوں کی گرل سے سر ٹکا لیا۔آنسو آنکھوں میں سجتے چلے گئے۔آمنہ چاچی نے مجھے پنج پارہ پکڑا یا جو میں نے ظہر سے عشاء تک پڑھا۔

اور ہادیہ آپی کی موت کے بعد میں نے پھر کبھی قرآن نہیں اٹھایا تھا۔

~~~~~

میرے گھر والوں کی بھول تھی کہ میں بورڈنگ اسکول جاؤں گا۔
~~~~~

ابا کے والٹ سے، چاچی کی الماری سے، امی کے دراز سے اور اپنے گلک سے میں جتنے پیسے چرا سکتا تھا اتنے چرا لئے۔ میرا اس گھر میں واحد لگاؤ ہادیہ آپی سے تھا اور وہ چلی گئیں تھیں، ان کے مرنے کے ایک ماہ بعد ہی سب انہیں ایسے بھول گئے تھے جیسے وہ پانی کا ایک بلبلا ہو۔ اگر کوئی انہیں یاد کرتا تو اس وجہ سے کہ نئ ماسی کام صحیح سے نہیں کر رہی تھی۔

میں نہ کوئی کپڑے رکھ پایا تھا نہ کوئی اور چیز۔ بس کھانے پینے کا سامان تھا جو میرے پاس تھا۔ میں بورڈنگ اسکول نہیں جانے والا تھا۔ میں کہاں جانے والا تھا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا مگر یہ سرمئی گھر میرے لیے اب پرایا ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس کے دروازے میرے لئے بند نہ تھے مگر میں نے انہیں خود پہ بند کر لیا تھا۔

~~~~~
~~~~~

اسکول کی دوسری رات کو میں اسکول سے روانہ ہو گیا تھا۔اپنے پیچھے میں نے کسی کو چلاتے سنا تھا۔ مگر میں گرتے گرتے بھاگتا رہا۔دل دھڑک رہا تھا مگر دل باقی ہی نہیں رہا کچھ محسوس کرنے کے لئے۔

رات کے کچھ ڈھائی بج رہے تھے جب میں فٹ پاتھ پہ بھاگ رہا تھا۔سڑکیں سنسان تھیں۔میں کہاں جارہا تھا مجھے کچھ اندازہ نہ تھا۔میری منزل کیا تھی مجھے علم نہ تھا۔میرے پاس اتنے پیسے تو تھے کہ میں ایک معمولی فلیٹ کرائے پہ لے لوں۔ مگر مجھے کسی فلیٹ کا کرایہ نہیں پتا تھا۔اور اگر وہ میرے گھر والوں کو کال کر دیتے تو۔۔؟

سڑک سنسان تھی۔ پیلی بتیاں ہی بس ہلکی سی روشنی پھیلا رہی تھیں، میں عام سے کرتا شلوار میں ملبوس تھا۔ کندھے پہ بیگ تھا اور اس میں چند کھانے کا سامان۔

مجھے اپنے پیچھے گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میرا دل زور سے دھڑکا، گاڑی کی رفتار سست تھی مگر پھر بھی مجھے میری سماعتوں کے قریب آتی سنائی دے رہی تھی۔

پھر وہ گاڑی بالکل میرے برابر آرکی۔

زندگی میں دوسری بار مجھے اندھیرے سے خوف آیا تھا۔ وہ لوگ میرے منہ پہ رومال رکھ رہے تھے اور میرے کان سن رہے تھے کہ وہ ارحم کا نام لے رہے ہیں۔ میں کسی بھی سوچ کو دماغ میں لانے سے قاصر تھا اور بالآخر میری آنکھیں اور میرا دماغ میری ناک پہ لپٹے رومال کی وجہ سے مکمل بند ہو گیا۔

~~~~~

میں ،بھائی میں ڈوبنے کا عادی

تو بھائی میرے کتنا بچائے گا

قسمت

ہر انسان کی کتنی مختلف ہوتی ہے

قسمت

جو اچھے سے برے اور برے سے اچھے میں بدل جاتی ہے

قسمت
~~~~~

جو آزمائش بھی ہوتی ہے انعام بھی

قسمت

جو مشکل بھی دیتی ہے اور آرام بھی

مگر میری زندگی میں

کیوں یہ قسمت

صرف اندھیرا لاتی ہے؟

میری آنکھ پنکھے سے ہوتی عجیب سی آواز سے کھلی۔ وہ ایک کمرہ تھا۔ نہایت بھدا سا کمرہ۔ جس کے ایک طرف بستر تھا جس پہ میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ دوسری طرف ایک کونے میں ڈریسنگ ٹیبل تھا جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور ایک طرف الماری۔

پھر میں نے اپنی حالت دیکھی۔میں اپنی شلوار قمیص میں ملبوس تھا جن میں مجھے اغوا کیا گیا تھا۔اس شلوار قمیص پہ ایک داغ نہ تھا۔میں نے اپنے پاؤں ہلانے چاہے اور مجھے اندازہ ہوا کہ میرے دونوں ہاتھ بستر کے الگ الگ کونوں سے بندھے تھے۔ میرا دماغ کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔مگر میں کمرہ دیکھتے اس جگہ کا اندازہ لگانے کی کوشش میں تھا۔کمرے کا دروازہ بند تھا۔اور میں اکیلا۔کمرے کے اندر اندھیرا تھا مگر کھڑکی سے پیلی روشنی تھوڑا اجالا کر رہی تھی۔

پھر میں نے دروازے پہ ایک آہٹ سنی۔دروازہ کھل رہا تھا۔میں نے جھکے چہرے کو اوپر اٹھا کے دیکھا۔وہاں ایک بڈھا سا مرد کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔اس نے بھی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔چہرہ جوان تھا مگر داڑھی سفید تھی۔سر پہ کوئی بال نہ تھے۔

کھلے دروازے سے نیلی اور لال روشنیاں اندر آ رہیں تھیں۔

میں کہاں تھا؟

پھر وہ سرخ اور نیلی روشنی آنا ترک ہو گئی کیونکہ اس شخص نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے چہرے پہ ایک مسکراہٹ طاری ہوئی اور وہ مسکراہٹ بالکل ویسی ہی وحشیانہ تھی جو ارحم کے چہرے پہ تھی۔

اس شخص نے اپنی جیب سے اپنا بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالتے اسے دانت سے پھاڑا اور میں سمجھ گیا کہ وہ کیا ہے۔

میں نے چیخنا چاہا مگر میرے حلق کے تمام سر دم توڑ گئے تھے اور میرے حلق سے ایک کراہ کے علاوہ اور کچھ نہ نکلا۔

وہ میرے قریب آ رہا تھا۔ اس کے قدم میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے زنجیر سے بندھے ہاتھوں کو حرکت دینی چاہی مگر زنجیر کی چھنچھناہٹ کے علاوہ کچھ سنائی نہ دیا۔ میں نے اسے لاتیں مارنا چاہیں مگر اس نے میری دونوں ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

پہلے میں نے خود کو دیکھا۔ میری قمیص کے تمام بٹن نفاست سے بند تھے۔ پھر میں نے اس کی قمیص کو دیکھا۔ اس کی قمیص کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔درد اور اسکی ہنسنے کی آواز۔۔۔بس یہی تھا جو میرے لیے اس دنیا میں باقی رہ گیا تھا۔

~~~~~

میں بے ہوش نہیں ہوا تھا میں نے سب دیکھا تھا۔

میں نے پہلے خود کو دیکھا۔میری قمیص کے تمام بٹن کھل کے ٹوٹ چکے تھے۔

پھر میں نے اس کی قمیص کو دیکھا جو دروازے سے باہر جا رہا تھا،اس کی قمیص کے تمام بٹن نفاست سے بند تھے۔
~~~~~

میں نے سب دیکھا تھا۔۔۔

"بہت شور کرتا ہے سالہ۔۔۔اچھا مال لائیں آئندہ سے۔"میں نے اس بڈھے کو سنا جو باہر کسی سے میرے بارے میں بات کر رہا تھا۔

میں نے خود کو دیکھا۔میری ٹانگوں میں، ہاتھوں میں پورے جسم میں جیسے جان نہیں بچی تھی۔میرے ہاتھ اب بھی زنجیروں سے بندھے تھے۔میری آنکھیں پھڑ پھڑانے لگیں۔پھر میں نے دیکھا کہ ایک عورت جس نے چمکیلے سے نارنجی کپڑے پہن رکھے تھے میرے پاس آئی اور میرے منہ میں سوکھی روٹی اور پانی ڈالنے لگی۔

"تو یہاں اپنی مرضی سے آیا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔اس کے چہرے پہ بے حد میک اپ تھا۔

میں اس کو کچھ کہہ ہی نہیں پایا۔وہ بھی خاموش ہو گئ۔

"میں کہاں۔۔ہوں" میں نے بدقت اس سے پوچھا۔

"ہیرامنڈی میں۔" وہ مجھے کھانا کھلا کر چلی گئ اور میں ویسے ہی زنجیروں سے بندھا پڑا رہا۔

میں دن گنتا رہا۔۔۔

اپنے جسم پہ آئے زخم گنتا رہا۔۔۔

آنسو زمین پہ چنتا رہا۔۔۔

دل میں ایک شعلہ سا بنتا رہا۔۔۔

بارہ دن، دو سو سات زخم، اور چھ لوگ۔

میں نے ہیرا منڈی میں بارہ دن کاٹے تھے۔

اور ان بارہ دنوں میں چھ لوگوں نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔۔ان سب کی شکل دیکھی تھی میں نے۔جو جو انھوں نے میرے جسم کے ساتھ کیا، میرے جسم

کواندر باہر سے خالی کر دیا اور اپنی غلاظت سے بھر دیا۔میں نے سب دیکھا تھا۔۔۔

سب محسوس کیا تھا

اور ایک مزے کی بات بتاؤں؟

میں "لڑکا" تھا۔

اور مجھے "مردوں" نے ریپ اور ذہنی اذیت کا نشانہ بنایا تھا۔

ان بارہ دنوں بعد مجھے ایک شخص نے آکر بولا کہ میں کہیں جارہا ہوں اور میں

مسکرایا۔

میرے کمرے میں ایک نوجوان مرد جس کی عمر شاید تیس سے اوپر تھی، آیا اور اس نے مجھے دیکھا۔

میں اسے دیکھ کر مسکرایا۔

کیا وہ ساتواں مرد تھا؟

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے فون نکالا اور کسی کا نمبر ملانے لگا۔ اور پھر انگریزی میں کچھ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"تمہارا آج سے نام 'دوروس' ہے" اس نے مجھ سے کہا؛

"اپنے پرانے نام کو بھول جاؤ"۔وہ شخص مجھ پہ جھکا اور بارہ دن بعد میرے ہاتھ ان زنجیروں سے آزاد کروائے۔میرے دونوں ہاتھوں پہ زنجیر کی وجہ سے زخم ہو گئے تھے۔

"تمہارے ساتھ جو ہوا تمہیں اس کا بدلہ لینا ہے دوروس؟"اس شخص نے اپنی بھاری آواز میں سوال کیا۔

"تمہیں اپنے زخموں کا بدلہ لینا ہے دوروس؟"اس نے پھر سے سوال کیا۔

اور میں نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

اور اسی دن، اسی لمحے دو ایمان بیچ دینے والوں کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ ایک کو زخم لگ چکے تھے، اب واپسی کا راستہ نہ تھا کوئی۔ اب تو آنے والی راہ میں صرف کانٹے تھے جو زخم کے سوا کچھ نہ دینے والے تھے۔

~~~~~

اس شخص کا نام ایلیٹ تھا۔

اور اس نے مجھے ارمغان سے دوروس بنایا۔ وہ مجھے ایک نئی دنیا لے گیا جہاں صرف خون تھا، زخم تھے اور بدلے کی آگ تھی۔
~~~~~

میں پہلی بار جہاز میں بیٹھا تھا۔

میں ایک ایسی جگہ جا رہا تھا جہاں مجھے میرے بدلوں کا حساب لینا سکھایا جانا تھا اور اس راہ کو میں نے خوشدلی سے اپنایا تھا۔

میں شاید چائیلڈ ٹریفکنگ کا وہ واحد بچہ تھا جو خود کی اسمگلنگ سے نہایت خوش تھا۔

ہم بینکاک جا رہے تھے، ایک نئی دنیا کو جینے کے لئے۔

~~~~~
~~~~~

شاید اس راہ پہ چلنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔

یہ بینکاک کی ایک خوبصورت رات تھی۔ایک کھلے سے میدان میں،میں کھڑا تھا۔ میرے ارد گرد میرے ساتھی جن سے میری ان پانچ مہینوں میں اچھی دوستی ہو گئی تھی مگر وہ سب بہت ڈرے سہمے رہتے تھے،اور سب سے زیادہ توحیدر۔وہ سب سے ڈرپوک تھا۔اسی لیے میں اس کا دوست بنا۔میں کسی بھی چیز کو کر جانے سے نہیں کتراتا تھا۔اور اس کو بھی کرنے کا کہتا تھا،وہ بہت اچھا دوست تھا میرا۔۔۔

وہ بھی وہاں کھڑا مجھے ڈرے سہمے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

یہ ایک مٹی کا میدان تھا جہاں دور ایک ساحل اور بہت دور شہر میں روشنیاں چمک رہیں تھیں۔ مگر میدان میں اندھیرا تھا۔ میں نے سیاہ یونیفارم پہن رکھا تھا اور میرے ہاتھ میں ایک آری تھی۔

چہرے کو اٹھا کے میں نے دیکھا کہ مجھ سے کچھ فاصلے پہ سر بیٹھے تھے۔ انھوں نے سیاہ رات میں بھی سیاہ چشمے لگا رکھے تھے۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہے تھے اور میں اُن کو۔

"یہ ہی ہے نا تمہارے ریپسٹ میں سے ایک؟" انھوں نے سوال کیا تو میرا سر اثبات میں ہل گیا۔

وہ شخص جس نے مجھے سب سے زیادہ تکلیف دی تھی وہ میرے سامنے گھٹنے کے بل بیٹھا تھا۔اس کے کپڑے گندے اور آنکھوں پہ پٹی بندھی تھی۔

"تو پھر جاؤ۔۔حساب کی رات آگئی ہے دوروس"۔وہاں سب کے لئے ایک کوڈ نیم تھا۔کسی کا ٹوئے لائٹ، کسی کا ہیبیکس، کسی کا میرون،اور میرا دوروس، جسکے معنی بھی میرے اصل نام کی طرح تھا۔

"پر سر۔۔"میں نے انہیں دیکھتے لب کھولے۔

"تم نے اس رات کے لئے۔۔اس منظر کے لئے کتنی محنت کی ہے؟ کتنے کانٹے کھائے ہیں،جاؤ یہ تمہارا حق ہے۔"

"مگر سر میں اسے۔۔۔۔"

"یاد نہیں کہ اس نے تمہیں اپنی بیلٹ سے مارا تھا؟"میرے لب اُن کی بات پہ سل گئے تھے۔ نہیں۔۔۔مجھے وہ سب یاد نہیں کرنا تھا۔ سارے لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔

"پھر کیسے اس نے تمہارے منہ کے اندر۔۔۔۔"میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری گرفت آری پہ مضبوط ہو گئی۔

"پھر کیسے اس نے تمہاری شلوار کا ناڑا کھولا۔۔۔کیا وہ سب تمہیں اچھا لگا تھا؟"

میں نے آنکھیں میچ لیں۔ سر نفی میں ہل گیا۔

"تو پھر اپنا بدلہ لو۔۔۔" سر کہہ رہے تھے اور دل دھڑک رہا تھا۔

مجھے وہ سارے دن یاد آ گئے تھے۔ مجھے وہ بارہ دن یاد آتے گئے۔۔ مجھے وہ طویل راتیں یاد آتی گئیں اور پھر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرے سامنے میرے سات تشدد کار میں سے ایک بندھا پڑا تھا۔

میں اس کے اوپر جھکا اور اپنے جوتوں سے اس کے سینے پہ ایک لات ماری۔ پھر میں گھٹنوں کے بل اس کے پیٹ پہ بیٹھ گیا اور پھر اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ میری انگلیاں آری پہ مضبوط ہوتی گئی۔ اور پھر میں نے آری کو ہوا میں اٹھایا۔

"تیرے ہر اس اعضاء کو کاٹ دوں گا جس کا غرور تو نے مجھ پہ آزمایا تھا"۔

اور پھر میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو جسم سے جدا کیا۔ ہڈیوں کے کٹنے کی آواز سے دل میں ایک سکون بھرتا چلا گیا۔ اور پھر میں نے ایک اور بار آری کو ہوا میں بلند کیا اور پھر اس کے ہاتھوں پہ ماری۔ اس کے دونوں ہاتھ اب کندھے سے جدا ہو گئے۔ میرا جسم خون سے نہاتا گیا۔ مگر وہ خون اس وقت مجھے شفاف پانی لگا تھا جو اس کمینے کی غلاظت کو میرے جسم سے صاف کر رہا تھا۔ میرا پورا منہ خون سے سرخ ہو گیا۔

پھر میں نے آری کو اس کے لبوں سے پار کروایا اور پھر لمحوں کے وقفے کے بعد میں برق رفتاری سے آری کو اندر باہر کرتا گیا جب تک اس کا آدھا منہ کھل کے الگ نہیں ہو گیا۔اس کی زبان الگ ہو گئ تھی۔جڑ سے لگے دانت آدھے ٹوٹ گئے تھے اور آدھے الگ ہو گئے تھے۔

پھر میں نے آری اس کی آنکھوں کے اندر ترچھا کر کے ڈالا کہ جس سے صرف آنکھیں ہی الگ ہو کے باہر آجائیں۔اس کی دونوں آنکھیں کسی گیند کی صورت الگ ہو گئیں۔میں نے دونوں آنکھوں کو ہاتھ میں اٹھایا اور مٹھی میں بند کر کے پھاڑ دیا خون اور عجیب سا مادہ ہاتھوں پہ پھسلنے لگا

اور پھر میں آری کو اس کے پیٹ کے نیچے لے کر گیا اور ٹانگوں کے بیچ سے آری کو آر پار کر دیا۔

ایک بار۔۔

دو بار۔۔

تین بار۔۔۔

"حرام خور! مر۔ مر۔ مر۔" میں اتنی زور سے چلایا تھا کہ میری اپنی آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس کی غیرت اور غرور کا لوتھڑا آدھا کٹ کہ خاک خاک ہو گیا۔

میرا جسم خون خون۔

میرے لبوں پہ خون کے چھینٹے آ گئے۔ لبوں کو زبان سے لگاتے میں نے اس کا ذائقہ چکھا۔

"vibrant taste"

وہاں کھڑے ہر شخص اس دن مجھ سے ڈرا تھا۔ میں خود بھی۔۔

لت، ہوس، شوق اور جنوں کے ملے جلے تاثر کیساتھ میں نے اس رات سکون سے خود کو خون سے صاف کیا اور پھر اس رات طویل نیند سویا۔

میں نے اپنے پہلے ریپسٹ کو ایک اسیسن بنتے ہوئے بے دردی سے مارا تھا۔

اور مجھے رتی برابر بھی گلٹ نہیں تھا۔

~~~~~

اپنے دو تشدد کار کو میں نے بینکاک میں اسیسن کلر کی ٹریننگ کے دوران قتل کیا تھا اور پھر مجھے واپس لاہور بھیج دیا گیا۔
~~~~~

لاہور میں میں نے اپنے باقی چار تشدد کاروں کو کرائے کا قاتل بنتے ہوئے مارا تھا۔

اور پھر میں نے اپنا سگنیچر اسٹائل بنایا۔

وہ پاکٹ واچ اب بھی میرے پاس تھی۔ وہی گھڑی جو میں نے اپنے پہلے تشدد کار کی جیب سے چرائی تھی۔ جس کے پیچھے وہی عبارت لکھی تھی جو اس کے لاکٹ پہ، اس عبارت کا ترجمہ شاید میرے لئے ہی تھا۔ میرے لئے ہی لکھا گیا تھا کیونکہ وہ ترجمہ، وہ عبارت مجھے اور ارحم کو ملاتی تھی، دو ایمان فروشوں کو، بس ہم میں فرق یہ تھا کہ میں انسان تھا، وہ حیوان۔

لاہور میں میں نے تمام معلومات اکھٹی کی تھیں۔ ارحم اور اس کی فیملی اپنے پرانے گھر واپس چلے گئے تھے کیونکہ اس کی دادی کی طبیعت خراب تھی اور اس

کے چاچو نے اپنے بڑے بھائی کو واپس بلالیا تھا۔میں نے ارحم کی فیملی کی ہی معلومات اکھٹی کی تھیں کیونکہ وہی زیادہ اہم تھا۔مگر ساتھ میں نے اس کے چاچو کی فیملی کی بھی معلومات نکلوالی تھیں۔

اور کراچی جانے سے ایک رات پہلے میں نے "اس کا" چہرہ دیکھا تھا۔

اس کے بال وولف کٹ میں تھے اور چہرے پہ میرے جیسا ہی گول چشمہ تھا۔اس تصویر میں وہ لیپ ٹاپ پہ جھکی ہوئی تھی اور شاید کسی کام میں مصروف تھی۔اس کا ایک بھائی بھی تھا جو اس تصویر میں اس کے برابر بیٹھا کتاب پہ شاید اسکول کا کام کر رہا تھا۔

اور اس دن،اس رات،اس کو دیکھنے کے بعد میرا دل شاید پلٹ گیا تھا۔

اس رات میرے دل نے کہا تھا کہ ہر شخص موت کا حق دار نہیں ہوتا۔

کچھ لوگوں کو زندگی جینے کا حق ہوتا ہے کیونکہ وہ کسی کے دشمن نہیں ہوتے۔ کچھ لوگوں کی وجہ سے ہی ان کے آس پاس کے لوگوں کی زندگی ہوتی ہے۔

اور پھر میں نے ارحم کا سوچا، ایک حیوان اس کے قریب آ رہا تھا۔ ایک فرشتے کے پاس ایک شیطان جا رہا تھا۔

اور اس رات میرا دل بدل گیا تھا۔

میں کراچی اب صرف اپنے آخری ریپسٹ کو مارنے نہیں جا رہا تھا۔

میں کراچی اب کسی کی حفاظت کرنے بھی جا رہا تھا۔

~~~~~

(لاہور، حال)

اس جگہ اب بھی دھول اٹھ رہی تھی۔ کھڑکی سے آتی سورج کی کرن اس اندھیر جگہ کو تھوڑا روشن کرنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ اس جگہ ہر چیز، ہر فرنیچر پہ
~~~~~

سفید چادر بچھی تھی۔روشنی اور دھول ایک عجیب سی شعاع کا امتزاج برپا کر رہی تھیں۔

مگر وہ دونوں آس پاس کے ماحول سے بے نیاز کھڑے تھے۔ارمغان نے ایرج کے سر کے اوپر اپنی تھوڑی ٹکائی ہوئی تھی حالانکہ اس کے ہاتھ پہلو میں گرے ہوئے تھے۔اور ایرج کا چہرہ اس کی گردن میں دھنسا ہوا تھا۔ایرج کا ہاتھ اسکی پیٹھ پہ، اسے گلے لگاتے بندھا ہوا تھا۔

وہ دونوں بے آواز رو رہے تھے۔حلق سے آنسو اندر دبانے کی کوشش رائگاں جا رہی تھی۔ارمغان نے حلق سے آواز نکالنا چاہی مگر آنسو کا پھندا حلق میں اٹک رہا تھا۔وہ گھونٹ گھونٹ بھرتا اس احساس کو محسوس کر رہا تھا۔ہر ایک لمحے کو، ہر ایک سانس کو۔

"ارحم بچوں کے ساتھ یہ کر سکتا ہے تو وہ تمہارے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا ایرج"اس نے سانس لینے کا وقفہ لیا۔

"میں نے ان تمام سالوں کو، اپنی زندگی کو تمہاری اور تمہارے گھر میں موجود معصوم لوگوں کو بچانے میں گزار دی جو ارحم جیسے حیوان سے بے خبر تھے"

"ہاں۔۔۔اس راہ پہ چلتے میں نے بہت غلط کام کیے، بہت غلط قدم اٹھائے ہیں جو کہ میری مجبوری تھی، مگر میں تمہیں کبھی اذیت دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

اس کے آنسو بہہ کر ایرج کے بالوں میں سمٹ رہے تھے اور ایرج کے آنسو ارمغان کے گریبان میں۔

"میں تمہیں کبھی ان راتوں سے گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا جن سے کبھی میں گزرا تھا۔ تم اس زندگی کو خوش دلی سے جینے کی حقدار تھیں۔۔۔اور میرا حق تھا کہ میں تمہاری زندگی کے راستے سے ان تمام کانٹوں کو ہٹا دوں جو تمہاری زندگی میں غم کے سوا کچھ نہیں لائے۔"

اس کی آواز ایک بار پھر اٹکی تھی، مگر اس نے گلا کھنکھارتے ہوئے آواز نکالی، لفظ ترتیب دیے۔اس کی ناک سرخ ہو گئی تھی۔ماضی کی بری یادیں حال کو ایک اچھی یاد بنا رہی تھیں۔

"میں کبھی بھی تمہارے راستے کا کانٹا نہیں بننا چاہتا ہوں، ایکویرس۔ میں تمہاری زندگی کا سیاہ پھول بننا چاہتا ہوں جسے تم اپنے ساتھ اس قوس وقزح کے رنگوں جیسے سفر پہ لیتے ہوئے چلو۔"

"میں حیوان نہیں ہوں، میں انسان ہوں۔ میں جانور نہیں ہوں، میں ایک عام سا انسان ہوں جس کا ایمان مر چکا ہے، جو مومن نہیں رہا ہے، مگر جو احساس رکھتا ہے۔"

وہ ایرج کا چہرہ اپنی گردن پہ محسوس کر سکتا تھا۔ اسکے آنسو اپنی جلد پہ محسوس کر سکتا تھا۔

"میں نے ان سالوں میں تم سے نفرت نہیں کی ایرج۔میں نے اپنی زندگی میں تم سے صرف محبت کی ہے،اور تمہاری فکر۔"

ان دونوں نے آنکھیں موند لیں،وہ دونوں ان الفاظ کو دل میں ثبت کر رہے تھے جو ارمغان بول رہا تھا۔ارمغان کو اپنی زندگی میں پہلی بار اندھیرا خوبصورت لگا تھا۔

ارمغان نے ایرج کو شانوں سے تھامتے ہوئے خود سے جدا کیا۔وہ آنکھوں میں درد لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن۔۔۔لیکن اگر تم کہو گی کہ میں تمہاری زندگی سے چلا جاؤں۔۔"اس کے الفاظ پہ ایرج نے اس کی شرٹ مضبوطی سے تھامی تھی۔ارمغان نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں تھیں۔

"تو میں۔۔۔۔تو میں انہی کانٹوں کی طرح تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا جن کو تمہاری زندگی سے ہٹانے کا میں نے تم سے چند سال پہلے یک طرفہ وعدہ کیا تھا۔"

ایرج اس کی بند آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔اس نے ارمغان کی شرٹ کو کھینچا تھا۔ اور پھر ہاتھ کا مکا بناتے ہوئے اس کے سینے میں، بالکل دل کے مقام پہ جڑ دیا۔

"تم کبھی اچھا نہیں سوچنا اپنے لیے۔"اس نے ایک اور مکا مارا۔اور پھر ارمغان نے اس کا ہاتھ تھاما۔ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔اور دونوں پہلی بار ایک ساتھ ہنسے تھے۔دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے،آنسو قطار در قطار اسکی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔

ایرج نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر اس نے ارمغان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور اس کی آنکھوں تک لے گئی۔ ارمغان نے آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایرج نے اس کی دونوں آنکھوں سے بہتے آنسو کو پونچھا اور ارمغان کا چہرہ تھاما۔

ارمغان نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نظر سامنے کھڑی ایرج پہ پڑیں، اس کی زندگی میں اس سے حسین منظر اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ مگر اس منظر میں ایک چیز غلط تھی،

ارمغان نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے چہرے سے ٹپکتے آنسو صاف کیے۔

اور اب وہ منظر ہر عیب سے پاک ہو گیا تھا۔

وہ دونوں کتنے ہی لمحے ایسے کھڑے رہے۔اندھیرے اور روشنی میں، بالکل اُن کی کہانی کی طرح۔دھول کے ذرات دھوپ کی کرن میں اڑ رہے تھے۔اور دھوپ ان کو اور خوبصورت بنا رہی تھی۔

ایرج نے بولنے کے لیے لب کھولے تھے مگر اس نے نفی میں سر ہلاتے اسے روک دیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اس کو کہتے وہ سیڑھیاں عبور کرتے گیا۔اس کے پیچھے وہ بھی آہستہ آہستہ، گھر کا جائزہ لیتے، سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

ٹوٹے مکان، ایک بار گر جائیں،

پھر ویسے بنتے کہاں ہیں۔۔۔

جیسے تھے تو نے اپنے دل سے بنائے۔

وہ اس مکان کی ہر ہر چیز کو نظر دو نظر دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی مکان تھا جہاں ارمغان نے اپنی زندگی کے سب سے اچھے اور سب سے برے دن گزارے تھے۔

اسے ارمغان کے لیے دکھ ہو رہا تھا، بے حد۔ مگر وہ کچھ سوچنے سے قاصر تھی۔ اس کا دماغ اس کے دل کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اسے ارمغان سے ہمدردی اور ارحم سے غلاظت محسوس ہو رہی تھی مگر اب بھی ارمغان اس کے لیے بالکل اچھا اور ارحم اس کے لیے بالکل برا نہیں ہوا تھا، حالانکہ ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ اب بھی پہلی سیڑھی پہ تھی۔ ہاں، ارمغان کے لیے اس کے دل میں ایک چمک اجاگر ہوئی

تھی۔اسے ارمغان برا نہیں لگا تھا۔اس کی محبت، جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا، وہ ایک ریپیسٹ اور پیڈوفایل تھا۔اور جو اس سے محبت کرتا تھا وہ اسٹاکر اور ہائپر۔ دونوں میں انتخاب کرنا مشکل تھا، مگر سوال یہ تھا کہ کیا وہ ان دونوں میں سے کسی کو چننا چاہتی بھی تھی یا نہیں، وہ ارمغان کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتی تھی بھی تھی یا نہیں؟

وہ دوسری منزل تک آئی اور ارمغان کو تلاش کیا۔یہ جگہ کافی خالی اور کافی بڑی تھی۔ماربل کے فرش تھے۔یہ شاید آمنہ چاچی اور خالد چاچو کا پورشن تھا۔وہ سب کہاں چلے گئے تھے؟اسے معلوم نہ تھا۔

اس نے ارمغان کو تلاشنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔اس نے ارمغان سے اس ڈریگن کے بارے میں بھی پوچھنا تھا جو اس کی پیٹھ پہ سجا ہوا تھا۔مگر پتا نہیں وہ کہاں تھا۔

وہ کھلی گیلری کے قریب آئی اور باہر کا نظارہ دیکھا۔اسے سامنے گیلری کی دیوار پہ آویزاں پینٹنگ دکھائی دی۔وہ دور بس ایک تکون سا دیکھ پائی تھی۔پھر چلتے چلتے اس دیوار کے قریب آئی،اور تصویر کچھ واضح ہوئی تھی۔

سرمئی کینوس پہ ایک تکون بنا ہوا تھا۔اس نے انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے محسوس کیا کہ پینٹ اب بھی گیلا ہے۔

اس تکون کے اندر ایک آدمی بنا ہوا تھا جس کا جسم واضح تھا مگر اس کے چہرے کی جگہ الگ الگ زاویوں سے نشان مارے گئے تھے، جس کے باعث اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔

ایرج نے پھر اس تصویر کو اور غور سے دیکھا تو اسے نظر آیا کہ اس تکون کے کونوں پہ الگ الگ حرف لکھے ہوئے تھے۔ بائیں طرف کے کونے پہ "ج" لکھا ہوا تھا۔ اوپر کے کونے کی طرف "ر" لکھا ہوا تھا اور تیسری طرف "ح" لکھا ہوا تھا۔

ایرج نے نیچے پینٹنگ کا کیپشن پڑھا تو وہ کوئی شعر تھا۔

"جرح اک راہ ہے،

جنون سے حیوان کی،

محبت کے امتحان کی،

انسان سے شیطان کی۔"

اس شعر کو پڑھ کر وہ اور الجھ گئی۔اس سے کیا مراد تھا؟اس نے تصویر کو پھر دیکھا۔

"جرح ایک راہ ہے، جنون سے حیوان کی۔"

اس نے دہرایا۔ جرح کے معنی زخم، اور زخم ایک راہ ہے، جنونیت سے حیوانیت کا۔

ایرج کو اس پینڈنگ نے انٹریگ کیا تو وہ وہیں تسلی سے کھڑے ہو کر اس کا مطلب سمجھنے لگی۔

”محبت کے امتحان کی۔۔۔ جرح ایک راستہ ہے محبت کے امتحان کا۔“ اس نے دو جمع دو چار کرنے چاہے۔

”محبت کا امتحان، محبت کی جدوجہد، محبت کی جنگ کی راہ جرح ہے، یعنی محبت کا امتحاں شروع ہی زخموں سے ہوتا ہے، اور محبت کی جنگ کا اختتام بھی زخم دیتا ہے۔ یعنی محبت نام ہے زخم برداشت کرنے کا؟“ اس نے ایک ہاتھ منہ کے نیچے ٹکا لیا۔

”انسان سے شیطان کی۔ جرح ایک راہ ہے انسان سے شیطان بننے کی۔۔“

''انسان کو ایک جرح کی ٹھوکر لگتی ہے بس، انسان سے شیطان بننے میں، یا شیطان سے انسان بننے میں۔''

اس کے چہرے پہ عجیب سا تاثر نمایاں ہوا تھا۔۔۔اس نے پینٹنگ کو اتارا اور پینٹر کا نام تلاش کرنا چاہا۔نہ کوئی نام تھا، نہ کوئی دستخط۔وہ مایوس ہوئی تھی۔

اس نے اپنے پیچھے دروازہ کھلتے سنا۔اور اس کے پلٹنے سے پہلے ہی ایک آواز آئی جس نے اسے برف کر دیا۔

''تمہیں پینٹنگ کیسی لگی؟'' وہ اسکی کزن، سارہ کی آواز تھی۔

~~~~~

(کراچی، حال)

اس نے سفید سادی شرٹ کے بٹن بند کیے اور اس کے اوپر اولیو گرین جیکٹ پہنی۔

بالوں کو سیٹ کرتے اس نے اپنا حال دیکھا۔

پھر خود سے نظریں چراتے اس نے پستول اٹھائی اور اس میں چھے گولیوں کو لوڈ کر دیا۔
~~~~~

وہ جا رہا تھا۔

ایک ایسا کام کرنے جس کی اسے خواہش نہیں تھی۔

مگر خدا کا حکم تھا، اور وہ خدا کا بندہ تھا۔

اس نے گھڑی پہنتے وقت دیکھا۔ ابھی فلائٹ کی بورڈنگ ہونے میں کافی وقت تھا۔
بیگ کو ایک اور بار چیک کرتے اس نے سب فائنل کر لیا۔

اس کے کمرے پہ دستک ہوئی تو اس نے دروازہ کھولا، وہاں دانیہ کھڑے دیکھ رہی تھی۔

"سر آپ کے گیسٹ آئے ہیں۔"

وہ مسکرایا۔

~~~~~

(لاہور، حال)
~~~~~

وہ برف ہوتے وجود کے ساتھ پلٹی،اور قدم خود بخود چل اٹھے۔

اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا ہے۔مگر دل میں سکون اتر رہا تھا۔اطمینان طاری ہو رہا تھا۔اس نے اپنے وجود کو وہیل چیئر کے قریب تقریباً گرتے ہوئے محسوس کیا۔اور پھر اس نے اپنی کزن،سارہ اور اپنے بھائی،سعد کو گلے لگایا۔

وہ تینوں سسکیوں کے ساتھ رو رہے تھے۔ایرج،سارہ،سعد۔سب کتنا مکمل لگ رہا تھا۔سب کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔تینوں کے سر ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے اور تینوں آنکھیں بند کیے بس آنسو بہائے جا رہے تھے۔ان تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا۔

ان سے ذرا فاصلے پہ ارمغان کھڑا تھا۔ہاتھ میں چند کاغذ تھامے وہ ان تینوں کو نم آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔اس کے چہرے پہ ایک زخمی سی مسکراہٹ تھی،زخمی سی یادیں۔

ایک فیملی،بہن بھائی،جدا ہو کر واپس مل گئے تھے۔کیا اس کی بہن واپس نہیں آسکتی تھی؟کیا اس کو ایک موقع نہیں مل سکتا تھا؟

اس نے ان تینوں کو ڈسٹرب نہیں کیا،یہ ان تینوں کا مومنٹ تھا۔اور وہ اسے جی رہے تھے۔

نجانے کتنے ہی پل ایسے بیت گئے تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔اس نے پھر ایرج کی آواز سنی۔ سر اٹھاتے ہوئے اس نے ایرج کا آنسو سے تر ہوتا سرخ چہرہ دیکھا۔اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں اور لب تھرتھراہٹ سے ہل رہے تھے۔

سارہ نے ایرج کو مخاطب کیا تو ان سب نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم بین کاک میں تھے، ایرج۔ جب میں اغوا ہوئی تھی تو مجھے لگا تھا کہ میں نے سب کھو دیا۔ میں جہنم میں چلی گئی۔ مگر پھر میں سعد سے ملی۔ سعد بہت بدل گیا ہے۔ ہم سب بہت بدل گئے ہیں، شاید ہمارے گھر کے راز کھل گئے، اسی لیے۔ ارمغان نے ہمیں پھر اس جانور کی حقیقت بتائی جو ہمارے گھر میں بچپن سے پل رہا ہے، اور اس کو میں اب اپنا بھائی نہیں کہہ سکتی۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ جہنم میں تو ہم زندگی بھر رہتے آئے تھے بس ہمیں وہاں کی آگ اور شیطان کا علم نہیں ہو سکا۔

جس گھر کو ہم جنت کا پھول سمجھتے تھے وہ جہنم کا دلدل تھا۔اور جسے ہم فردوس کا فرشتہ سمجھتے تھے وہ ابلیس کی اولاد۔"

ایرج نے آنکھیں موند لیں۔اس کی زندگی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی تھی جو انسان تھا بھی کہ نہیں؟سارہ کی آواز بہت بدل گئی تھی۔وہ اب ٹھہر ٹھہر کر اور دھیما بولنے لگی تھی۔اور سعد جہاں پہلے تھوڑا بہت بولتا تھا،اس نے تو جیسے بولنا ہی چھوڑ دیا ہو۔

سب کچھ بدل گیا تھا۔

"دیتھ ان ڈز گائس۔"اب کی بار ارمغان بولا۔

”میں نے پہلے سعد کو "اغوا" کیا۔اور پھر سارہ کو۔سارہ کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں۔مگر یہ سب اس کی ہی حفاظت کے لئے تھا۔ہم نے سارہ کی ایڈمٹ کارڈ اور ٹانگوں کی بے جان ہڈیاں استعمال کر کے اسے مردہ منسوخ کروایا۔اور پھر میں نے دونوں کو اسمگل کر کے بین کاک منتقل کروادیا۔کیونکہ تھائی لینڈ پاکستان سے زیادہ محفوظ ہے۔“

اسے آگے بولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ایرج کی آنکھوں میں آنسو پھر سے جمع ہو کر بہنے لگے تھے۔وہ ٹیک ہٹا کر اس کے قریب آیا اور اس کے پاس زمین پہ بیٹھ گیا۔

"ایم سوری ایرج۔ اگر میں نے تمہیں کبھی تکلیف دی ہو، ایم ریلی سوری۔" اس کا خود کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ دھیمی آواز اور بھاری گلے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ہاتھ میں کاغذات بھی ہنوز تھامے ہوئے تھے۔

"لیکن اگر میں نے تمہیں کبھی بھی کوئی تکلیف دی، تو غیر ارادی طور پہ۔" وہ دونوں سارہ کے بے جان پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سعد پیچھے کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"سعد نے بین کاک جاتے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا،" اس نے آہستہ سے سر اٹھا کہ سعد کو دیکھا۔

"کہ میں اس کی بہن کی ہمیشہ حفاظت کروں۔" اب ایرج نے بھی چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت پتلا ہو گیا تھا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔

"ایرج!" اسنے ایرج کو دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ جب میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا، اور جب تم میرے اندر باہر سے واقف ہو جاؤ گی، تب میں تم سے ایک سوال پوچھوں گا۔"

اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کاغذات اپنے اور اس کے درمیان رکھ دیئے۔ ایک ساتھ رہنے کا وعدہ ان کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔

"تم اب مجھ سے واقف ہو، میں کیا ہوں، کیا نہیں، تم جانتی ہو۔ تم پہچان گئی ہو کہ میں سیاہ آسمان ہوں اور تم اس پہ چمکتا چاند۔ مگر میں تمہارے بغیر خالی ہوں، اندھیر۔" اس نے اپنا ہاتھ دل کے مقام پہ رکھا۔

"کیا تم میرے سیاہ آسمان پہ روشنی پھیلاؤ گی، ایرج؟ کیا تم مجھے اپنی زندگی میں شامل کرو گی، ایرج؟"

اس نے اپنی سیاہ آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملائیں۔ اور اس نے شدت سے چاہا تھا کہ وہ اس منظر، اس لمحے کو ہمیشہ کے لیے ایسے ہی قید کر لے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نجانے کتنے لمحے دیکھتے رہے، ایک دوسرے کے اصل سے واقف ہوتے رہے۔ پھر ایرج نے ان دونوں کے درمیاں اس طلسم کو توڑا اور نظر پھیر کہ

سارہ کو دیکھا۔وہ اسے اس وقت اپنی بڑی بہن لگی تھی۔ جیسے اس کی رائے مانگ رہی ہو۔سارہ مسکرا رہی تھی، جیسے اسے اپنی مرضی اختیار کرنے کا کہہ رہی ہو۔

"یہ۔۔۔؟"اس نے پیپرز تھامتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ نکاح کے پیپرز ہیں"اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے قلم آگے بڑھایا۔دل دھڑک رہا تھا۔دور کہیں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

"ان پہ سائن کرو،ایرج۔"اسنے ایرج کو نکاح کے کاغذ کھولتے ہوئے کہا۔

زندگی ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ ہجر کی ان تمام راتوں کے بعد دل پہ سویرا چھانے لگا تھا۔

ایرج کی نظریں ارمغان سے ملیں، دونوں کے لب سلے ہوئے تھے۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ ایرج کسی سوچ میں گم ہے۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔

ایرج نے نظریں جھکا کر پیپرز کو دیکھا۔ اس پہ ایک بھی شرط پہ کراس نہیں لگا تھا۔ اس کا دل پلٹ رہا تھا، مگر کس سمت؟

”میں نے تم سے صرف محبت کی ہے۔“

وہ قلم کا ڈھکن کھول رہی تھی، کیا وہ یہ کرنا چاہتی تھی؟

"کیا تم مجھے اپنی زندگی میں شامل کرو گی، ایرج؟"

اس کے کہے لفظ دماغ میں چبھ رہے تھے، قلم کاغذ پہ بڑھ رہا تھا۔ سماعتوں سے اذان ٹکرا رہی تھی۔

"بزدل، کمزور، ٹوٹی ہوئی، ٹریش۔"

ایک دم اس کے ہاتھ تھم گئے تھے۔ سر میں درد کی لہر اٹھی تھی۔

"پچ۔"

اس نے آنکھیں بند کیں۔

نہیں۔۔۔۔

ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

اسے سب بھلا دینا چاہیے تھا، ارمغان ایسا نہیں تھا، اس نے غصے میں بولا تھا۔ اسنے سوری بھی کر لیا تھا۔

ایک دم اسے اپنے لبوں پہ کڑوا سا احساس ہوا۔

"جب تم چپ رہتی ہو، خدا کی قسم بس تبھی اچھی لگتی ہو۔"

اس نے آنکھیں کھولیں تھیں۔۔۔

اسے بھول جانا چاہیئے تھا،

ارمغان ایسا نہیں ہے، اس نے خود کو بتایا۔

وہ اس نے غصے میں۔۔۔۔

"مگر کبھی اس نے یونہی غصے میں تمہیں طلاق دے دی تو تم کیا کرو گی ایرج؟"

اس کے دماغ میں جھماکے ہونے لگے تھے۔

”نہیں، وہ ایسا نہیں کرے گا، وہ تو تم سے محبت کرتا ہے، اس نے تمہیں اتنے سال چاہا ہے، وہ ایسا کیوں کرے گا۔“

ایک اور خیال نے ذہن میں جنم لیا۔

”وہ قاتل ہے۔۔۔“

نہیں۔۔۔وہ قتل نہیں ہے۔

”اس نے تمہیں اسالٹ کیا ہے ایرج، اور تم اسی کے پاس جا رہی ہو؟“

نہیں،اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔وہ بار بار خود کو سمجھا رہی تھی۔مگر ذہن سے یادیں نہیں جا رہی تھیں۔

"اسٹاکر کبھی اچھا شوہر نہیں ہوتا۔۔۔"

نہیں۔۔۔وہ محبت کرتا ہے مجھ سے۔۔۔وہ ایسا نہیں کرے گا۔

"اگر اس نے تمہارے ساتھ میریٹل ریپ کیا،تو تم کیا کرو گی۔۔؟اگر اس نے تمہارے بچے کو قاتل بنا دیا؟اور یہ سب کر کے سوری بول دیا،پھر؟"

نہیں۔۔۔میں بھی اس سے محبت کروں گی، میں اس کو اجازت دے دوں گی۔۔

اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔

"اور اگر تم نہ دے پائیں اجازت، اور اس کی ہوس پروان چڑھ گئی۔۔۔پھر؟"

نہیں۔۔۔وہ ہوس کا پجاری نہیں ہے۔۔

"وہ تمہیں تباہ کر دے گا، وہ تمہیں مینیپولیٹ کر رہا ہے۔۔"

اور ایرج کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔

اس نے دورو----ارمغان کے طرف دیکھا۔۔

تمام میں سناٹا چھا گیا تھا،اذان مکمل ہو چکی تھی۔

''میں۔۔۔میں تم سے نکاح نہیں کر سکتی۔۔''

اس کی شکل پہ خوف طاری ہو گیا تھا۔ان تینوں نے اسے حیرانی اور شاک سے دیکھا۔

ارمغان کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس کی بات کا مطلب کیا تھا۔ مگر اس نے ایرج کی شکل کو پڑھنے کی کوشش کی۔

"اوکے۔۔۔اوکے مجھے لگتا ہے مجھے یہ بات ابھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔۔آئی نو تم ٹف ٹائم سے گزر رہی ہو۔ تم۔۔۔ تم ان پہ بعد میں سائن کر دینا۔۔۔اٹس اوکے اور۔۔۔۔" وہ سر جھکاتے ہوئے کاغذ اٹھانے لگا۔

"نہیں ارمغان۔۔۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے مجھے اور میری فیملی کو پروٹیکٹ کیا۔ تم نے ہمارے سامنے ایک ایسے جانور کی حقیقت رکھ دی جو شاید ہی ہم کبھی جان پاتے۔ تمہارے لیے میرے دل میں ایک مقام بن گیا ہے جسے میں خود نہیں جان پائی۔۔ارمغان، مجھے تم سے ہمدردی ہے، مگر میں تمہارے ساتھ زندگی کو آگے نہیں بڑھا سکتی، نا ابھی، نا بعد میں۔"

ارمغان کو لگا اس کے دل پہ کسی نے رکھ کر ایسا ہتھوڑا مارا ہو کہ درد چند پل محسوس ہی نہیں ہوا ہو۔

”ایرج۔۔۔۔“اس نے ارمغان کی بات کاٹ دی۔

”تم ایک اسٹاکر اور قاتل ہو ارمغان۔۔ تمہیں اپنی حقیقت جاننے ہو گی۔ارحم برا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرے لیے دروازے پہ ٹھہرے شہزادے ہو۔“ہر بار کی طرح منفی سوچ جیت گئی تھی۔ مگر اسے خود کے لیے یہ کرنا تھا۔ اسے اب کمزور نہیں پڑنا تھا۔

"میں نہیں جانتی کہ میں کبھی شادی کروں گی بھی یا نہیں، میں ان رشتوں کو سوچنے کی اب سکت نہیں رکھتی۔۔ تمہیں مجھ سے بہتر مل جائے گا ارمغان، یا مجھ سے بدتر۔۔۔ مگر میں نہیں۔"

وہ اس کے دل پہ پاؤں رکھ کر دل کی آخری سانسوں کو مسل رہی تھی، جب سورج کی کرنیں آسمان پہ اٹھ رہی تھیں، اب اس کا دل بھی مغرب کے سورج کی طرح ڈوب رہا تھا۔ سب اندھیر ہوتا جا رہا تھا۔

"ہاں میں نے مانا کہ میں پرنس چارمنگ نہیں ہوں۔ مگر جن کو۔۔۔ جن کو۔۔۔"
اسے اپنی آواز آتی کمزور کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

وہ ایرج کو ایک اور بار نہیں ہار سکتا تھا۔۔۔

"مگر جن کو میں نے قتل کیا وہ میرے ریپسٹ تھے ایرج! ریپسٹ!" اس نے چہرہ اٹھا کر ایرج کو بے یقینی سے دیکھا۔

"وہ مرنا ڈیزرو کرتے تھے۔۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ آسمان سے چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا، دل سیاہ آسمان کی طرح اندھیر ہو رہا تھا۔

"تم نے ان کو قتل کیوں کیا ارمغان؟ تم نے ان کو سزا کیوں نہیں دلوائی! تم نے گناہ کیوں کیا؟" ایرج کے آنسو بہہ رہے تھے، ساتھ ساتھ جذبات۔

"جس قانون نے تمہارے پیڈوفایل کزن کو نہیں پکڑا وہ میرے ریپسٹ کو سزا دے کر مجھے حق کیا دلاتا۔۔" وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔

"تم۔۔۔ تم اچھے ہوار مغان مگر تم نے مجھے ان کمفرٹیبل کر دیا ہے۔ تم نے مجھے خود سے ڈرادیا ہے، تم نے مجھے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ میں تم کو اپنا ساتھی تصور کر سکوں۔۔" اس نے اپنی آواز اور مضبوط کرنا چاہی تھی۔

"میں نے تمہاری حفاظت کے لیے غلط راہ اپنائی مگر میں نے کبھی تمہیں تکلیف دینے کا ارادہ نہیں کیا۔۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔" اس کی آواز بلند ہو رہی تھی، بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"ہاں، مگر تکلیف دے ضرور دی" وہ تلخی سے اسے دیکھنے لگی۔ "تم نے مجھے exhaust کر دیا۔ تم نے مجھے haunt کیا۔ تم نے مجھے خود سے ان کمفرٹیبل کر دیا۔ تم نے مجھے جسمانی طور پہ محفوظ کر لیا مگر تم نے خود مجھے دماغی طور پہ تباہ کر دیا۔۔" ایرج کی آواز میں درد بھری چیخ واضح ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پہلو میں گرے ہوئے تھے۔

"تم سن بھی رہی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو ایرج!" ارمغان کی آنکھیں مکمل کھلی ہوئی تھیں۔ چہرے پہ عجیب سا تاثر تھا۔

"ارحم نے میرے دل کے ساتھ کھیلا، اور تم نے میرے دماغ کے ساتھ۔ تم دونوں نے مجھے ڈسٹرب کر دیا۔ تم دونوں نے مجھے مینیپولیٹ کیا۔" وہ اب اور

زور سے بولی تھی، آنسو بھی اسی رفتار سے بہہ رہے تھے۔اس نے اپنے کندھے پہ سارہ کا ہاتھ محسوس کیا۔

"حقیقت کا آئینہ دیکھانا مینٹلی ڈسٹرب کرنا ہوتا ہے؟" وہ اب ہنسا تھا۔

"تم نے مجھے اپنی پستول سے اسالٹ کیا، تم نے مجھے اسٹاک کیا۔ تم نے مجھے گالیاں دیں۔ تم نے میرے خیالات کو ایک کھلونا بنا کر ان سے کھیلا۔" وہ سر جھکائے بلند آواز میں رو رہی تھی۔

ارمغان نے اپنے چہرے پہ گرم آنسو کو محسوس کیا۔اس نے زمین سے کاغذات اٹھائے۔

”میں نے تم سے محبت کی ہے ایرج۔۔“اس کی آواز دھیمی ہوئی تھی، بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

”تم نے مجھ سے محبت کی ارمغان، مگر محبت کا ہر غلط راستہ اختیار کیا۔تم نے محبت نہیں، مجھ سے جنون کیا ہے۔اور جنون کا قابض ہو جانا حیوانیت کی شروعات ہوتی ہے۔“

اور اس نے درد سے آنکھیں بند کرتے نکاح کے پیپر زدو ٹکڑوں میں پھاڑ دیے، شاید دل کا بھی کچھ یہی حال ہوا تھا۔اس کا دل کسی نے اتنے برے طریقے سے چکنا چور کر دیا تھا کہ وہ اب واپس جڑنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔اور اسے لگا تھا وہ خود

کو پرنس چارمنگ سمجھ کر، آرام سے ایک ڈزنی پرنسس کو اپنا بنا لے گا اور اُن کا ہیپیلی ایور آفٹر ہو جائے گا۔

اس نے خود کو سمجھنے میں ایک اور بار غلطی کر دی تھی۔

وہ زمین سے اٹھا اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے اپنی پاکٹ سے سیل فون نکالا جو چند سیکنڈ پہلے میسج کی وجہ سے تھرتھرایا تھا۔

"ان لوگوں کی اگلے دو گھنٹے میں فلائٹ ہے۔ باس جلدی بتائیں کہ آگے کیا کرنا ہے، پلین ہائی جیک کرنے کا پورا منصوبہ تیار ہے۔ وہ لوگ یہاں آ گئے تو ہم سب مارے جائیں گے۔۔ باس ہم سب کی جان آپ کے ایک حکم پر ہے۔۔"

وہ میسج پڑھتے ہوئے زخمی سا مسکرایا تھا۔اب پلین ہائی جیک کروانے کا کیا فائدہ تھا؟ وہ تو پہلے ہی ایرج کو اپنا ہمسفر بنا بیٹھا تھا۔ایرج تو اس کی زندگی بن گئی تھی،ایرج تو اس کی طاقت بن گئی تھی۔ جس کے لیے، جس کے سہارے وہ دنیا سے لڑ رہا تھا، اپنی زندگی جی رہا تھا۔وہ تو اپنی زندگی کو ایک امید کے تحت گزار رہا تھا۔۔۔

اب طاقت ہی نہیں رہی تو لڑنے کا کیا فائدہ۔

اب امید ہی نہیں رہی تو زندہ رہنے کا کیا فائدہ۔

"میں وہاں پہنچ رہا ہوں، میرا انتظار کرو۔"

وہ اتنی جلدی مرنا نہیں چاہتا تھا۔۔وہ اسے اپنا ہوتے نہ سہی، مگر ویسے ہی دیکھنا چاہتا تھا۔اس نے فون پاکٹ میں ڈالتے ہوئے ایرج کی طرف دیکھا۔اوران آنکھوں میں ٹھہرے پانی نے ارمغان کی آنکھوں میں جلتی آگ کو راکھ کر دیا۔

محبت کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں۔

ہجر کی راتیں اور طویل ہو گئیں۔

ایک دوسرے کا ساتھ مٹی مٹی ہو گیا۔

حسین جھوٹ سا طلسم ٹوٹ گیا۔

جن باتوں کو سوچا تھا اس نے، بنائے گا اچھی یاد،

وہ بس اب کڑوے گھونٹ کے مانند رہ گئیں۔

''شکریہ ایرج۔۔۔''اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ مسکرایا۔

''میری موت آسان بنانے کے لیے۔''وہ گھٹنوں کے بل واپس بیٹھتا چلا گیا۔

''میں نے تم کو ایک اچھی یاد کے لیے اپنا بنانا چاہا تھا۔تاکہ جہنم میں کوئی تو میرا ساتھ ہو، جس کو سوچ کر میں اپنی زندگی کی سزا برداشت کر سکوں۔موت کو سکون کے ساتھ اپنا سکوں۔''ان دونوں کی آنکھیں اب بنجر ہو گئی تھیں،دل کی طرح۔کسی بھی نمی سے پاک۔

''مگر پتا ہے کیا۔۔؟تم نے اچھا کیا۔تم نے مجھے ابھی سے مار دیا۔''وہ زخمی سا ایک بار پھر مسکرایا،''اب دل ہی مر گیا تو روح نکلنے میں کیسی تکلیف ہو گی۔''پھر وہ ہلکا سا

ہنسا۔۔۔اور ہنستے ہنستے پتا نہیں کب آنکھوں میں پھر سے آنسو جمع ہونے لگے۔ایرج اسے ساکن ہوتی سانسوں کے ساتھ دیکھے گئی۔

بادل سیاہ ہو گئے تھے اور ان پہ کالے بادل بارش کی نشاندہی کر رہے تھے،وہ کھلی فضا میں زمین پہ بیٹھے ہوئے تھے۔

''تم نے۔۔۔تم نے اپنا دل بچا لیا۔۔۔دیکھو تم۔۔۔''اس کی آواز گلے میں پڑتے آنسو کہ پھندے کے باعث اٹکی۔

''تم نے خود کو چن لیا،تم کتنی مضبوط ہو گئی۔۔۔مجھے تم پہ۔۔۔بہت فخر ہے،ایرج جاوید صدیقی۔''

اس نے آنکھوں کو بند کر کے واپس کھولا۔

''اچھا مجھ سے ایک وعدہ کرو،''اس نے ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا،اور ایرج نے اس کی آنکھوں سے ایک پل کے لیے بھی نظر نہ ہٹاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''مجھ سے وعدہ کرو کہ۔۔۔''ان دونوں کے آنسو ایک ساتھ قطرہ قطرہ بہنا شروع ہو گئے تھے۔

سعد نے آگے قدم بڑھائے تھے مگر سارہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھ سے وعدہ کرو کہ جب میں مر رہا ہوں تو مجھے بچا کر تم گناہ نہیں کماؤ گی۔"

ان دونوں نے نظروں کا تسلسل توڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ ماتھا ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں کے ہاتھ درمیان میں پہلو میں گرے ہوئے تھے، مگر ساتھ جڑے ہوئے۔

"مگر تم میری قبر پہ مٹی ڈال کر ثواب ضرور کمانا۔"

اس نے ایک بار پھر درد بھری ہنسی کے ساتھ کہا، اس نے اب ایرج کی سسکیوں کو سنا تھا۔

”میری حقیقت تو موت ہی تھی، میں اسے مطمئین ہو کر گزاروں گا۔۔۔“وہ رندھے گلے کہ ساتھ بولتا جارہا تھا۔

”تمہاری حقیقت زندگی ہے ایرج، تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم زندگی کو مطمئن ہو کر گزارو گی۔“ایرج نے سر اٹھا کر ارمغان کو دیکھا۔اس نے زور سے اس کا ہاتھ دبایا جیسے اور مضبوطی سے تھاما ہو۔

آسمان اندھیر ہو گیا تھا اور بجلی کڑکنے لگی تھی۔

''وعدہ کروایرج۔۔۔''ارمغان نے سر اٹھا کر، آنکھیں کھولتے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ایرج نے سر نفی میں ہلایا تو اس نے ایرج کا ہاتھ چھوڑا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں سمیٹ لیا۔

''ایرج۔۔۔مجھ سے وعدہ کرو۔''اس نے ایک بار پھر کہا۔وہ بہت مشکل سے اپنے آنسو روک رہا تھا۔

''نہیں۔۔۔''اور ایرج اتنا ہی بول پائی کہ اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

''ایرج۔۔میری یہ آخری بات مان لو۔۔پلیز۔۔مجھ سے اپنی زندگی کا وعدہ کرو۔'' اس کی آواز ختم ہونے لگی تھی۔ایرج نے بہت آہستہ سے گردن اثبات میں ہلا دی۔

وہ دونوں نجانے کتنے ہی لمحے یوں بیٹھے بیٹھے روئے تھے جب سارہ اور سعد ان سے لپٹ گئے۔

بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا مگر ایرج نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔اس نے ایرج کو دیکھا مگر وہ اسے سخت نظروں سے دیکھ رہی تھی۔۔۔ارمغان نے گہری سانس لیتے ہوئے دوسرا ہاتھ بڑھایا اور ایک ایک کر کے اس کی انگلیاں اپنے ہاتھ سے ہٹانے لگا۔

”مجھ سے محبت نہ کرنے کے لیے شکریہ۔“اس کا ہاتھ بے جان سا پہلو میں گر گیا۔

"خدا حافظ!"

وہ پلٹتے ہوئے زینے کی طرف بڑھا۔ موت کی گنتی شروع ہوگئی تھی۔ اسے بھی اب بس موت کا انتظار تھا۔ کیونکہ زندہ رہنا ہر سانس کے ساتھ عذاب ہوتا جارہا تھا۔

سب کتنی جلدی ختم ہوگیا تھا، چند لمحوں میں۔ محبت کبھی کامل ہوتی ہے کیا؟

اس کو محبت کرنے ہی نہیں چاہئے تھی۔۔

ہاں۔۔۔سب اسکی غلطی تھی۔۔

اس نے سیڑھی پہ پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ اسے ایرج کی آواز آئی۔

"تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟"

اس کے قدم زنجیر ہوئے تھے، مگر وہ پلٹا نہیں۔ اس نے اپنی طرف اٹھتے اس کے قدم محسوس کر لیے تھے۔ آنکھیں بے ساختہ بند ہو گئیں۔

"کہ تم میرے ساتھ جو مرضی میں آئے، کر لو گے، جب چاہو کہ مجھے حاصل کر لو گے، جب چاہو گے، مجھے اکیلا چھوڑ دو گے؟"

اس کے قدم دھیمے تھے، وہ لمحہ سال لگ رہا تھا۔

"میری طرف دیکھو۔"

اور وہ اس کا کہنا کیسے نہ مانتا۔وہ پلٹا۔اور اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اسے وہ اجنبی سی لگی تھی۔

"یہ محبت تھی تمہاری۔جسے تم نے پل میں چھوڑ دیا؟"ایرج سخت لہجے میں کہہ رہی تھی اور وہ ایرج کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔

"تم خدا حافظ کہہ دو گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بھی کہہ دوں گی۔"وہ اس کے اور قریب آئی تھی۔

”تم نے مجھے اپنی کہانی سنا دی ارمغان۔“ وہ گال پہ ہاتھ پھیرتے آنسو صاف کرنے لگی۔

”مگر ہماری کہانی ابھی ان کہی ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس میں نکاح کے دو ٹکرے ہوئے کاغذ رکھے ہوئے تھے۔

”تم نے مجھے اپنی کہانی سنا دی ارمغان، مگر تم مجھے اب ہماری کہانی سناؤ، اپنے زاویے سے۔“ اسنے ارمغان کا پہلو میں گرا ہاتھ تھاما اور اسکی ہتھیلی پہ نکاح کے کاغذ رکھے۔

”اور پھر میں تم سے پوچھوں گی، کہ کیا تم مجھے اپنی زندگی کا حصہ بناؤ گے، ارمغان مطاہر علی؟“

اس نے ارمغان کا وہی ہاتھ تھاما تھا۔ان دونوں کے لمس نکاح کے کاغذ سے مل گئے تھے۔

وہ بدقت مسکرا بھی نہیں سکا تھا۔

یہ قدرت کا کیسا تماشا تھا، خدا کا کیسا معجزہ تھا کہ شیطان کو بھی ایک موقع فراہم کر دیا گیا تھا۔۔

اس نے ایرج کی آنکھوں میں دیکھا جو چہرہ ترچھا کیے اسے دیکھ رہی تھی۔۔اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکان تھی۔

سارہ نے دور بیٹھے انہیں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا،اسے بے ساختہ اپنا منگیتر یاد آیا تھا۔۔سب کچھ کتنا بدل گیا تھا۔کیا سب پہلے جیسا ہو سکتا تھا۔کیا وہ اب بھی اس کا انتظار کر رہا ہو گا؟کتنے سارے سوال تھے،جواب ایک بھی نہیں۔

ارمغان نے ایرج کا ہاتھ تھاما اور اپنے دل پہ رکھتے اسے حیرت سے دیکھتے گیا۔

دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالتے اس نے موبائل کھولا اور اس پہ پیغام لکھنے لگا:

"پلین ہائی جیک کرواؤ۔"

اس نے فون کو جیب میں ڈالتے ہوئے بائیک کی چابی نکالی۔ وہ دونوں ساتھ سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

ارمغان کو خبر نہیں تھی کہ ٹھیک اسی لمحے، اسکی موت کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا تھا۔

مگر حیرت کی بات ہی یہ تھی کہ۔۔۔

اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔

اسکے لیے وہ ساتھ زیادہ ضروری تھا جو اس وقت اسکے ہاتھ میں تھا۔

اسنے ساتھ چلتی ایرج کو دیکھا۔وہ مسکرایا نہیں تھا۔۔۔اسکے دل میں درد اٹھا تھا۔

وہ موت سے بے خبر ہو کہ ایرج کے ساتھ ایک عام زندگی گزارنا چاہتا تھا۔کیا یہ اتنا ناممکن تھا؟وہ اپنی موت کو بھول جانا چاہتا تھا۔۔۔تاکہ وہ ان لمحات کو کھل کہ جی سکے۔۔۔

”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔“

اسکا چہرہ دیکھتے ایرج کے کہا تھا۔سکے لب بس ہلکا سا ہل گئے۔۔

ایک آخری بار۔

ایک آخری مرتبہ۔

وہ جا رہے تھے،زندگی کو پہلی،اور آخری مرتبہ جینے!

جرح

آخری قسط: "جس کو خبر نہ ہوئی"

ہم سب کو فیری ٹیلز کتنی پسند ہیں ناں؟

ہم سب محبت کی کہانیاں پڑھتے ہیں...

ان میں کیا ہوتا ہے؟

ایک شہزادہ،ایک شہزادی۔

کہانی کا اردگرد مختلف ہوتا ہے شاید،

مگر جڑ ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔۔

محبت۔اور محبت کا وصال۔

ہم سمجھتے ہیں کہ محبت کا حصول ''ہیپی اینڈ'' ہوتا ہے کہانی کا۔

اور پھر کس کو محبت کی داستان کے اختتام پہ،

ہیرو اور ہیروئن کے پیار سے بھرپور جذباتی جملے نہیں پسند؟

سمندروں کی لہروں کے نزدیک،یا پھر ہسپتال کے بستروں پہ،

نکاح نامے پہ دستخط کرتے یا طویل راتوں کہ سفر پہ۔۔

ناول کا آخری سین،کرداروں کا آخری مکالمہ،

اور فیری ٹیل کا اختتام۔

مگر کیا ہو کہ جب۔۔

داستان محبت کی نہ ہو،

مگر کہانی کے کردار محبت کی کشمکش میں الجھ گئے ہوں؟

جیسے کسی رام کام موؤی کے کرداروں کو،

تھریلر کی اسکرپٹ تھما دی جائے۔

پھر کہانی کس انداز میں آگے بڑھنی چاہیے؟

کہانی کے حساب سے یا کرداروں کے حساب سے؟

کیونکہ کسی کی بھی زندگی "محبت" کے گرد نہیں گھومتی۔۔۔

تو پھر لکھاری کو کیا کرنا چاہیے؟

اور قاری کو کیا پڑھنا چاہیے؟

بعض اوقات کرداروں کو کہانی میں جینے کے لیے نہیں ڈالا جاتا،

بلکہ انہیں غلط کہانی اور غلط لکھاری کے قلم کے درمیان قید کر دیا جاتا ہے۔

اور میں ایک مزے کی بات بتاؤں۔۔؟

لکھاری بہت کمینے ہوتے ہیں۔

وہ احساس نہیں کرتے۔

انہیں اپنی کہانی کو بچانا ہوتا ہے، کرداروں کو نہیں،

کیونکہ کہانی کے کردار اور زندگی کے انسان،

تو کسی بھی وقت دم توڑ، ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔۔

مگر ہمیشہ کا دستور ہے، کہ کوئی نہ کوئی باقی ضرور رہ جاتا ہے،

کہانی کو جینے کے لیے، کہانی کے لیے قربان ہو جانے کے لیے۔

کیونکہ کہانی کبھی نہیں مرتی، امر ہو جاتی ہے۔

ہاں کردار دل میں بس ضرور جاتے ہیں۔۔

مگر کہانی ذہنوں کا ساتھ کب چھوڑتی ہے؟

اور دنیا میں کون ہی وہ شخص ہوگا،

جس نے دل کو دماغ پہ ترجیح دی ہو؟

تو بات یہ ہے کہ۔۔۔

لکھاری خود غرض ہوتا ہے اپنے کرداروں کے لیے۔۔

اور جو لکھاری رحم کر جائے،

تو کیا فائدہ اس کی حصول قلم کا؟

•••••••••••

میں ایک لکھاری ہوں۔

جب میں جرح کی کہانی بن رہا تھا تب میں نے قطعاً یہ نہیں سوچا تھا کہ میرا اس کہانی کے کرداروں سے ایک گہرا تعلق قائم ہو جائے گا۔

اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جس سے کوئی تعلق قائم ہو جائے اسے خداحافظ کہنے میں کتنا دکھ ہوتا ہے۔ چاہے وہ دوست ہو یا ہمسفر، عاشق ہو یا پھر دشمن۔

مگر اس تعلق کی رخصتی پہ ایک "امید" ہوتی ہے کہ تعلق میں بندھا شخص کبھی نہ کبھی لوٹے گا ضرور!

بچھڑے گا مگر جدا نہ ہو گا۔ یہی تو ایک امید ہے جو انسان اپنی زندگی سے باندھ لیتا ہے۔ اس کی واپس آنے کی امید۔

مگر کیا ہو کہ اس تعلق سے رخصت ہوا شخص کبھی واپسی کی امید چھوڑے ہی نہیں؟ وہ کبھی واپس آئے ہی نہیں؟

ہر مخلوق۔۔انسان اور جانور۔۔موت کے ایک کاؤنٹ ڈاؤن کے زیر اثر زندگی گزار رہی ہے۔اور یہی عمل افسانوی کرداروں پہ بھی لاگو ہوتا ہے۔"کہانی" ختم ہو جانے تک کردار نہ مرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کی موت کا کاؤنٹ ڈاؤن ٹھہر گیا۔کہانی کا اختتام کرداروں کا اختتام نہیں ہوتا!

کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جن کی موت کا کاؤنٹ ڈاؤن ختم ہونے سے پہلے ہی کہانی کا اختتام ہو جاتا ہے۔اور پھر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا "ہیپی اینڈ" ہو گیا۔نہیں۔۔۔

ایسا نہیں ہوتا۔۔ کہانی کا ''اختتام'' کرداروں کے لیے ایک ''pause'' ہوتا ہے۔

مگر پھر کچھ کردار ایسے بھی ہوتے ہیں۔۔ جن کی موت کا کاؤنٹ ڈاؤن بد قسمتی سے کہانی کے تکمیل سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔اور ہمیں نہ صرف اس کردار کی زندگی کا اختتام دیکھنا ہوتا ہے بلکہ کہانی کا انجام اس کردار کے بنا سہنا بھی ہوتا ہے۔

جرح کی کہانی کے ساتھ ساتھ اس کی کرداروں کا انجام بھی قریب آ رہا ہے۔چند کچھ صفحات پلٹنے کے بعد یہ کہانی ہمیں خیر آباد کہہ کر ساتھ چھوڑ دے گی۔

اس کہانی کے تمام کرداروں کی موت کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا ہے۔جو جلد یا بدیر۔۔اختتام کو ضرور پہنچے گا۔

تو آئیں۔۔۔

ہم ساتھ مل کر دیکھتے ہیں کہ اس موت کے کاؤنٹ ڈاؤن کے آخری چند لمحات میں جرح کے کردار کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔

آئیں ہم امید لگاتے ہیں کہ ہمارے پسندیدہ کرداروں کا کاؤنٹ ڈاؤن اتنا ضرور باقی رہ جائے کہ وہ کم از کم اس "کہانی" کے آخر تک زندہ رہ سکیں۔ پھر بھلے کہانی کے بعد ان کے ساتھ کچھ بھی ہو۔

آئیں امید لگاتے ہیں کہ ہمیں ہمارے پسندیدہ کرداروں کی موت اس کہانی کے اختتام ہونے سے پہلے جھیلنے کو نہ ملے۔

تو پھر دس کی گنتی سے شروع کرتے ہیں یہ کھیل۔اور پھر دیکھتے ہیں کہ کون جیتا ہے۔۔اور کون مر جاتا ہے۔

....

Ten-شوق

(کراچی،حال)

وہ بالوں پہ کنگھا پھیرتے انہیں جماتے کسی سوچ میں مبتلاء تھا۔دانیہ کو گئے دو لمحے ہی گزرے تھے۔

ارحم آگیا تھا۔اور زندگی ایک نیا موڑ لینے کو تیار تھی۔

بالوں میں چلتا سیاہ کنگھا ہاتھوں سے پھسلنے لگا، کسی ریت کی طرح۔اور انہیں ریت کے ذروں سے سیاہ قلم کی تراش ہوئی۔بالوں میں چلتا کنگھا اب ہاتھ میں موجود صفحے پہ چلتا قلم بن گیا۔عمر گھٹتی گئی، سوچ میں فرق آنے لگا۔

(بینکاک، ماضی)

قلم بار بار بالوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ ذہن پہ زور دیتا کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سفید کمرے میں روز اور کالمز میں بہت سی کرسیاں لگی تھیں جن پہ بہت سے نوجوان اور بچے بیٹھے، سر جھکائے امتحان حل کر رہے تھے۔ وہ کوئی وسیع اور طویل سا کمرہ تھا جس کے شروع میں دیوار کے ساتھ ایک شخص کھڑا سب طلباء پہ کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ دوسری رو کی تیسری ڈیسک پہ ایک لڑکا بیٹھا تھا، جس کی آنکھیں وہاں بیٹھے تمام لوگوں میں سب سے منفرد تھیں۔ گہری نیلی آنکھیں۔

گھنے سیاہ بالوں میں چلتا قلم اب کہ ذرا ٹھہر گیا۔ پھر اس نے کچھ سوچ سوچ کر لکھنا شروع کیا۔ دو سطر لکھنے کے بعد اس کی ہاتھ پھر سے تھم گئے۔ اسے امتحان نہیں آتا تھا۔ پڑھائی میں بہت کمزور تھا وہ۔

''کیا ہوا، جواب یاد نہیں ہے تمہیں؟'' پیچھے سے آتی آواز پہ اس کا وجود جم سا گیا۔ اس کا قلم کاغذ پہ گڑھ گیا۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

''میں بتا دوں؟'' پیچھے سے اس لڑکے نے ایک کہ حیدر کا پیپر دیکھا، جو سوال نہیں آتا تھا۔ اور پھر سے آواز آئی تھی۔ اب کی بار اس کا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے کھڑے شخص کو دیکھا جس کی نظریں کہیں اور بھٹک رہی تھیں۔ اسے اطمینان ہوا کہ وہ اسے نہیں دیکھ رہا تب ہی حیدر نے سر پلٹایا تھا۔ پیچھے بیٹھا شخص اب اس کی آنکھ کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ شکل و صورت میں اس سے کافی چھوٹا لگتا تھا۔ سیاہ آنکھیں جو اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''یہ پکڑو۔۔۔'' اس سے پہلے حیدر اس کی وجود پہ اور غور کرتا، ارمغان نے ایک پھرّا اس کی طرف اچھال دیا تھا۔ حیدر نے بیچ ہوا میں ہی اس مڑے کاغذ کو تھام لیا

اور پھر ڈیسک کے نیچے چھپا دیا۔اس پرچے پہ تمام سوالوں کے جواب لکھے تھے جو اسے نہیں آتے تھے۔

"شکریہ!"اس نے سرگوشی میں ارمغان سے کہا۔

"تمہارے شکریہ کا میں کیا کروں؟ میرا ادھار ہے یہ تم پہ،اب کبھی بھی کوئی کام ہو گا،تو تم سے کہوں گا۔"اس نے سپاٹ لہجے میں کہا،چہرہ شاطر تھا۔حیدر اسے دیکھ کر رہ گیا۔پھر مسکراتے ہوئے اس نے چہرہ واپس آگے کو کر لیا تھا۔

(کراچی،حال)

ریت کا قلم ٹوٹ کر زمین بوس ہو گیا۔

حیدر نے کنگھا واپس میز پہ رکھا تھا۔لبوں پہ اداس سی مسکراہٹ در آئی۔آئینے میں اپنا آپ کھوئے کھوئے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

سفید بٹن اپ شرٹ پہ اولور نگ کی جیکٹ۔اوپری دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور جیکٹ کی زپ بھی۔بال وہی سرمئی سیاہ سے تھے۔داڑھی بھی سالٹ اینڈ پیپر رنگ کی۔

وہ عمر میں زیادہ تھا مگر بے حد گریس فُل لگتا تھا۔داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے اس نے گھڑی اٹھائی تھی کہ تبھی دروازے پہ دستک ہوئی۔

اس نے دروازے کے قریب کھڑے وجود کو دیکھا اور جب وہ وجود پہچان میں آیا تو اس کی نظریں خود بخود زمین پہ گڑھ گئیں۔

دروازے پہ وہی کھڑی تھی جس کو اگر حیدر ایک نظر اور دیکھ لیتا، تو اسے ڈر تھا کہ وہ زندگی بھر اسے دیکھتا رہ جائے گا۔

النساء احمد۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔۔بلکہ کچھ بتانا ہے۔۔"وہ کافی جلدی میں لگ رہی تھی۔حیدر نے خاموشی سے بس سر ہلا دیا۔نظریں کسی اور چیز کو تلاش کر رہی تھیں جن پہ وہ اپنی آنکھیں فوکس کر سکے۔

"جی،بولیں۔"اس کی گہری آواز کمرے میں گونجی۔وہ ہاتھ زپ پہ جمائے جیکٹ کو آہستہ آہستہ بند کر رہا تھا۔

"آپ لاہور اپنے دوست کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں۔"اس کی آواز نکلی تو لہجہ سنبھلا سنبھلا ہوا سا تھا۔حیدر کو حیرانی ہوئی تھی۔اسے نجانے کیسے پتا لگا تھا کہ دوروس اس کا دوست ہے؟

''میں لاہور، آپ کے مجرم کو گرفتار کرنے جارہاہوں، النساء۔'' حیدر نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا تھا

۔اس کی آواز نکلی تو لہجہ شکستہ اور تاثر زخمی سا تھا۔

النساء اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ حلق میں گلٹی ابھر کے معدوم ہوئی تھی۔

''مجھے کچھ بتانا ہے آپ کو حیدر۔۔۔ کیونکہ شاید۔۔ شاید آپ ایک غلط قدم اٹھانے جارہے ہیں۔''

النساء نے نظریں جھکائے خوابیدہ لہجے میں کہا تھا۔اس کی بات پہ حیدر الرٹ سا ہو گیا۔وہ چونکا تھا۔

""کیا بات ہے؟ مجھے بتائیں۔۔""وہ دو قدم آگے آیا۔آنکھوں میں فکر مندی کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔

اور پھر جو النساء نے کہا۔اس نے حیدر کے گرد سناٹا طاری کر دیا تھا۔اس کی کان بے ساختہ گرم ہوئے تھے۔

حیدر نے جو دو قدم آگے لیے تھے،وہی دو قدم پیچھے لڑھک گئے۔اس کے چہرے پہ کسی نے حقیقت کا تھپڑ رسید کیا تھا۔

النساء بولتی گئی تھی،اور حیدر کی پشت کرسی پہ ٹک گئی۔وہ نڈھال سا ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں سمندر کی لہر برپا ہو رہی تھی۔ایسا کیسے ہو رہا تھا؟النساء نے حیدر کو یوں خمار زدہ آنکھوں کے ساتھ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

کیا تم نے کبھی کسی پولیس آفیسر کو ٹوٹتے دیکھا ہے؟

چند لمحے گزر گئے،النساء چپ ہو گئی۔حیدر نے انگلیوں سے آنکھیں مسلی تھیں۔

نہیں۔۔ابھی نہیں۔۔

وہ النساء کو بنا کچھ کہے برق رفتاری سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

اسے منہ دھونا تھا۔اسے ابھی خود کو کمپوز کرنا تھا۔اسے ابھی بہت سے ایسے کام کرنے تھے جو بساط پلٹ دینے والے تھے۔

وہ واش روم کے آئینے میں اپنا دھلا دھلا یا چہرہ دیکھنے لگا۔

''شکریہ!''اس نے سرگوشی میں کہا تھا۔دعا اتنی جلدی بھی قبول ہوئی ہے کبھی؟

••••••••••

کراچی کے ائیر پورٹ کے چمکتے فرش کے عکس میں دیکھا جاتا تو پہلا عکس اس شخص کا ہوتا جو ہاتھ میں فون تھامے، چہرے پہ سیاہ گلاسز جمائے، اولو گرین رنگ کی جیکٹ پہنے تیز تیز قدم دھرتا زینے پھلانگ رہا تھا۔جیکٹ اوپر سے کھلی ہوئی تھی جس سے سیاہ شرٹ کا ور کھلی گردن واضح ہو رہی تھی۔اس کے چہرے پہ ایک سخت سا تاثر تھا۔رف اینڈ ٹف سا۔

اس کے پیچھے تین اور لوگ تھے۔ان میں سے ایک قدرے آگے تھا جو حیدر کے ہمقدم آنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس وجود کے چہرے پہ فریملیس گلاسز تھے اور سادہ سے ڈریس پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھا۔کھلے گریبان سے سلور لاکٹ جھلک رہا تھا۔

اس شخص کے پیچھے دو لوگ تھے اور ان دو لوگوں کے پیچھے تین اور لوگ تھے۔ سب نے عام سی ڈریسنگ کرر کھی تھی۔ وہ کہیں سے بھی کوئی پولیس آفیسر نہیں لگ رہے تھے۔

ائیر پورٹ پہ لوگ تجسس سے ان سیاہ گلاسز میں چلتے گینگ کو دیکھ رہے تھے۔ سب کافی اسمارٹ سے تھے۔ دو لڑکیاں بھی تھیں جن میں ایک دانیہ تھی اور دوسری ایک اور پولیس آفیسر۔

حیدر اور ان سب کے کانوں میں سیاہ آلہ جڑا ہوا تھا جو غالباً بلوٹوتھ ڈیوائس تھی۔

وہ ایک ٹیم تھی۔

حیدر دھیمی آواز میں کچھ کہتا تو وہاں لوگوں میں بیٹھے ایک شخص کے ہونٹ ہلتے۔

حیدر کیا کہہ رہا تھا؟ یہ صرف وہی جانتے تھے جنکے کانوں میں وہ ڈیوائس لگی تھی۔

زندگی کا آخری موڑ۔

....

Nine-الزام

(لاہور، حال)

وہ دونوں اب گھر کے اندر آ گئے تھے۔ بارش چند لمحوں بعد دم توڑ گئی تھی اور اب گھر کی چھتوں سے ٹپکتے پانیوں کا شور ہر سو گونج رہا تھا۔ گیلی نم مٹی کی مہک فضاؤں میں گھل مل رہی تھی۔ پتے دھل دھلا گئے تھے۔ بنجر زمین سبز ہونے کے لیے بے تاب تھی۔ ندیوں میں دریاؤں میں پانی کی چھپاک لہریں ابھر رہی تھیں۔

سارہ وہیل چیئر دھکیل کر بالآخر اندرونی کمرے میں جا پہنچی تھی۔

زندگی کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ اور اب کہاں سے کہاں لے جائے گی۔۔۔
اس کی بھی ایک کہانی تھی، اس کی بھی ایک داستان تھی ہی۔۔

وہ وہیل چیئر پہ بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔پودوں اور درختوں سے مٹی آلود پانی ٹپک رہا تھا۔

سعد کمرے سے جھانکتے ہوئے گزر رہا تھا کہ سارہ کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔

"اندر آجائیں سارہ آپی، ٹھنڈ لگ جائے گی۔" وہ کمرے میں داخل ہوتے عام سے انداز میں بولا تھا۔سارہ نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا تھا۔اور اسے خود پہ غصہ آیا۔۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔

"میرے پاس آکر بیٹھو۔۔"اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔وہ دو پل ٹھہرے اسے دیکھنے لگا۔پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے سارہ کے مقابل آکھڑا ہوا۔

سارہ نے پہلے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔اور پھر چہرہ اٹھا کر سعد کو۔ جس کا چہرہ کمرے کی زرد مصنوعی روشنی سے چمک رہا تھا۔وہ اسے دیکھے گئی۔سارہ کو اس پہ بے پناہ ترس آیا تھا۔اس پہ ترس سے زیادہ خود پہ غصہ آیا تھا۔سارہ نے آہستہ سے اپنے ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔سعد اسے دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

"کیا تم۔۔۔مجھے معاف کر سکتے ہو، سعد؟"اس نے مضبوط لہجے میں کہنے کی کوشش کی تھی، مگر بات تھی ہی ایسی،اس کے گلے میں پھانس اٹک گئی۔

"میں اتنی۔۔اتنی بے خبر کیسے ہو سکتی تھی۔۔"اس نے ایک روانی سے کہا تھا۔ سعد بنا کسی تاثر کے سارہ کے پاؤں کے پاس گھٹنے کے بل بیٹھتا چلا گیا۔۔

"میں تمہیں اپنے ہی بھائی سے نہیں بچا سکی۔۔۔میں تمہاری بہن جیسی ہوتے ہوئے بھی تمہیں نہیں بچا سکی۔۔۔"اس کی نظریں اب جھک گئی تھیں۔آنسو قطار در قطار بہنا شروع ہو گئے۔سعد بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔وہ سرمئی دیوار کو تکتا رہا۔بغیر کسی تاثر کے،بغیر کسی جذبے کے۔

معافی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کون مانگتا ہے بھلا؟

"جو کچھ میرے ساتھ ہوا،سارہ آپی۔۔اس میں آپکا کوئی قصور نہیں تھا۔آپ معافی مت مانگیں۔۔"اس نے لمحوں بعد سارہ کی سسکیاں سنتے خود کو کہتے سنا۔ اس کی آواز میں صدیوں کی تکان تھی،جیسے اب وہ تھک گیا ہو اور اب ایک پر سکون آرام چاہتا ہو۔

"میں اتنی قریب ہو کر بھی اتنی بے خبر تھی۔۔۔میں جان ہی نہیں سکی کہ۔۔ کہ۔۔"اس کی آواز کا بندھ ٹوٹ گیا۔لفظ بکھر گئے۔کہنے کو اور بچا ہی نہیں تھا کچھ۔

جب زندگی بھر ایک جھوٹ میں گزری ہو تو انسان کس چیز کا بھروسہ کر پاتا ہے آخر؟

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا، سعد۔۔؟"ان دونوں کے درمیان ایک طویل خاموشی در آئی تھی۔اس خاموشی میں دلاسا تھا، تسلی کی کوشش تھی اور زمانے بھر کا درد۔

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ جس پہ میں نے تمام زندگی بھروسہ کیا تھا۔۔وہ اصل میں کیسا درندہ تھا۔۔"

اس کی بات پہ سعد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''میں وہ سب کچھ کیسے دہرا سکتا ہوں، سارہ آپی؟''اس کی آنکھوں میں کرب تھا، قربانی تھی،اور قبر کی وحشت۔

کسی کا ماضی اتنا دردناک بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسے دہرانا بھی پسند نہ کرے؟

''میں ارحم کی موت کا سوگ نہیں منانا چاہتی سعد۔۔وہ اتنا اچھا تھا کہ اس کی حقیقت بھی جھوٹ لگتی ہے مجھے۔کوئی اتنا اچھا ناٹک بھی کر سکتا ہے میں سوچ نہیں پا رہی۔۔''

سعد نے چہرہ واپس موڑ لیا تھا۔وہ واپس اس سرمئی دیوار کو تک رہا تھا۔سرمئی دیوار یا پھر یادوں کا پردہ؟

اس پردے پہ وہ تمام وحشتناک مناظر ابھرنے لگے تھے جن کو وہ ان چار سالوں تک بھولنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

وہ سب کچھ اس پہ پھر سے حاوی ہونے لگا تھا۔اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ اتنا بھی مت رویا کرو۔ کبھی کبھی تمہارے رونے سے چڑ آنے لگتی ہے۔ مگر انسان ان کو کیسے سمجھائے کے وہ رونا تو اس "ہو چکے" کے سامنے کچھ ہے ہی نہیں۔۔۔!

کراچی سے لاہور، لاہور سے بینکاک۔ اس نے بولنا شروع کیا۔

....

Eight- جھوٹ

(لاہور، حال)

بارش اب رم جھم رم جھم کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ برس رہی تھی، لاہور کو بھیگا رہی تھی مگر اتنی شدت سے نہیں جتنی شدت سے بائک پہ بیٹھے ان دو وجودوں کا دل درد سے بھیگ چکا تھا۔ بھیگ کیا چکا تھا بلکے پورا کا پورا ڈوب چکا تھا، بس چند سانسیں لے رہا تھا۔ پانی کی لہروں سے ہاتھ باہر نکال کر امید کی چند آخری سانسیں۔ کہ کوئی آئے گا اور بچا لے گا۔ کوئی پکار سن لے گا اس کی بھی۔

موٹر سائیکل تیز رفتاری سے لاہور کی تر سڑکوں پہ پانی کو دھار کی صورت چیرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ سڑکیں ہجوم سے گھری ہوئی نہیں تھیں بس جگہ جگہ پر لوگوں کی گاڑیاں اور موٹر سائیکل بارش کی وجہ سے کنارے کنارے کھڑی تھیں۔ اس کی لیدر جیکٹ، قصائی کی گرفت میں موجود مرغے کی طرح، پھڑ پھڑا رہی تھی، اور

اس کے پیچھے بیٹھا دوسرا وجود قدرے جھنجھلائے ہوئے انداز میں بار بار اس کی جیکٹ کو ٹھیک کر رہا تھا۔

اندھیرا مکمل آسمان پہ چھا چکا تھا۔ لوگ آفس سے گھر تک پہنچ چکے تھے، کچھ اب بھی رستے میں تھے۔ وہ دونوں بھی اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ وہ بھی کہیں نا کہیں پہنچ ہی جانے والے تھے۔۔۔

گھنٹہ لگا تھا ان کو اندرون پہنچنے میں۔ مگر وہ گھنٹہ بھی قدرے ضائع نہیں ہوا تھا۔ اندرون تھا ہی ایسا، مبہوت کر دینے والا، اپنے شوخ رنگوں کے سحر میں جکڑ لینے والا۔ رات کے اس پہر بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔

کچی پکی اینٹوں سے بنی دیواریں بارش کی وجہ سے سرخ ہو چکی تھیں، گیلی گیلی مٹی اور پانی کی مشترکہ خوشبو آخر کس کو پسند نہ تھی؟بتیاں کم کم تھیں کیونکہ بارش کی وجہ سے نقصان کا خدشہ تھا۔ہجوم بھی بارش کی ہی وجہ سے قدرے کم تھا۔

کہیں جلتا کہیں بجھتا،اندرون کی حالت ایسے تھی جیسے آزادی سے پہلے ہجر کے ہر آنگن میں ہوتی تھی، مدھم سا شور،تاروں کی سجاوٹ،چاند کے نور سے بھرپور روشنی...اور دو محبت کرنے والے آنگن کی چارپائی کے دونوں طرف۔ایک چھوٹا سا فاصلہ تھا شرم کا،ایک چھوٹی سی حد تھی پارسائی کی۔

مگر یہاں افسوس !ایسا کچھ نہ تھا،اس اندرون کی خوبصورت رات جہاں آسمان کو دیکھو تو تاروں کے نقوش مصنوعی روشنی میں قدرے واضح ہوتے تھے، جہاں عمارت سے عمارت جھنڈیوں، فیری لائٹس اور لالٹین سے سجی تھیں....اس

اندرون میں کچھ ادھورا سا تھا، یہاں تو محبت کرنے والے نہیں تھے، یہاں آنگن کا سکون بھی نہ تھا اور یہاں امید بھی بس مٹھی بھر مٹی جتنی تھی۔

یہاں عاشق کوئی نہیں تھا، یہاں کہانی گو ضرور تھا۔ایک تھا جو یہاں سنانے آیا تھا دوسرے کو اپنی ان کہی داستان، اور دوسرا شخص، وہ اس کا سامع تھا۔اسے سننے والا، اس کی کہانی میں دلچسپی رکھنے والا۔

ارمغان بائیک کو پارکنگ میں لاک کر کے ادھر ہی چھوڑ آیا تھا، ساتھ اس نے ایک بچے کو چند نوٹ پکڑائے تھے تاکہ وہ دھیان رکھ سکے۔جیکٹ کو کندھے سے درست کرتے وہ دہلی گیٹ کو عبور کرتے اندرون میں داخل ہو رہے تھے، سفید شرٹ کے کالر میں سیاہ سن گلاسز اٹکے ہوئے تھے۔آنکھیں سرخ متورم سی تھیں

جن میں نم نم ساپانی ٹھہرا ہوا تھا۔لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ لوگوں کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

ساتھ اس کے ایرج بھی تھی۔دوپٹہ مفلر نما اسٹائل میں گلے میں ڈالا ہوا تھا جو ہوا کے جھونکوں سے منہ کو بھی آرہا تھا۔چہرہ ستا ہوا تھا، سنجیدہ سا۔گول گول پتلے چشمے گویا موٹی موٹی بھوری آنکھوں کا ایسے ساتھ دے رہے ہوں جیسے ایک دوسرے کے بنا یہ طلسم ہی بیکار ہو! یہ آنکھوں کا سنگم آنکھوں سے، بچانے کے لیے، عینک کام آتی تھی۔چاہے محبت کا تاثر ہو یا نفرت کا، یا چاہے آنسو کو چھپانے کے مراحل میں ہو۔۔۔یہ گول عینک ہمیشہ کام آتی تھی۔

رم جھم رم جھم ہوتی بارش پہ سکوت چھا گیا تھا۔محض پھوار بھی رک چکی تھی۔اب ہوا کے رک جانے سے حبس کا احساس پیشانیوں پہ پسینہ لا رہا تھا۔آسمان سے بادل

چھپٹ رہے تھے، آدھا دھلا دھلا یا چاند اور اس نے چاندی جیسی روشنی اندرون کی جگہ جگہ کو چمکا رہی تھی۔وہ دونوں ایک ڈھابے پہ آ رکے تھے۔

ویسے تو وہ ڈھابہ دکان نما انداز میں چھت سے ڈھکا ہوا تھا مگر مالک کے فرمان پہ پٹھان کا پندرہ سولہ سالا بچہ موسم کی خوشگواری کی وجہ سے میز اور کرسیاں باہر کی جانب لگا رہا تھا۔

اندرون بارش کے بعد بے حد حسین لگ رہا تھا۔اوپر سے چائے کی تازہ خوشبو نم مٹی کی خوشبو کے ساتھ سنگم برپا کرتے ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔البتہ روڈ پہ کیچڑ اور دلدل کا عجیب سماں تھا۔مگر وہاں کی سڑک ایک گڑھا بننے سے پانی کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈھابے کے سامنے والی میز جیسے ہی لگی تھی ویسے ہی بھرنا شروع ہو گئی تھی۔ بعض لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی فیملی کے ساتھ آئے تھے، باقی چند دوست یار یا کپل تھے۔ رفتہ رفتہ بتیاں بھی جلنا بجھنا شروع ہو گئی تھیں۔ فضا میں لوگوں کی آوازوں کا شور تھا اور پٹھان کا اپنے ملازم کو ڈانٹنے کی گونج۔

وہ دونوں بھی میز پہ آبیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان سرمئی گھر سے اندرون لاہور تک ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ ارمغان تو ماضی کی یادوں میں کھویا ہر لمحے کو ترتیب دے رہا تھا۔ اور ایرج اسے وقت دے رہی تھی۔ اسے وقت درکار تھا، وہ سمجھ سکتی تھی۔ آخر یہی تو وہ ملاقات تھی جس میں ”جرح“ سے وابستہ تمام بسمل کو ایک موڑ پہ آملنا تھا۔ اس کہانی کا لکھاری ارمغان تھا، اس تقدیر کو ترتیب بھی شاید اسی نے دیا ہو؟ ایرج نے سوچا۔ ایک کہانی ابھی باقی تھی جسے وہ آج مکمل کرنے والا

تھا۔کوئی جھوٹ نہیں،کوئی فریب نہیں۔پوکر فیس کے ساتھ ہی کہی جانے والی بات آج حرف بہ حرف سچ تھی۔

ارمغان نے بائیک کی چابی میز کے بیچوں بیچ رکھ دی تھی،وہ دونوں ساتھ ہی میز پہ بیٹھے تھے۔چاند کی روشنی مدھم سی انکے سر پہ سے گزر رہی تھی۔لوگوں کا شور مدھم ہو رہا تھا۔لوگ گھروں کو جا رہے تھے۔مگر وہ تو وہاں سے اتنی جلدی نہیں جانے والے تھے۔

ہجر کی رات میں بچھڑ جانے والے کی ہر دم خواہش ہوتی ہے کہ بس ایک لمحہ اور! بس ایک لمحہ دیدار کے لیے،ایک لمحہ اظہار کے لیے۔

ان دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی تھی۔ایرج انگلیاں مسل رہی تھی اور مقابل بیٹھے ارمغان کا دل مسل رہا تھا۔

بہت کچھ اندر ہی اندر پرے دھکیلتے ہوئے اس نے پٹھان بچے کو اپنے پاس بلایا تو وہ رومال کندھے پہ سجاتے ان کے پاس آ پہنچا۔

وہ لڑکا ارمغان کو مسکراتے اور چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مینیو کے صفحے پلٹا رہا تھا اور ایرج اسے ایک جگہ، ٹکٹکی باندھے دیکھے گئی۔وہ اس کی طرف مخاطب نہیں تھا البتہ اس پٹھان لڑکے سے کچھ پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔

ایرج کی آنکھیں اس کی چہرے سے اس کی گردن تک گئی تھیں۔

اس کی آنکھیں سیاہ تھیں، ایرج کو اندازہ ہوا جب چاند کی روشنی ان پہ پڑی مگر انہوں نے رنگ نہیں بدلا۔ اس کی بال گہرے سیاہ ماتھے پہ بکھرے تھے، بارش کے وجہ سے بھیگے ہوئے تھے۔

اس کی جیکٹ پہ پانی کے قطرے ٹھہرے ہوئے تھے، اور اس کی اندرونی شرٹ ہلکی ہلکی سی نم تھی۔ چہرے کے نقوش تیکھے سے تھے اور بڑھی ہوئی داڑھی کا ایک انداز تھا الگ۔

ایرج نے نوٹس کیا تھا کہ اس کی کندھے پہ ایک سانپ جیسا کچھ ثبت ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ چند گھنٹے پہلے اس نے ارمغان کی پشت پہ سفید شرٹ کے پیچھے چھپے بڑے سے ٹیٹو کو دیکھا تھا۔ وہ مسلمان تھا نا؟ یا ایتھیسٹ؟

"حرکتیں تو کہیں سے مسلما---" اس نے زبان کاٹی۔ مگر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں ارمغان سے پوچھے گی ضرور۔ وہ ساکت سی اس کی ظاہری شخصیت کو پہلی بار اتنے نزدیک اور غور سے دیکھ رہی تھی۔

"ایرج!" اس کی آواز پہ وہ چونکی، وہ گہری آنکھیں لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کہاں گم گئیں؟ یہ بھی بتاؤ کہ کیا کھاؤ گی؟" اس نے ساتھ ساتھ دو سوال پوچھ لیے تھے اور وہ اس کی سوال پہ کنفیوژڈ سی ہو گئی تھی۔

"کچھ بھی۔۔ کچھ بھی منگوالو۔" اس نے ارمغان سے کہا۔

"مجھے تمہاری پسند کھانے کے معاملے میں بالکل نہیں معلوم، تو اب تم خود ہی بتاؤ۔"

برابر میں کھڑا پٹھان لڑکا دونوں کو چمکتی نظروں سے دیکھے من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ کتنی اچھی جوڑی ہے ان کی۔اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟

"کلونجی والے بسکٹ لے آؤ۔"اس نے پٹھان لڑکے سے مخاطب ہوتے کہا۔وہ آڈر دہراتے وہاں سے چلا گیا تو ارمغان اس کی طرف واپس مڑا۔

''کہاں کھو گئی تھیں؟'' اس کی چہرے پہ مسکراہٹ نہیں تھی، البتہ تاثرات اب نرم پڑ چکے تھے، پیشانی سے سلوٹیں اوجھل ہو چکی تھیں۔ شاید وہ سکون سے وہاں موسم انجوائے کر رہا تھا۔ مگر اس کے دل کا حال تو بالکل مختلف تھا۔ البتہ وہ ابھی اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ بات کھلے گی تب کی تب دیکھی جائے گی۔ ابھی اسے محض یہ چند لمحے سکون سے گزارنے تھے۔ زندگی کے انتہائی آرام دہ اور آخری لمحے۔

''کہیں نہیں کھوئی تھی۔ بس آسمان پہ تارے دیکھ رہی تھی۔'' اس نے اپنا ذہن ارمغان اور اس کی شخصیت سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا دل اور ذہن بھی تو بس دو لوگوں کے درمیان آ کے رک چکا تھا۔ ارمغان سے ذہن ہٹا تو دل پھر اسی بھولی بھٹکی محبت کو ذہن کے قریب سوار کرنے لے آیا۔

وہ اب آسمان کو بغور دیکھ رہی تھی، جیسے اس چادر پہ پھیلے موتیوں کے الگ الگ امتزاج کا مطالعہ کر رہی ہو۔ سب سے روشن ثریا ہی تھا۔ نیلے رنگ کا سیریس! مگر وہ تو کسی اور کی تلاش میں تھی۔ وہ تو اس کے دیے گئے لقب والے ستارے کے تلاش میں تھی۔

چاند کی مدھم روشنی آنکھوں کو بھا کر بھی نہیں بھا رہی تھی۔ جیسے آسمان پہ محض صرف ستاروں کی حکومت ہو۔ بادل ڈھانپتے اور واضح کرتے چاند کے ساتھ کھیل رہے تھے مگر اس کی متلاشی نظر کہیں اور ہی تھیں۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو؟'' وہ بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں آسمان پہ دیکھنے لگا۔ اسے وہاں سب سے بھا جانے والی شے آدھا ادھورا چاند ہی لگا تھا۔ ستاروں تک تو اس کی نظر گئی ہی نہیں تھی، سب سے نمایاں جو تھا۔

"التنزّ ڈھونڈ رہی ہوں۔التنزّ تارہ ہے ایک!" اس نے آسمان کو بغور دیکھتے ہوئے کہا، نظر ایک پل کے لیے بھی نہ بھٹکی۔

"اتنی محنت سے؟ایک تارہ ہی تو ہے!اس میں ایسا کیا ہے؟" وہ بظاہر تو دوستانہ سے لہجے میں بولا تھا مگر نجانے کیوں ایرج کو اس کی بات دل میں چبھی تھی۔ جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ تارہ کس نے اس کی لیے مخصوص کیا تھا۔۔اور اب وہ ایرج پہ طنزیہ ہنس رہا ہو۔۔۔

"ارحم نے یہ تارہ میرے نام کیا تھا۔" نجانے کیوں اس کی منہ سے یہ جملا ادا ہوا تھا۔اس کی منہ سے پہلی بار "ارحم" بہت سادہ انداز میں ادا ہوا تھا۔ورنہ زندگی نے

جب بھی اس کی لبوں نے ارحم کا نام کہلوایا تو اس کا دل ایک دھڑکن مس کر جاتا تھا۔ آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار۔۔۔

"ارحم۔۔۔؟" اس کا لہجہ طنزیہ سا تھا۔ زبان سے حلق تک کڑوہ ہو چکا تھا۔ ان کے درمیان ہمیشہ وہی تھا جو آجاتا تھا۔۔۔ اتنا سب ہو جانے کے بعد بھی ارحم ان کے درمیان آجاتا تھا۔

ایرج نے اس کی لہجے میں چھپی ناپسندیدگی فوراً بھانپ لی تھی، اسی لیے چپ رہی، آنکھیں اس کی آنکھوں سے نہیں مل پائی تھیں، جبکہ وہ اس کی آنکھوں کی تپش اپنے پورے چہرے پہ محسوس کر سکتی تھی۔ وہ بظاہر لاپرواہی سے آسمان دیکھتی رہی۔۔۔ وہ ارحم کو اپنے درمیان بے وجہ لے آئی تھی، اور اب سمجھ نہیں آرہا تھا کہ سے خارج کیسے کیا جائے۔

ان دونوں کے درمیان پھر سے خاموشی کسی بن بلائے مہمان کی طرح داخل ہو گئی تھی۔نہ ارمغان کو سمجھ آرہا تھا کہ وہ آگے کیا بات کرے نہ ہی ایرج کو۔چند لمحے ایسے ہی بیت گئے۔چائے کی بھانپ اٹھ اٹھ کر فضا میں گھلنے لگی۔چھپ چھپ کرتی پانی کی آواز کانوں میں خول قائم کرنے لگی۔

”میں جب بھی آسمان دیکھتی ہوں تو مجھے صرف ستارے نظر آتے ہیں۔“

بلآخر جب وہ الٹیئر کو آسمان پہ تلاش کرنے میں ناکام ہوئی تو ہار مانتے ہوئے اس نے ایسے ہی موضوع چھیڑا۔وہ واقعی سچ تھا۔اسے چاند کبھی اتنا پُرکشش نہیں لگا تھا جتنا اسے ستارے،ان کا خول اور نقوش لگتے تھے۔اسے ہر بار کچھ منفرد ملتا تھا ستاروں میں،کچھ چھپا ہوا،کچھ ان کہا۔

"مگر مجھے تو پچھلے سات ماہ سے اپنے ارد گرد صرف کامل چاند نظر آیا ہے۔"اس نے بڑے دھیمے لہجے میں اپنی بات کا اظہار کیا تھا۔ایک ہاتھ کی کہنی میز پہ ٹکی ہوئی تھی اور اسی سے سر تھاما ہوا تھا،دوسرا ہاتھ کرسی کے پیچھے تھا جیسے کرسی کو کندھے سے تھاما ہوا ہو۔

ایرج نے اس کی بات پہ کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر نظر انداز نہیں کیا تھا۔جب بات اظہار تک آ ہی چکی تھی تو اس نے اظہار داستان کو اس لمحے چھیڑنا ٹھیک سمجھا۔اصل میں وہ بھی جانتی تھی کہ نہ وہ چاہتی ہے کہ وہ تلخ یادوں کو اتنی حسین رات کا حصہ بنائے اور نہ ہی ارمغان چاہتا تھا کہ وہ دونوں قلب کو مرہم لگانے کے بجائے اسے کرب کے مراحل سے گزاریں۔

مگر سب ضروری تھا۔وہ داستان ضروری تھی۔آخر ادھوری کہانیاں بھی کس کو پسند ہوتی ہیں؟

اس نے کچھ بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ خوش باش سالڑکا تھالی تھامے ان کے سامنے ان کا آڈر رکھ رہا تھا۔

ایک طشتری ایرج کے طرف رکھی،دوسری ارمغان کی طرف۔چھوٹی سی پیالی میں گرم چائے دھواں دھواں ہو رہی تھی۔وہ لڑکا سب کچھ میز پہ ان کے سامنے سجا کر وہاں سے چلا گیا۔

ارمغان نے پہلے اپنی طشتری کو دیکھا،اس میں نان خطائی کے کافی سارے پیسز گولائی میں سجے ہوئے تھے۔اور پھر اس نے ایرج کے طشتری کو بغور دیکھا۔جس

میں دوسرے قسم کے بسکٹ سجے تھے، جسے غالباً ایرج نے کیا کہا تھا وہ بھول گیا، مگر وہ ہر گز نان خطائی نہ تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا تھا کہ کسی نے اندرون لاہور آ کر نان خطائی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔

ان دونوں کے درمیان پھر سے خاموشی کا بسیرا رہا۔ ایرج ادھر ادھر گردن موڑ کر اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور وہ اس کا۔

"تمہیں نان خطائی نہیں پسند؟" اس نے میز پہ اپنے دونوں ہاتھ جماتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟" اس نے تقریباً فوراً ہی پوچھا۔دل کو ٹھیس جو پہنچی تھی۔اس کی پسندیدہ چیز اس کے پسندیدہ شخص کو پسند نہیں تھی، وہ اس بات پہ کہاں اتفاق کرنے والا تھا۔

"بس۔۔۔وہ بہت میٹھے ہوتے ہیں، شاید اسی لیے۔" اس نے بولتے ہی لب بھینچ لیے، چہرہ ارمغان کی طرف موڑ دیا۔

"اور تمہیں نان خطائی کی جگہ یہ عام سے بسکٹ پسند ہیں؟" اس نے ہاتھ اٹھا کر ایرج کی طشتری میں بچھے چکور بسکٹس کی طرف اشارہ کیا۔ایک تو نان خطائی کو ریجیکٹ کیا گیا، اور پھر ان پر ایسے عام سے بسکٹس کو ترجیح دی گئی جو دیکھنے میں ہی عجیب سے لگ رہے تھے، اوپر کالے کالے بیج چپکے ہوئے تھے جو بیج کم کیڑے زیادہ

لگ رہے تھے۔یہ بات ارمغان نے اپنے تک ہی دبائے رکھی،اسے یقین تھا وہ چھوٹی سی بات کا بھی برامان جاتی تھی۔

”عام بسکٹ تو نہیں ہیں یہ۔۔۔کلونجی والے بسکٹ ہیں۔“

اس نے ارمغان کو خفگی سے دیکھا۔پہلے گھر والوں کو ببل گم آئس کریم کھانے پہ اعتراض تھااوراب اس کو کلونجی والے بسکٹس میں مسئلہ دکھ گیا ہے۔۔

”ہاں مطلب ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں سارے بسکٹس۔۔بس ان میں زیرے کی جگہ کلونجی ہو گی۔“وہ سنبھل کر بولا تھا۔

اس سے پہلے وہ کچھ اور بولتا، ایرج نے جھٹ سے ایک بسکٹ اپنی پلیٹ سے اٹھا کر اس کی پلیٹ تک کھسکا دیا۔

''کھاؤ۔ پھر معلوم ہو گا کہ ایک جیسے ہوتے ہیں یا نہیں۔''ناک پہ ٹکے چشمے کو درست کرتے ہوئے کہا۔

ہاں۔ وہ دونوں بسکٹس کو زیر بحث لیے لڑ رہے تھے۔

اس کی بات سنتے ارمغان نے وہ بسکٹ انگلیوں کے پوروں سے اٹھایا اور چاند کی روشنی میں بلند کر کے دیکھنے لگا۔ وہ چکور سا بھورے رنگ کا بسکٹ تھا جس پہ جگہ جگہ سیاہ کلونجی چسپاں تھی۔

ارمغان نے بے اختیار بسکٹ کو ٹٹولتے ہوئے دونوں اطراف سے دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔

''تمہیں کلونجی والے بسکٹس پسند ہیں؟''اس نے بے ساختہ سوال کیا۔ بسکٹ ہنوز ویسے ہی انگلیوں کے درمیان اٹکا ہوا تھا۔

''بہت زیادہ۔'' وہ کہتے ہوئے خود بھی مسکرائی تھی۔

ارمغان نے اس کی جانب دیکھا۔ مبہوت سا ہو گیا۔ وہ پہلی بار اتنا کھل کے مسکرائی تھی شاید۔ جب سے اسے ہوش آیا تھا، اُس وقت سے اِس وقت تک اس کے

چہرے کے حقیقی تاثر نمایاں ہوئے تھے۔۔۔ مگر وہ مسکراہٹ۔۔۔ان میں دل تھا۔اس مسکراہٹ میں "زندگی" تھی۔اس کی آنکھیں بھی ویسے ہی مسکراتی تھیں۔۔

"اور تمہیں نان خطائی پسند ہیں؟" ایرج نے پھر اس کی طشتری کو دیکھا، پھر ہاتھ میں تھامے بسکٹ کو دیکھتے سوال کیا۔

اس کی بات پہ ارمغان نے اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں، اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ طائرانہ نگاہ اطراف میں پھیلائے اسی پٹھان بچے کو تلاش کر رہا تھا۔بسکٹ والے ہاتھ نے بسکٹ طشتری میں واپس رکھ دیا۔ان چھوا۔

اسے وہ لڑکا دکھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب آنے کا کہا۔وہ قریب آ کے مؤدبانہ انداز میں اس کی برابر کھڑا ہو گیا۔

ارمغان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا،اور پھر اپنی نان خطائی کی طشتری اٹھا کر اسے تھمائی۔

"ایک کام کرو،یہ نان خطائی کے طشتری لے جاؤ اور اس کی جگہ کلونجی والے بسکٹس کی ایک پلیٹ لے آؤ۔"

وہ ویٹر سے مخاطب ہوئے بول رہا تھا اور ایرج اسے دیکھ رہی تھی۔نا سمجھی سے،منہ کھولے۔

ویٹر ''جی صاحب'' کہتا وہاں سے طشتری اٹھائے چلا گیا۔ارمغان نے واپس ایرج کی طرف اپنا چہرہ گھمایا تو اس کی تاثرات دیکھتے ہوئے مدھم سا ہنس دیا۔

اور اب مبہوت ہونے کی باری ایرج کی تھی۔اس نے پہلی بار ارمغان کو ہنستے دیکھا تھا۔لاپرواہ سا،ایک خوش کن ہنسی،بنا کسی طنزیہ لہجے کے ایک مدھم سی ہنسی کے ساتھ۔ایرج نے نوٹس کیا کہ جب وہ ہنستا ہے تب اس کی آنکھیں چھوٹی ہو جاتی ہیں۔جب وہ ہنستا ہے تو اس کی گال پہ ایک طرف گڑھا نمایاں ہوتا ہے۔۔جب وہ ہنستا ہے تو اس کا پورا وجود ساتھ ہنستا ہے۔اس کی ہنسی،اس کی آواز۔۔سب کچھ گہری تھی۔اس کے ہی طرح۔

ایرج کو کچھ محسوس ہوا تھا اپنے اندر، دل کے پاس۔ مگر وہ سمجھ نہیں پائی تھی وہ کیا تھا۔ وہ ایک خواہش تھی شاید۔۔۔اس کو واپس ایسے ہی ہنستے دیکھنے کی خواہش۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ جس موضوع کو چھیڑنے والی تھی، اسے نہ چھیڑے۔

ارمغان تو مسکرانے کے لیے بنا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے اچھا لگا تھا۔ اور ایرج نے شاید دل میں یہ اعتراف بھی کر ہی لیا تھا کہ وہ اسے کسی اور جہاں میں، کسی اور وقت میں دیکھے یا نہ دیکھے۔۔ وہ اسے مسکراتے ہوئے حسین لمحات میں ہمیشہ دیکھنا پسند کرے گی۔ ایک دم ٹکٹکی باندھے۔ بس خاموشی سے۔

اس نے اپنے ذہن کو جھڑکا۔ ابھی ایسی باتوں، ایسی سوچوں کا وقت نہیں تھا۔ اس نے خود کو یاددہانی کروائی۔

اس کی ہنسی نے ایرج کے چہرے کو روشن سا کیا تھا۔

"تمہیں تو نان خطائی پسند تھی نا۔۔۔؟" وہ کچھ شاک سے، کچھ شوق سے مخاطب ہوئی تھی۔

"پسند "تھی"....اب میری پسند بدل گئی۔"

زندگی کاش انہیں کسی اور وقت کے کسی اور جہاں میں ملوا دیتی۔زندگی ہمیشہ ان کے لیے تنگ کیوں ہوتی ہے جو محبت کرتے ہیں؟

کچھ پل بعد ہی پٹھان لڑکا کلونجی والے بسکٹس کی پلیٹ لے آیا تھا۔بھاپ اڑاتی چائے اب بھی دھری کی دھری پڑی تھی۔اس نے پلیٹ رکھ کر ”کچھ اور چاہیے صاحب“ پوچھا تو ارمغان نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ چلا گیا تو اس نے اپنی پلیٹ سے ایک کلونجی والا بسکٹ اٹھایا۔ایرج کی نظریں بغور اسی کو دیکھ رہی تھیں۔اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ایک ٹکڑا توڑا اور منہ میں ڈال دیا۔

”یہ تو واقعی کافی ذائقہ دار ہیں۔“اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

(ارمغان کو وہ کڑوے اور روکھے سوکھے بسکٹس قطعاً پسند نہیں آئے تھے۔)

”اچھے ہیں۔۔؟“ ایرج نے اس کی چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔

”ہاں واقعی۔۔!“ اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے تاثرات برقرار رکھے۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ابھی ہی منہ سے انہیں تھوک دے۔

”چہرے سے تو نہیں لگ رہا۔۔۔“ ایرج کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔

"ہاں تھوڑے سے کڑوے ہیں۔۔ مگر مجھے پتا ہے چائے کے ساتھ اچھے لگیں گے۔" اس نے فوراً ہی اپنی چائے کی پیالی نزدیک کی اور بسکٹ کو ڈبو کر کھانے لگا۔ پھر مسکرایا۔ اب واقعی اچھے لگے تھے۔

ایرج بغیر کچھ کہے، بس اسے دیکھتی رہی۔۔

"کبھی کبھی مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی' ارمغان۔"

اس نے ایک بسکٹ اپنی پلیٹ سے اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

"مجھے بھی آج کل اپنی سمجھ نہیں آرہی' ایرج۔" وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا، اور وہ اب تک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ارمغان۔۔۔میں نہیں چاہتی کہ۔۔"وہ اٹکی، لفظ تلاش کیے۔

"کہ؟"اس نے سر اٹھایا، متوجہ ہوا۔

"کہ تم میرے لیے یہ سب کرو۔"ایرج نے ہچکچاتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

وہ اس کی بات پر بس خاموشی سے اسے دیکھنے لگا، لب سلے ہوئے تھے، آواز ندارد۔

اس نے پانچ سال ایرج جاوید صدیقی کے نام کر دیے تھے اور ہجر کی آخری شب وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کی لیے کچھ نہ کرے۔ارمغان کو ہنسی آئی تھی۔

حالات پر۔

"تم قانونی راستہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔۔ابھی بھی یہی کر وناں۔۔"اس کا لہجہ التجا سے بھر گیا تھا۔ارمغان کا اندر باہر تلخ اور کڑوہ ہو گیا۔۔

اچھی باتیں اچھی یادیں بس شاید یہیں تک تھیں۔۔

"ایرج۔۔۔کیا ہم۔۔چند منٹ بغیر کسی ماضی اور بغیر کسی مستقبل کو سوچے"جی" سکتے ہیں؟اس حال میں،اس چاند کے سائے تلے۔بس چند منٹ اور۔تھوڑے سے سکون کے لمحے اور؟"

اس نے ارمغان کا ایسا لہجہ کبھی نہیں سنا تھا۔ جیسے وہ سولی پہ چڑھا ہو اور جلاد اس کی آخری خواہش سننے کا کہہ رہا ہو۔

ایرج نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔ ارمغان پیچھے کو ہو کر بیٹھا۔

چند لمحے پھر یونہی سرک گئے۔ اس نے جیب میں تھرتھراہٹ محسوس کی۔ فون نکال کر اس نے اسکرین دیکھی تو وہاں ایک پیغام جگمگا رہا تھا۔

وہ پیغام انہیں کا تھا۔ ارمغان کے باپ کا۔ موت کی گھنٹی ٹک ٹک ٹک بجنا شروع ہو گئی تھی۔ کاؤنٹ ڈاؤن گھٹتا جا رہا تھا۔

......

Seven-حفاظت

(بینکاک،حال)

وہ سیاہی اور اندھیروں میں گم تھا،ایک بڑی سی شاہانہ کرسی پہ براجمان وہ ایک ہاتھ میں سلگھتے سگار کا دھواں اڑا رہا تھا۔پیچھے کی کھڑکی سے آتی دھوپ پشت پہ پڑتی بس اس کا ایک سلوٹ واضح کر رہی تھی۔وہ راجا تھا،وہ راج کرنے کے قابل تھا۔

اس کے سنہرے لمبے بال سلیقے سے سیٹ تھے اور چہرے پہ نشان اس کے باعمر ہونے کی نشاندھی کررہے تھے۔سیاہ لمبے کوٹ کے اندر سے گردن کے گرد لپٹا مفلر جھلک رہا تھا۔ہاتھ کی ہر انگلی میں قیمتی انگوٹھیاں سجی ہوئی تھیں۔

وہ مقابل بیٹھے کسی شخص سے محو گفتگو تھا جب دروازے پہ دستک ہوئی۔

اس سنہرے بال والے شخص نے "آجاؤ" کی پکار دیتے دروازے کی سمت دیکھا۔

اور دروازے کے پار کھڑے شخص کو دیکھتے اس کی سنہری آنکھیں چھوٹی ہوگئیں۔

”جلد ملاقات ہوتی ہے تم سے پھر۔“اس سنہرے بال والے شخص نے سامنے بیٹھے آدمی سے کہا کہ اب اس کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔وہ لمحے کی دیری کیے بنا کرسی سے اٹھا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔

اب دروازے کے پاس کھڑا شخص دھواں دار کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔وہ کرسی پہ پشت ٹکائے ہاتھ میں پکڑے لیپ ٹاپ کو اس شخص کی طرف کرنے لگا جو سگار کا آخری کش لے رہا تھا۔

”میں نے کہا تھا آپ سے۔“

اس نے لیپ ٹاپ سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا اور بات جاری رکھی۔

”میں نے کہا تھا دوروس کو اتنی محبت اور لاڈ نہ دیں کہ وہ ایک دن ایسا قدم اٹھا لے جس کی وجہ سے ہم سب کو پچھتانا پڑے۔“ آدمی نے ہونٹوں پہ انگلی رکھی۔

سنہرے بال والا شخص لیپ ٹاپ پر چلتی سی سی ٹی وی ویڈیو دیکھ رہا تھا۔ وہاں حیدر ارحم کے ساتھ ائیر پورٹ پہ کھڑا کسی کو فون ملا رہا تھا۔

”اگر اب بھی ہم نے انتہائی قدم نہیں لیا تو وہ اپنے ساتھ ہمیں بھی ڈبو دیگا‘ سرکار ایلیٹ!“

سنہرے بالوں والے ایلیٹ کی آنکھوں میں دکھ تھا،اور غصہ بھی۔حیرانی بھی،اور خوف بھی۔۔۔(کسی ہیومن ٹریفک لیڈر کی آنکھ میں خوف کا مطلب جانتے ہو تم؟)

"ہمارے پاس کوئی اور راستہ۔۔"

"اور کتنی محبت برسائیں گے آپ اس پر،ایسا کیا ہے اس میں،یہ مر بھی جائے گا تو ہمارا کاروبار ویسے ہی چلتا رہے گا،اگر یہ بچ گیا تو ہم سب مارے جائیں گے۔"

وہ اب آگے جھک کر پریشانی سے ایلیٹ کو کہہ رہا تھا۔

"میں کیسے مار سکتا ہوں دوروس کو، ایلی؟"

ایلیٹ نے سنہری آنکھیں اٹھا کر سامنے بیٹھے ایلی کو دیکھا۔

"اس کو اتنے سال بچاتے بچاتے آپ نے خود کی قبر کھودلی ہے سرکار، اب آخری لمحہ آگیا ہے کہ اگر اب کچھ نہیں کیا تو ہمارے پاؤں قبروں کے اندر ہوں گے۔"

وہ اب تحمل سے گویا ہوا۔ مگر اس کی آواز میں لرزش سی تھی۔

"دوروس اچھا بچہ ہے ایلی۔ وہ مختلف ہے، اس نے محبت کی ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔" ایلیٹ اب اپنی پیشانی مسل رہا تھا، سگار جوتوں کے نیچے کچلی جا چکی تھی۔

"وہ قاتل ہے، قاتل محبت کرتے ہیں تو ان کا انجام موت ہی ہوتا ہے، نہ ہم اس کا انجام بدل سکتے ہیں، نہ وہ خود۔ شیطانوں کو جہنم میں تو جانا ہی ہے۔"

وہ ایلیٹ کو سمجھتا تھا، اس کی حال اور اس کی سخت دل میں موجود دوروس کی وجہ سے پڑی نرم دراڑ کو بھی۔۔ مگر اب وقت تھا دماغ سے سوچنے کا کیونکہ دل فیصلوں میں نقصان کرواتا ہے۔

"میں بدل سکتا ہوں اس کا انجام۔۔"

"ہاں، ساتھ ہم سب کا انجام بھی سوچیں پھر۔اس کی زندگی کامل کر کے ہماری زندگی کے پردے اندھیر کرنا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے تلخی سے کہا۔

کمرے میں خاموشی حائل ہو گئی۔بس دھواں ادھر ادھر اطراف میں اڑ رہا تھا۔

"اس نے پلین ہائی جیک کا آڈر دے دیا ہے، وہ بھی ایک لڑکی کی خاطر۔۔ ہمیں بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔۔۔ارحم کو بچانے کا آپشن اب ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ مگر اب ارحم کے ساتھ ہمیں ارمغان کو بھی۔۔۔" اس نے جملہ چھوڑ دیا، الفاظ ٹوٹ کر بھی گھاؤ جتنا اثر دے گئے۔ کمرے میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

''اس کو تکلیف محسوس نہیں ہونی چاہیے ایلی، بلکل بھی نہیں۔''

چند پل بعد خاموشی توڑتے ہوئے انہوں نے ایلی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے ہدایت دی۔اور ایلی ایلیٹ کی آنکھوں کو دیکھتے بے اختیار دکھی ہوا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں ایلیٹ سرکار۔۔۔مگر یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے۔''

ایلیٹ نے اس کی بات پہ بس سر ہلا دیا، جیسے اب کچھ اکیلا وقت مانگ رہا ہو۔ایلی کی آنکھوں میں تاثر ابھرا تھا۔مگر غلط وہ بھی نہیں تھا۔فیصلہ سخت تھا مگر وہی فیصلہ تھا۔اس کی علاوہ کچھ بھی تو نہ تھا جو وہ کر سکتا تھا۔

لیپ ٹاپ اٹھائے وہ بے حد خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔دوسرے ہاتھ سے کسی کا نمبر بھی ملا رہا تھا۔

اور کمرہ اکیلا پڑ گیا۔وہاں بھی بس اب ایک جسم لاش ہو رہا تھا۔

ایلیٹ نے سائڈ پہ پڑا فون اٹھایا،لرزتے ہاتھوں سے لاک کھولا۔پھر گیلری کھولی اور اس کی چند تصاویر دیکھنے لگا۔

کسی میں وہ تیر کمان تھامے نشانہ لے رہا تھا۔

کسی میں بے ساختہ مسکرا رہا تھا۔

چند میں وہ باکسنگ گلوز پہنے ہاتھ گھما رہا تھا۔

چند تصاویر میں کاغذ پہ کچھ لکھ رہا تھا۔

ایک تصویر میں ارمغان کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔

کچھ میں وہ دوسرے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔

ایلیٹ کے چہرے پہ زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی، آنسو کا ایک قطرہ نجانے کیسے، مگر فون کی اسکرین پہ گر گیا۔

"تم میرے سب سے اچھے شاگرد تھے دوروس، سب سے زیادہ طاقتور اور دلیر۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی موت کو بھی دلیری سے خوش آمدید کہو، تم ہم جیسے نہیں تھے۔۔۔ کاش میں تمہیں کبھی ہم جیسا بننے پہ مجبور نہ کرتا تو آج تمہاری زندگی اور محبت کامل ہوتی۔۔۔ واقعی۔۔ تم ہمارے جیسے نہیں تھے، تم انسان تھے، اور میں

نے تمہیں۔۔۔میں نے تمہیں حیوان بنا دیا۔۔۔غلط کیا یار۔۔۔بہت بہت زیادہ غلط کیا میں نے۔“

وہ اپنی شاہانہ کرسی پہ بیٹھا کسی عام انسان کی طرح ٹوٹ رہا تھا،خود کلامی کرتے وہ خود میں مر رہا تھا۔کیونکہ اس کی کہانی کا مرکزی کردار تو کوئی اور تھا۔جو انسان تھا،جو بالاتر تھا۔

سنہری آنکھوں میں سرمئی سے ذرات مٹی مٹی کر کے ایک منظر ترتیب دینے لگے تھے۔۔۔

(بینکاک،ماضی)

وہ سربراہی کرسی پہ بیٹھا تھا۔اپنے ہی انداز میں۔کھڑکی رات کا منظر واضح کر رہی تھی۔کمرے میں سفید مصنوعی روشنی چھائی ہوئی تھی اور ہر جگہ عود کی خوشبو۔

اس کی سنہرے بال ماتھے کو چھپا رہے تھے۔آنکھوں میں کوئی تاثر عیاں نہ تھا۔سفید لونگ کوٹ سے سرخ مخملی ٹائی دکھائی دے رہی تھی۔ہاتھ میں سلور ڈائل گھڑی تھی۔چہرہ کسی بھی داغ سے پاک۔

وہ کافی عمر کا ہونے کے باوجود بھی کم عمر لگتا تھا۔

کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا تو اس نے آنکھیں وہاں جمالیں۔ایک ملازم اپنے پیچھے ایک دوسرے لڑکے کو اندر لا رہا تھا۔پھر وہ کمرے کے دروازے پہ کھڑا ہو گیا۔

"اندر آجاؤں سر؟"اس نے جھکے جھکے سر کے ساتھ پوچھا۔

ایلیٹ محظ "ہمم" کرتا اسے اجازت دے چکا تھا۔وہ چھوٹے چھوٹے قدم لے کر اندر آگیا۔اس کی پیچھے اسی کی عمر کا لڑکا اس کی ساتھ ساتھ قدم اٹھاتا آرہا تھا۔

"اب تم جاؤ،اور دروازے کو بند کر دینا۔"وہ دونوں جب ایلیٹ کے قریب پہنچے تو اس نے اپنی اسی بھاری آواز میں ملازم پہ حکم سادر کیا۔وہ سر ہلاتا باہر کو چل دیا۔

اب اس کی سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا جس کی عمر لگ بھگ بیس اکیس سال تھی۔اس کا سر جھکا ہوا نہیں تھا۔بلکہ وہ ایلیٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھ رہا تھا۔

جہاں ایلیٹ سے سر اٹھا کر کوئی بات نہیں کر سکتا تھا،وہ لڑکا اسے گھور رہا تھا۔

"کیا نام تھا تمہارا۔۔؟"ایلیٹ کو بخوبی معلوم تھا اس کا نام۔مگر وہ اس کے دلیری سے محظوظ ہوا تھا۔

"دوروس۔"یک لفظی جواب،سرد سا لہجہ۔

"ہاں، دوروس۔ تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے۔" ایلیٹ نے اس کا چہرہ پڑھتے اس سے سوال کیا۔

"میں نے رستم کا ہاتھ توڑ دیا۔ شاید اس لیے۔" اس کی نظروں میں اب اور سخت سا تاثر ابھرا تھا۔

"رستم یہاں چھتیس سال سے ہے۔ اور آج تک کوئی اس کو ہاتھ تو کیا لگانا، اس سے منہ ماری بھی نہیں کر پایا۔۔۔ اور تم نے اس کا ہاتھ توڑ دیا۔" ایلیٹ اسے رستم کی اصلیت بتا رہا تھا۔ رستم ایلیٹ کا کافی قابلِ اعتبار ایک ہٹا کٹا مشٹنڈا تھا۔ وہ کافی لمبا اور طاقت ور سا نوجوان تھا۔ وہ ہوتے ہیں ناں ہر کہانی میں ایک پہلوان قسم کے باڈی گارڈ۔ رستم بس وہی تھا۔

"کیونکہ لوگوں میں عقل نہیں ہے۔اس کا جسم طاقتور ہے،دماغ نہیں۔میں نے اس کو وہاں پہ وار کیا جہاں وہ کمزور تھا۔اور پھر وہاں وار کیا جہاں میں نے اس کو کمزور کر دیا تھا۔"اسے اور وضاحت دینے کی ضرورت نہیں تھی،ایلیٹ کے چہرے پہ مسکراہٹ در آئی تھی۔

"کیوں مارا کیسے مارا میں نہیں پوچھوں گا تم سے۔مگر اتنا کہہ دیتا ہوں کہ۔۔۔"

ایلیٹ کرسی سے اٹھا اور اسے کندھے پہ دونوں ہاتھ جما دیے،وہ ناسمجھی سے اسے دیکھتے رہا۔

"تم بہت خاص ہو۔اور تمہیں تراش کر سونا میں بناؤں گا۔۔"ایلیٹ کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

”کیا تم بننا چاہتے ہو سونا؟“اس نے سوال کیا۔

”میں ہیرہ بننا چاہتا ہوں‘ باس۔“ارمغان مسکرایا نہیں تھا، مگر اس کی سیاہ آنکھوں میں چمک اٹھی تھی۔

ایلیٹ نے اس کا چہرہ تھتھپایا۔

”تمہاری ٹریننگ شروع کردیں؟“ایلیٹ نے ایک اور سوال کیا۔

”اسی کا تو انتظار ہے۔“اس نے سخت سے جملے ادا کیے۔

"وہ تمہارے وجود سے بھی خوف کھائیں گے دوروس، میرا وعدہ ہے یہ۔" ایلیٹ کا لہجہ پہلی مرتبہ رعب دار سا ہوا تھا۔

"مجھے اس بات کی اجازت بھی دیں' باس، کہ آپ مجھے اس شکار میں کسی بھی مرحلے میں نہیں روکیں گے۔ چاہے آپ کے حکم کی توہین ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ مجھے میرا بدلا چاہیے باس۔ اس میں کوئی خلل آیا تو میں کمزور پڑ جاؤں گا۔" اس کا لہجہ حتمی ہو گیا تھا، تھوڑا سا نم بھی۔۔

"یاد رکھنا دوروس، اس راہ پہ گامزن ہونے سے پہلے یہ یاد رکھنا۔۔ اس راہ میں موجود کسی بھی شخص سے دل نہیں لگانا۔ ورنہ تم بھی تباہ ہو جاؤ گے، اور وہ بھی۔"

ارمغان اسے دیکھتا رہا۔

"اور اگر تم نے اس راہ میں دل کی آواز سے کام لیا، تب میں بھی تمہیں۔۔۔بچا نہیں پاؤں گا۔"

اس کی سامنے ہیومن ٹریفک لیڈر کھڑا تھا۔اور وہ ایک ایسی بات سے وار ن کر رہا تھا جس سے "وہ" بھی اسے بچا نہیں پائے گا۔

ایلیٹ نے اس کا چہرہ ایک بار پھر تھپتھپایا۔

"تم چاہے کتنی بھی دور نکل جاؤ' دوروس۔لوٹ کر تمہیں یہاں ہی آنا ہے۔ میرے پاس۔کیونکہ ہمیں جدا اب کون کر سکتا ہے بھلا۔"

اور وہ دونوں مسکرائے تھے۔

کاش کہ ارمغان کو اس کی بات کا مفہوم سمجھ آچکا ہوتا۔ کاش کہ اسے ایلیٹ کی بات کی سنگینی کا احساس رہا ہوتا۔۔۔!

(حال)

اس نے دکھ سے آنکھیں موند لیں۔ یہاں ایلیٹ کا قصور نہیں تھا۔ اس نے دوروس کو وارن کیا تھا۔

مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں، جنہیں ''زندگی'' کا مفہوم ''موت'' دکھائی دیتا ہے۔

ایلیٹ نے گیلری بند کی اور ڈائل پیڈ کھولا۔

وہ اس کو اس کی موت کی خبر خود دینا چاہتا تھا۔ وہ پانچ سال بعد خود اسے بتانا چاہتا تھا کہ جو بات اس نے کہی تھی، وہ اس میں ناکام ہوا تھا۔

....

(کراچی، حال)

وہ سب وہاں دم سادھے فلائٹ کے انتظار میں تھے۔ جلد ہی جہاز لینڈ ہونے والا تھا۔ جلد ہی وہ لاہور پہنچنے والے تھے۔

حیدر بار بار شیو کھجاتا کسی گہری سوچ میں مبتلاء تھا۔اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جس انداز میں سب صفائی کے ساتھ ہو رہا ہے، ٹو دا پلین۔ کچھ تو گڑ بڑ ضرور ہونے والی ہے۔

اس نے سوچا تھا کہ فلائٹ ہائی جیک ہو جائے گی، یا پھر کریش ہو جائے گی۔ یا پھر کچھ بھی ایسا ہو گا کہ وہ لوگ لاہور اس رات پہنچ نا پائیں۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔ فلائٹ کے لینڈ ہونے کی خبر اسپیکر پہ ابھر چکی تھی۔

وہ واقعی لاہور جا رہے تھے۔

وہ واقعی لاہور جا رہا تھا۔اس کے پاس۔اس سے ملنے۔اس کا شکریہ کہنے،اس کو گلے بھی لگانے۔زندگی کہاں سے کہاں لے آتی ہے انسان کو۔وہ لوگوں کو ریسکیو کرتا ہے اور اچھے ناموں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔اور ارمغان بھی تو وہی کام کرتا ہے۔ مگر اس کا شمار تو بلیک لسٹڈ کریمنلز میں کہیں ہوتا ہے۔

دونوں کا کام ایک ہے، مگر دونوں کا انداز کتنا مختلف ہے۔

کراچی سے لاہور،اور لاہور سے شاہی محلہ۔دو مسافت،ایک مسافر،اور منزل۔

کاؤنٹ ڈاؤن اور گھٹتا چلا جا رہا تھا۔

....

(لاہور، حال)

موسم میں ٹھہراؤ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ہوائیں پھر سے شدت اختیار کر اٹھی تھیں۔
خوشگوار موسم میں دو وجود کا دل بوجھل تھا۔ سوکھا سوکھا، بنجر بنجر۔

اس نے فون کا جواب نہیں دیا تھا۔ ابھی اسے کسی بھی مستقبل کی خراش کے بارے میں نہیں سوچنا تھا۔ اس کی سامنے ایرج تھی۔ زندگی مل جانے پہ موت کے بارے میں بھی کوئی سوچتا ہے بھلا؟

"تمہاری پیٹھ پہ ٹیٹو ہے؟" ایرج کو جب خیال آیا تو اس نے عام لہجے میں سوال کیا۔

ارمغان نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ آنکھیں میز پہ پڑی چائے کی پیالی پہ جمی تھیں۔

"کیوں؟ میرا مطلب ہے تم مسلمان ہو نا؟ تو پھر یہ کیوں۔۔؟" ایرج نے سوال کا سلسلہ پچھلے سوال سے ملایا۔ اس نے سر اٹھا کہ اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرد ہو گئی تھیں، چہرہ پتھریلا سا۔ جیسے ان چند لمحوں میں کچھ بدل گیا ہو۔ وہ اب بے فکر

سا نظر نہیں آ رہا تھا۔ماتھے پہ سلوٹیں ابھری ہوئی تھیں۔لب سطر کے طرح بھینچے ہوئے۔

"میرا دل چاہ رہا تھا۔اسی لیے بنوالیا۔"اس نے اس ٹاپک کو ٹالنا چاہا۔مگر وہ تھی کی سرے سے ہی الجھ گئی۔

"کیا مطلب دل چاہ رہا تھا؟کوئی تو وجہ ہو گی نا؟"

وہ اس کی بات پہ تلخی سے مسکرایا تھا۔وجہ تو اس کو معلوم تھی۔۔۔اسی وجہ پہ ہی تو اس نے اسے "قاتل"کہا تھا۔جو موڈ اب تک اس کا ٹھیک تھا،پہلے ایلیٹ کی کال کی وجہ سے اور اب ایرج کی بات کی وجہ سے بیڑا غرق ہو چکا تھا۔

"کچھ نہیں، لیو دس ٹاپک۔" اس کا لہجہ حتمی تھا، آواز گہری، بے مروّت سی۔

ایرج کو حیرانی ہوئی۔ وہ پل میں بدل گیا تھا۔ ابھی تو ٹھیک ڈھنگ سے بات کر رہا تھا اور پل میں ہی ایک جواب نہیں!

ایرج نے اور دباؤ نہیں ڈالا۔ کسی اور موضوع کو تلاشنے لگی۔ اس کے بارے میں کچھ اور معلوم کرنے کی کوشش۔

"تمہارا کوئی دوست نہیں ہے؟" ایرج نے بلآخر بات کا سلسلہ کسی نئے موضوع سے جوڑا۔

''تھا۔ پھر وہ کسی اور رستے چل دیا، میں کسی اور۔''

اس کا لہجہ اب بھی اتنا سرد سا تھا۔ ٹینس سا۔

''تمہیں دنیا سے، لوگوں سے اتنی شکایتیں ہیں۔۔''اس نے محض بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا مگر ارمغان نے سن لیا۔

''شکایت نہیں ہے۔ بس میرا دل اٹھ گیا ہے۔''عام سا لہجہ، مگر سرد سا تاثر۔ گہرا مفہوم تھامے ہوئے۔

"زندگی سے کس کا دل اٹھ سکتا ہے؟" اس نے سوال در سوال کیا۔اور وہ مسکرایا تھا۔پھیکی سی مسکراہٹ۔

"جب دنیا سے دل اٹھ جاتا ہے،تب ہی تو انسان کو سکون ملتا ہے۔" آواز مدھم ہو گئی،ارد گرد کا شور بھی کم ہو گیا۔آسمان اب بھی ویسے ہی تاریک تھا۔

"میں بھی اس دنیا میں شامل ہوتی ہوں'ارمغان۔۔" اس نے ہلکی پھلکی سی بات کہی تھی۔ارمغان اچانک سے کافی سنجیدہ لگ رہا تھا۔اور نجانے کیوں اس کا موڈ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔نجانے کیوں اسے وہ بے فکر سا ارمغان زیادہ اچھا لگا تھا۔زندگی اس پہ کتنی جچتی تھی۔

"تم میری دنیا میں شامل نہیں ہو' ایرج۔ تم میری دنیا ہو۔ چاند سے آسمان تک، بنجر سے باغات تک۔ سب کچھ۔"

وہ اس کی بات پہ سکوت میں چلی گئی تھی۔ کسی ٹرانس کے عالم میں۔ وہ ایسی باتیں کتنے عام لہجے میں کر گزرتا تھا۔۔ کتنی آسانی سے۔ اس کی لیے اظہار کرنا مشکل کیوں نہیں ہوتا تھا۔ وہ جھجکتا کیوں نہیں تھا۔ ایرج نے سوچا۔

چائے کا سپ لیتے وہ ایرج کی حیران آنکھوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے سوال کا جواب کب کا مل چکا تھا۔ بس ثبوت دے کر اظہار باقی تھا۔ اور یہ سلسلہ بہت درد ناک تھا۔ ایرج کے لیے زیادہ تھا۔ یہ سلسلہ سعد کی داستان تھا۔ اس کے بھائی کی کہانی۔

"تم وہ ان کہی کہانی سننا چاہتی ہو۔۔ ایرج؟" اس نے بہت نرمی سے پوچھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ حامی بھر لے۔ وہ دونوں ایک "کمفرٹ زون" میں جا رہے تھے۔ اور آرام اور بے فکری ابھی ان کی زندگی کے پہلو سے جڑنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔

"چند منٹ۔۔ کیا ہم چند منٹ اور ایسے ہی باتیں کر سکتے ہیں؟ بغیر ماضی کو یاد کیے، بغیر مستقبل کی پرواہ کیے؟" اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ نم سی آنکھیں۔ ارمغان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ کاش وہ زندگی کی تمام تر تلخیوں کو نکال باہر کر سکتا۔ کاش زندگی کو ایک نئے سرے سے شروع کرنے کا آپشن اس کی پاس موجود ہوتا۔

"ارمغان۔۔۔ تم مجھے۔۔ تم مجھے، سارہ اور سعد کو۔۔ کہیں دور بھیج دو۔ بالکل دور۔ جہاں کوئی نہ ہو۔ جہاں ایک نئی زندگی ہو۔ جہاں سب کچھ نیا ہو۔" ایرج کی آواز میں دکھ تھا، جھوٹی سی امید تھی۔

''کیا میں تمہاری زندگی میں کہیں نہیں ہوں' ایرج؟''اس کی دل کو ٹھوکر پڑی تھی۔ یا شاید اب کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

''سعد کے ساتھ کیا ہوا تھا ارمغان۔ وہ گھر سے کیوں بھاگا تھا۔۔اس کے ساتھ فاطمہ منزل میں کیا کیا ہوتا رہا تھا۔۔؟''ایرج نے بہت ضبط سے پوچھا۔

ان دونوں کے درمیان ماضی آگیا تھا۔ دردناک یادیں۔ ارمغان نے غور کیا تھا۔ اس نے غور کیا تھا کہ ایرج نے اس کی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں کہاں تھا۔۔؟اس نے تو کسی بھی ''جواب''کی خواہش کے بنا اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اس کے دل ٹوٹنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔

یک طرفہ محبت میں ٹھوکر کے سوااور ہوتا ہی کیا ہے بھلا؟

ارمغان نے گھونٹ گھونٹ تمام گھاؤ کو حلق کے نیچے اتار لیا تھا۔اور وہ تو جرح کھا کر مسکرانے میں ماہر تھا۔ارمغان۔جس کے نام کے برعکس وہ کسی کے لیے بھی "خدا کا تحفہ" نہیں تھا۔وہ جس کی زندگی میں آیا تھا،اس کو برباد کر دیا تھا۔ہادیہ،سارہ، سعد،ایرج۔۔اس نے تمام خوشیوں کو تباہ کیا تھا۔وہ توان سب کی زندگی میں "خدا کی سزا" بن کر نازل ہوا تھا۔

ارمغان مطاہر علی۔وہ خود پہ کسی کے تھوکنے کو بھی عطر سمجھ کر خود پہ سجالیتا تھا۔

وہ ایرج کی زندگی میں کہیں بھی نہیں تھا۔مگر وہ یک طرفہ محبت ہی کیا جس میں انسان ٹھکرا جانے کے بعد بھی خوشی خوشی محبت کے ضار جھیلتا،پل پل مرتا رہے،

ایک ایسے انسان کی راہ تکتا رہے جو نہ اس کی راستے کا ہمسفر ٹھہرنے والا ہو، نہ اس کی منزل کا مسافر۔

ارمغان نے بہت کچھ اندر ہی اندر مار دیا تھا۔ ایرج اسے سنسان نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔

"سعد ایک سروائور ہے ایرج۔ اور ہر سروائور کی کہانی بہت دردناک ہوتی ہے۔"

اس نے بولنا شروع کیا تھا۔

بسکٹس ویسے ہی ان چھوئے رہ گئے تھے۔ کس کو معلوم تھا ان بسکٹس کے مالک اگلے چند گھنٹوں میں موت سے دوچار ہو چکے ہونگے۔

••••••••••

(لاہور، حال)

وہ دم سادھے لمحوں کو گن رہی تھی۔ سعد اس کے مقابل گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ پلکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

وہ اس کی کہانی تھی۔اسے وقت کا ہر لمحہ درکار تھا۔

••••••••••

(کراچی،ماضی)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ لوگ لاہور سے کراچی واپس آ گئے تھے۔ان کی چھوٹی سے فیملی وہاں آ کر بس گئی تھی۔گھر ویران پڑا رہتا تھا اور اب اچانک سے بھر سا گیا تھا۔

اس نے کندھے سے بیگ اتارا اور پانی کے چار سے پانچ گلاس غٹا غٹ پی گیا۔ صحن کی چارپائی پہ مریم بیگم بیٹھی تھیں۔ سلائی بنائی کا تھوڑا بہت کام وہ بھی کر لیتی تھیں۔ ابھی بھی ایک ہاتھ میں سوئی پکڑے دوسرے ہاتھ سے دھاگا پیرونے کی کوشش کر رہی تھیں۔

وہ اسکول سے تھکا ہارا آیا تھا اور اب امی امی کرتا پورے گھر میں امی کو ڈھونڈنے کی کوشش میں تھا۔

"چاچی، امی کو دیکھا ہے کہاں ہیں؟" وہ گھر سے صحن میں آیا تو دھوپ کی شعاعیں آنکھوں پہ پڑیں۔ اس نے فوراً آنکھیں سکیڑلی تھیں۔

''اوپر ہو گی حنا۔ ہر ادھنیا توڑنے گئی تھی۔'' وہ ناک پہ چشمہ درست کر کے کہنے لگی تھیں کہ گھر کے دروازے سے کوئی اندر آیا تھا۔

''اسلام و علیکم!'' اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی باآواز بلند سارے گھر والوں کو سلام کیا تھا۔ سیاہ رنگ کی ڈریس شرٹ پینٹ میں ملبوس ارحم گھر کے اندر کو آرہا تھا۔ سیاہ کوٹ ہاتھ پہ تہہ شدہ تھا اور شرٹ کے اوپر تین بٹن کھلے تھے جن سے سلور لاکٹ بالوں سے الجھتا، گردن سے لپٹے کبھی اندر کبھی باہر جھول رہا تھا۔ شرٹ پہ سیاہ گلاسز اٹکے ہوئے تھے اور ماتھا کسی بھی شکن سے عاری۔ وہ چھے فٹ سے نکلتا بلاشبہ ایک ہینڈسم اور ڈیسنٹ لکنگ بندہ تھا۔

دروازہ اس کے پیچھے آہستگی سے بند ہو گیا۔ مریم کے چہرے پہ تو اسے دیکھ کر مسکراہٹ در آئی تھی۔ برابر کھڑا سعد بھی مسکرایا تھا۔ ارحم تھا تو اس کا کزن، مگر اس کی تمام اخلاق بالکل بھائیوں جیسے ہیں۔

وہ قریب آیا تو پیار سے سعد کا چہرہ تھپتھپایا۔

''اور کیسے ہو ہیرو؟'' ماں کے ساتھ چارپائی پہ بیٹھتے اس نے پوچھا۔ اس کی بات پہ سعد اور مسکرایا۔

''ٹھیک ٹھاک!'' جواب آیا۔

''پڑھائی وغیرہ کیسی چل رہی ہے؟دوست وغیرہ بنائے؟'' وہ اب مکمل اس کی طرف متوجہ تھا۔

''جی ہاں! دو دوست بھی بن گئے۔اچھا میں ذرا امی کو دیکھ کے آجاؤں۔'' وہ کہتا اوپر چلا گیا۔

ارحم کی نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

''آج جلدی آ گئے آفس سے؟'' مریم نے اس کی سر پہ ہاتھ رکھے پوچھا۔

"تھکن ہو رہی تھی۔ باقی کا کام گھر پہ کرنا ہے۔ ابھی چینج کر کے کام لے کر ہی بیٹھنا پڑے گا۔" اس نے لمبی سانس خارج کی۔

لاہور میں جو اس پہ جھوٹے الزامات لگائے گئے تھے وہ جھوٹے ہی سہی مگر "الزامات" تو تھے ناں! لوگ گلی گلی جگہ جگہ ارحم کو دیکھے تو بھی گندی نظروں سے۔ باتیں کی جاتیں۔ آوازیں کسی جاتیں۔ ان سب معاملات نے نہ صرف ارحم کو، بلکہ پوری فیملی کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔ خاندان سے فون آتے رہتے تھے کہ سب خیریت تو ہے؟ کیس کورٹ تک نہیں گیا تھا مگر لوگوں تک تو پہنچ گیا تھا۔ آخر میں طے پایا تھا کہ وہ لوگ واپس اپنے آبائی گھر آجائیں گے۔ ایک نئی زندگی کو شروع کریں گے، کسی بھی داغ سے پاک۔

"اچھا تم فریش ہو جاؤ، میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر چارپائی سے اٹھنے لگیں۔ارحم بھی بیگ اٹھائے سیڑھیاں پھلانگنے لگا تھا کہ جب اس کی نظر کھڑکی سے جھانکتی ایرج پہ پڑی۔

وہ وہیں ٹھہر گیا۔اس کی طرف مسکرا کے ہاتھ ہلایا اور اوپر چڑھتا چلا گیا۔

آخری زینے پہ پہنچتے وہ ساکت سا ہو گیا۔

سامنے سعد کھڑا کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ارحم کی طرف اس کی پشت تھی۔ارحم قدم قدم اس کی پیچھے آیا۔آہستگی سے اس کی کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ کسی خواب کے عالم میں پلٹا۔

"کیا ہوا؟ کس کو ڈھونڈ رہے ہو۔۔؟" اس کی چہرے پہ مسکراہٹ نہیں تھی۔۔ کچھ بہت عجیب سا تاثر تھا۔

"کچھ نہیں وہ بس امی کو ڈھونڈ رہا تھا۔۔ پتا نہیں کہاں ہیں۔۔" اس نے وضاحت کی۔

"نیچے ہوں گی وہ تو۔۔ واش روم گئی ہوں گی۔" اس کی بات پہ سعد نے سر ہلا دیا۔ پھر قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھا دیے۔

ارحم اسے جاتا دیکھتا رہا۔آنکھوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ گرمی کی شدت اچانک سے بڑھ گئی تھی۔ماتھے پہ پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔

ارحم نے بیگ بستر پہ اچھالا۔بیلٹ کا بکل کھولا اور شرٹ کو باہر نکالنے لگا۔تولیہ کو ایک ہاتھ سے تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے سیاہ شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا۔

پھر اس نے ٹیبل پہ رکھا فون اٹھایا اور واش روم میں داخل ہو گیا۔

شاور کھولتے ہوئے اس نے فون الگ زاویے پہ فکس کر دیا کہ پانی کے چھینٹے اس تک نہ پہنچے۔وہ خود شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ٹھنڈے پانی سے خود کی حرارت کم

کرتے ہوئے وہ بالوں کی پیچھے کر رہا تھا کہ اس نے ایک ہاتھ سے موبائل ان لاک کیا اور گیلری کھولی۔

اس میں "سعد" کے نام سے ایک الگ فولڈر بنا ہوا تھا۔اس نے وہ فولڈر کھولا تو ارحم کی حقیقت اس کی سامنے ایک اور بار آکھڑی ہوئی تھی۔

اس فولڈر میں سعد کی الگ الگ زاویوں سے تصویر کھینچی گئی تھیں۔کچھ میں وہ سو رہا تھا، کچھ میں کھیل رہا تھا، کچھ میں۔۔۔نہا رہا تھا۔اور کچھ میں کپڑے تبدیل کر رہا تھا۔

ارحم ایک ایک تصویر سے لطف اندوز ہوتے ہر پکچر کو زوم کر کر کے دیکھ رہا تھا۔

اس نے ایک ہاتھ سے شیمپو کی بوتل کھولی تھی۔

واش روم میں خاموشی تھی۔بس شاور کی آواز اور ارحم کی لمبی لمبی، گہری گہری، پھولی پھولی سانسیں۔

....

سعد کے ان دنوں پیپرز چل رہے تھے تو وہ اکثر کمرے میں ہی بند رہتا تھا۔رات کو وہ سارہ کے پاس اوپر پہنچ جاتا تاکہ جو ٹاپک اسے خود سے سمجھ نہیں آتا ہو، وہ سارہ سے سیکھ لے۔

ایرج اور سعد کی بونڈنگ ”بھائی بہنوں“ والی نہیں تھی۔ وہ ایک چھت کے نیچے رہتے تھے مگر ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ایرج اپنے کام میں بزی رہتی، سعد اپنی پڑھائی میں۔ زیادہ تر دونوں کا سامنا کسی کام یا ضرورت کے تحت ہوا کرتا تھا۔

گرمیوں کی ایک شب تھی۔ فاطمہ منزل کی بالکنی میں چائے کا کپ تھامے سارہ سعد کی نوٹ بک کو دیکھے بغور کچھ پڑھ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ الائچی والی چائے کے سپ بھی حلق میں اتار رہی تھی۔

”یہ ٹاپک تو اتنا آسان ہے یار! لاؤ پینسل دو۔“ اس نے بک کو میز پہ رکھا اور نوٹ بک کھولی۔ سعد بھی اشتیاق سے آگے جھکا نوٹ بک کو دیکھنے لگا۔

سارہ کچھ لکھ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے ارحم کی آواز سنائی دی۔

"آئس کریم کھانے چلے گا کوئی؟" وہ ساتھ ساتھ گاڑی کی چابی گھماتا باآواز بلند پوچھ رہا تھا۔ایسے پورے گھر کو مخاطب کر کے بات کرنا اس کی بچپن کی عادت تھی۔

"کوئی آئس کریم کھانے نہیں جارہا۔ابھی پڑھائی ہو رہی ہے اور صرف پڑھائی ہو گی۔" اس نے حتمی لہجے میں ارحم کو گھور کے کہا۔

"بس بھی کرو سارہ! بیچارے کو بریک دے دو تھوڑا۔کب سے لے کر اس کا دماغ کھا رہی ہو۔" اس نے منہ بسورتے کہا۔

''ہاں تو کل پیپر ہے جناب کا اور اب تک تیاری مکمل بھی نہیں ہوئی ہے۔''سعد نے چہرہ موڑ کر ارحم کو دیکھا۔اور پھر اشاروں اشاروں میں کہہ دیا کہ اگر جا ہی رہا ہے تو اس کے لیے ٹیک آؤٹ کروا لے۔

ارحم مسکراتے ہوئے نیچے جا رہا تھا کہ اسے ایرج سیڑھیاں چڑھتے دکھائی دی۔

''کہاں میڈم؟''وہ اس کا راستہ روک چکا تھا۔

''آئس کریم کھانے کون جا رہا ہے؟''ایرج نے ہاتھ باندھے،وہ دونوں وہیں سیڑھیوں پہ ٹھہر گئے تھے۔

”یہ جو سامنے چھ فٹ تین انچ کا شخص کھڑا ہے، وہ۔“اس نے بھی شانے اچکائے تھے۔

”اکیلے اکیلے بھی کوئی آئس کریم کھانے جاتا ہے بھلا؟“اس نے سوال کیا۔

”تو کوئی جا ہی نہیں رہا تھا۔ سعد پیپرز کا پڑھ رہا ہے، سارہ اسے پڑھا رہی ہے اور دانیال صاحب نجانے کدھر نکلے ہوئے ہیں اپنے دوستوں کے ساتھ۔“اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا تھا۔

"ایک اور بھی کزن ہے آپ کی، مسٹر ارحم صدیقی!" اس کی آنکھوں میں شکوہ در آیا تھا۔

"وہ کزن اپنے خول سے باہر نکلے تب ہی تو اس سے کوئی بات کی جا سکتی ہے۔" ارحم نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"چلو۔ مجھے کھانی ہے آئس کریم۔" وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

"اج بھی وہی ببل گم یا پھر کوئی اور۔۔؟" ارحم اس کے پیچھے پیچھے چلتا آ رہا تھا۔

"ببل گم۔ اور کوئی نہیں!" وہ دونوں گھر سے باہر نکل گئے تھے۔

....

اگلے دن سعد پیپر دے کر آیا تو وہ گھر جاتے ہی سو گیا تھا۔اس کی نیند مکمل نہیں ہوئی تھی اور سر یک دم چکرانے لگا تھا۔اگلا پیپر دو دن بعد تھا جو کہ آخری پیپر بھی تھا تو اس نے ارادہ کیا تھا کہ آج کے دن نیند مکمل کرے گا۔

کپڑے بدل کر وہ بنا کھانا کھائے بستر پہ لیٹ چکا تھا۔آنکھیں بند کرتے ہی نینداس پر غالب آچکی تھی۔

کمرے میں دن سویر کا سماں چھایا ہوا تھا البتہ پردے دھوپ کی کرنوں کو کمرے میں داخل ہونے سے تھوڑا بہت روک رہے تھے۔

وہ آنکھیں پہ ہاتھ رکھے بے خبر سو رہا تھا۔ کمرے میں واحد شخص وہ ہی تھا۔ کمرے کا دروازہ ڈھکا ہوا تھا جس سے باہر کی روشنی ایک لکیر کی مانند کمرے میں جا رہی تھی۔

اس کے دروازے کے پاس کسی کے قدموں کی آہٹ سی ہوئی تھی۔ مگر وہ بالکل بے خبر تھا۔۔۔ہاں۔۔۔وہ ہمیشہ سے بے خبر تھا کہ سعد کے ساتھ اس گھر کا ایک مکیں "lust" میں مبتلا ہے۔ بے خبر، سب سے انجان۔

کمرے کا دروازہ دھیرے سے کھولا گیا تھا۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پھر پورا ہاتھ آہستہ آہستہ واضح ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کسی سانپ کی طرح دروازے پہ رینگ رہا تھا۔

اس ہاتھ نے ایک موبائل فون تھاما ہوا تھا۔ گہرے اندھیرے میں نہ اس کا ہاتھ بہت واضح تھا، نہ اس ہاتھ سے تھاما فون۔۔۔

اس ہاتھ کی ایک انگلی نے تین چار بار فون کو ٹیپ کیا تھا۔ کلک کی آواز کے بغیر چند تصویریں اس فون میں محفوظ ہوتی چلی گئی تھیں۔

سیڑھیوں پہ کھڑے دانیال نے عجیب تجسس بھری نگاہ سے اپنے بڑے بھائی کو یہ حرکت کرتے دیکھا تھا۔

وہ آخر کس چیز کی تصویر لے رہا تھا۔۔۔ وہ بھی اتنے چپکے چپکے۔

دانیال سر جھٹکتا واپس سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا تھا۔

مگر وہ واقعہ اس کے ذہن سے نہیں نکلا تھا۔

پیچھے بتیسی نکال کے مسکراتا ہوا ارحم اب بھی سعد کی تصویریں اتار رہا تھا۔۔۔

....

شب کے بادل چاند کو چھپائے ہر سو اندھیر کر چکے تھے۔ بارش کے امکانات بڑھتے جا رہے تھے۔ وقفے وقفے سے بادلوں پہ بجلیاں ایک قطار کی مانند چمک رہی تھیں۔

اس کا کمرہ گھپ اندھیر تھا۔دروازہ بھی ٹھیک سے بند تھا۔پردے پہ کھڑکیوں پہ گرے ہوئے تھے۔۔ مگر اس کی سامنے رکھا کمپیوٹر چمک رہا تھا۔اور ایسا چمک رہا تھا کہ اس کی چہرے کو بھی چمکا رہا تھا۔

ڈھیلی ڈھالی سی شرٹ، سر پہ جمائی پی کیپ اور آنکھیں بغور اسکرین کو دیکھ رہی تھیں۔ہاتھ برق رفتاری سے ٹائپنگ میں مصروف تھے۔کی بورڈ کی آواز وہ واحد آواز تھی جو کمرے کو گنجان بنانے سے روک رہی تھی۔

اس کے چہرے پہ سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔آنکھوں کی پتلیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔کام جاری تھا۔

اسے دس منٹ لگے تھے اس جگہ کو ایکس کرنے میں۔اس نے لنک کاپی کر کے ٹیلی گرام پہ پوسٹ کی تو اکثر فالوورز جو اس وقت آن لائن تھے، ساتھ ساتھ آتے گئے۔

اتنے عرصے بعد دوروس کی لائو آئی تھی۔سب پر جوش تھے۔شو کے شروع ہونے کا انتظار کرتے ہوئے۔میسج چیٹ پہلے ہی بھر چکا تھا۔کچھ لوگ اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے اور کچھ اپنی ہوس کا۔

دانیال کاؤنٹ ڈاؤن کو دیکھ رہا تھا۔دو منٹ میں دوروس لائو آنے والا تھا۔اتنے عرصے وہ کہاں گم رہا تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔۔

اسکرین یک دم سفید سے سرخ ہو گئی۔شو شروع ہو چکا تھا مگر ہر کوئی ایک دھچکے کے عالم میں تھا۔

لائو میں بیٹھا شخص وہ نہیں تھا جو اتنے عرصے سے اپنے اس شو میں آتا رہا تھا۔وہ کوئی اور تھا۔۔یہ کوئی اور دوروس تھا۔۔۔

پہلے کوئی جوکر ماسک کے ساتھ ایک مخصوص ہائے ہیلو کیا کرتا تھا مگر یہ شخص۔۔۔ یہ بالکل چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔اس نے گرے ہوڈی پہن رکھی تھی۔ہوڈی کا کور سر کا آدھا چہرہ چھپا رہا تھا اور بقیہ آدھا چہرہ سیاہ ماسک سے چھپا ہوا تھا۔

یہ کوئی "نیا" دوروس تھا۔کسی کو معلوم نہ تھا کہ پچھلے بندے کو کیا ہوا تھا اور یہ نیا بندہ کون تھا۔

اس نے اسکرین کی دوسری طرف نگاہ جمائی تو وہاں لوگوں کی چیٹ چل رہی تھی۔۔اسی وقت ایڈمن کا ایک پیغام اسکرین پہ جما یا تھا۔

”ویلکم دوروس۔دانیوون،داموَرڈیڈلیئرون۔“(دوروس کو خوش آمدید کہو،ایک نئے والے کو،جو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔)

شوشروع ہونے لگا تھا۔نیم بے ہوش باڈی کو اسکرین کے سامنے لا یا جا رہا تھا۔ لوگوں کی سجیشنز آنے لگی تھیں۔۔دانیال بھی بہت غور سے اسکرین دیکھ رہا تھا۔

اس کا پسندیدہ شخص واپس آگیا تھا۔وہ کیسے خوش نہ ہوتا۔

جہاں سب کو دھچکا لگا کہ یہ کون نیا دوروس ہے، وہاں صرف کرسی پہ بیٹھے دانیال کو دھچکا نہیں لگا تھا۔

کیونکہ وہی تو دوروس کا سپلائر تھا۔

....

یہ صبح سویرے کا وقت تھا جب سورج اپنی منزل پہ مکمل پہنچا بھی نہیں تھا۔ فاطمہ منزل میں خاموشی چھائی رہی تھی، چڑیوں کی آوازیں مدھم سی گھر کے حصار میں

گھوم رہی تھیں۔ نیم اندھر کمرے میں ارحم نیم دراز لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں دانیال سو رہا تھا اور سعد نیچے اسکول کی تیاریاں کر رہا تھا۔

آج گھر خالی تھا کیونکہ گھر کے بزرگ اور لڑکیاں خاندان میں کسی کے مایوں کے رت جگے پہ گئے ہوئے تھے۔ ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی اسی لیے گھر کے تمام مرد اس وقت گھر پہ حاضر تھے۔ دانیال اپنے کمرے میں بند تھا، ارحم اپنے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہا تھا اور سعد نیچے والی منزل میں صحن میں بیٹھے ناشتے میں مگن تھا۔

ارحم نیم دراز سا لیٹا ادھر ادھر چینلز بدل رہا تھا۔ کسی چیز کو دیکھنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا کہ اچانک ایک چینل پہ اس نے خود پہ روک لگائی۔۔

اس چینل پہ کوئی گانا چل رہا تھا۔جس کے سامنے دو کپل اپنا ڈانس کر رہے تھے۔

ارحم کی آنکھوں میں کچھ ابھرا تھا۔۔۔اس نے بہت کچھ اپنے اندر نگلا تھا۔۔دل میں گلٹی ابھر کے معدوم ہو رہی تھی۔۔اس میں اچانک مردانہ خواہشات کا جذبہ اجاگر ہو رہا تھا۔۔

ہاتھوں سے ریموٹ چھوٹ گیا تھا۔وہ خشک لبوں کو زبان لگا کہ ترکرتا جگ سے پانی نکال رہا تھا۔اچانک سے گلا بالکل خشک ہو گیا تھا۔

اس سے پہلے وہ کچھ کر گزرتا،وہ فوراً بیڈ سے اترا۔

"یہی وقت ہے ارحم،اس کی علاوہ کوئی صحیح وقت تم کو نہیں مل سکے گا۔۔۔جو تمہیں کہنا ہے،آج کہہ گزرو۔۔"وہ کمرے سے نکلتے بہت کچھ اپنے ذہن میں سوچ رہا تھا۔

سیڑھیاں ایک کے بعد ایک پھلانگتے وہ نیچے والی منزل پہ آیا تھا،صحن کی سامنے والی چارپائی پہ ہی وہ بیٹھا اسکول کے لیے تیاری کر رہا تھا۔

ارحم کے دل کو کچھ ہوا تھا۔کوئی جذبہ اندر جاگا تھا۔

"سعد۔۔فری ہو؟"اس نے بمشکل خود پہ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ارحم بھائی۔۔ کوئی کام تھا کیا؟" وہ فون بند کرتے ارحم کی طرف مخاطب ہوا۔

"ہاں یار وہ بس۔۔۔ایک کام کرو، تم میرے کمرے میں آنا ذرا، ایک کام ہے۔"

وہ کہہ کر رکا نہیں، بلکہ الٹے پاؤں واپس سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے ی پیچھے پیچھے سعد بھی ناسمجھی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

ارحم کمرے میں آتے ہی بے سکون سا ہوا تھا۔ اچانک ہی کمرے میں حبس کا احساس بڑھنے لگا تھا۔ اس نے شرٹ کے چار پانچ بٹن کھولے اور اپنا سینہ سہلانے لگا۔

"تم کر سکتے ہو، اس میں کوئی برائی نہیں، تم کر سکتے ہو۔۔"

جرمنی جانے سے پہلے اسے یہ کام کرنا تھا، ہر حال میں کرنا تھا۔۔وہ کمرے میں ٹہلتا اب بھی بے چین تھا کہ چند لمحوں بعد ہی کمرے میں وہ داخل ہوا۔

ٹی وی اب بھی مدھم آواز میں چلتا وہ گانا چلا رہا تھا۔۔کمرہ نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، بس ایک سفید بتی برائے نام اکمرہ روشن کر رہی تھی۔

ارحم اس کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

”جی۔۔کیا کام تھا آپ کو؟“ وہ نا سمجھی سے اسے دیکھتے رہا۔

اور ارحم کے جیسے سارے الفاظ، ساری ہمت ٹوٹ رہی تھی۔اسے اب بے چینی کا زیادہ احساس ہو رہا تھا۔ جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔من میں عجیب عجیب سی خواہشات ابھر رہی تھیں۔

اس نے چہرہ پھیر لیا۔پھر سر جھکانے لگا۔پھر گلے میں اٹکے لاکٹ کو گھمانے لگا۔

”دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے پیشانی مسلنے لگا۔

سعد کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا مگر بستر پہ براجمان ہو گیا۔

"تم نے کچھ غلط نہیں کیا ارحم، ایک خواہش ہی تو ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ تم غلط نہیں ہو۔۔ سعد تمہاری بات ضرور سمجھے گا، کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

وہ خود کو سمجھاتا، خود کو تسلی دیتا بات کرنے کی ہمت و حوصلہ مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یک دم ہی وہ پلٹا، ایسے کہ سعد تھوڑا سا ڈر گیا۔ وہ اس کی بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر ارحم نے سعد کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں لے لیا تھا۔

سعد بری طرح گھبرا گیا تھا۔اچانک ارحم کو ہوا کیا تھا؟

”سعد۔۔مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔پلیز میری بات مکمل اور تحمل سے سننا۔۔میں نے بہت ہمت کی ہے یہاں تک آنے کے لیے۔۔اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوگا۔۔“وہ کہتے ہوئے ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

سعد اس کو دیکھ کر تجسس میں چلا گیا تھا۔ایسی کیا بات تھی جو اسے سعد سے کرنا تھی؟

"بولیں بولیں۔۔میں سن رہا ہوں۔"اس نے ارحم کا ہاتھ تھپتھپاتے اور مضبوطی سے تھاما۔اسے لگا تھا ارحم نے اس کا ہاتھ سپورٹ کے لیے تھاما ہے۔

ارحم کے گلے میں گلٹی ابھر کے معدوم ہوئی تھی۔اس کی لفظ کوئی جملہ بنا رہے تھے۔۔۔اور وہ جملہ سب کچھ تباہ کرنے والا تھا۔ہر زندگی کو موت کر دینے والا نازیبا جملہ۔۔

"سعد۔۔۔میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

اور سعد کو ایسا لگا کہ اس نے غلط سنا ہے۔یہ جملہ درست ہی نہیں ہے۔۔

"مجھے تم سے بہت لگاؤ ہے سعد۔۔میں تمہیں۔۔میں تمہیں اپنے ساتھ جرمنی لے کر جانا چاہتا ہوں۔۔تم مجھے۔۔۔بہت بہت پسند ہو سعد۔"

اور اب کے ارحم نے اپنی بات کی تصدیق کر دی تھی۔جو اس نے بولا تھا وہ واقعی اس نے وہی بولا تھا جو اس نے بولا تھا۔سعد کا اندر باہر سن ہو چلا تھا۔اس کے پاؤں، اس کا ہاتھ۔۔سب کچھ بے جان ہو رہا تھا۔۔اسے اچانک ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔۔اس یہ سب ایک گھناؤنے مذاق کے علاوہ کچھ نہیں لگ رہا تھا۔

"میں کیا کروں۔۔میں نے خود کو بہت روکا مگر یہ دل نہیں مان رہا ہے سعد۔۔یہ دل تمہارا ہو کے رہنا چاہتا ہے۔۔میری بات کو سمجھو۔۔میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔۔۔پاکستان میں تو یہ ممکن نہیں مگر ہم جرمنی جا کر خوشی خوشی رہ سکتے

ہیں۔۔پلیز سعد۔۔" ارحم کا گلا رندھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔وہ اس کا ہاتھ معافی کے انداز میں تھام چکا تھا۔

سعد کو ہر ایک لمحہ، ہر ایک پل اب وہاں بیٹھنا دشوار لگ رہا تھا۔۔

"میں۔" اس نے بولنے کی کوشش کی تھی، مگر گلا بندھ گیا۔وہ بولتا بھی تو کیا بولتا۔

اس کی آنکھوں میں پہلے ناسمجھی تھی، پھر ان میں شاک اور بے یقینی کا بسیرا ہوا تھا۔ اور اب ان آنکھوں میں غم و غصہ شامل ہوا تھا۔

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ ارحم کے ہاتھ سے الگ کیا تھا۔بستر سے قدم اٹھائے تھے تو وجود چکرایا تھا۔اس نے گالی دینے کے لیے، کچھ بولنے کے لیے لب کھولے تھے مگر الفاظ ہی گم گئے تھے۔۔پورا وجود ارحم سے خوف کھا رہا تھا۔اسے بس وہاں سے بھاگنا تھا۔اس کمرے سے نکل جانا تھا۔

وہ فوراً ہی پلٹتے ہوئے دروازہ کھول رہا تھا کہ اسے اپنے بازو پہ کسی کی سخت سی گرفت محسوس ہوئی۔

"میری بات تو سنو۔۔۔"اس سے پہلے ارحم کچھ اور کہتا، سعد کا ہاتھ گھومتے ہوئے اسے گال پہ آکے جڑ گیا تھا۔ایک تھپڑ کی آواز نے کمرے میں ہر ایک چیز کی آواز کو ساکن کر دیا تھا۔ارحم نے سعد کا بازو چھوڑا تھا۔بے یقینی سے وہ گال پہ ہاتھ رکھے سعد کو دیکھ رہا تھا۔

سعد کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، ان میں نمی بھی تیر رہی تھی۔۔

"آپ میرے۔۔ سب سے فیورٹ کزن تھے۔۔" اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ وہ کچھ اور کہے بنا کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ کہ کسی نے اسے بہت زور سے کمرے کے اندر جھٹکا تھا۔

وہ دور بستر پہ پھینکا گیا تھا۔ توازن کھوتے ہوئے وہ زمین پہ گر گیا۔ ارحم نے دروازہ ایک لمحے میں لاک کیا تھا اور دوسرے لمحے میں وہ زمین پر پڑے سعد کے وجود کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں میں غضب ناک غصہ تھا۔سعد کا وجود بلکل پیرالائز ہوتا جارہا تھا۔

ارحم نے دونوں ہاتھوں سے شرٹ کے تمام بٹن کھولتے شرٹ کو خود سے جدا کیا تھا کہ یہ حرکت دیکھے سعد نے چلانے کی آواز نکالنے کی کوشش کی تو ارحم نے اس کی منہ میں اپنی شرٹ ٹھونس دی۔وہ اس کی دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے قفس بند کر چکا تھا۔

"جو مجھے چاہئے، وہ میں لیکر رہوں گا۔ایسا ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔" وہ گمبھیر آواز میں کہتا پینٹ کا بکل کھول رہا تھا کہ سعد نے اس کی ہاتھ کو دانتوں تلے دبایا۔اس نے اتنی بے دردی سے کاٹا تھا کہ ارحم کا ہاتھ خون خون ہوا تھا۔اس نے ایک جھٹکے سے ہی ہاتھ ہٹایا تھا کہ سعد نے پل میں اس کی ٹانگوں کے بیچ لات ماری تھی۔

وہ کراہتے ہوئے اس کی اوپر سے ہٹا تھا۔

سعد کو خود نہیں پتا تھا اس میں یہ ہمت کہاں سے آ رہی تھی، مگر شاید یہ خوف تھا۔ شاید ڈر تھا۔

وہ کانپتے وجود کے ساتھ، منہ سے اس کی ٹی شرٹ نکالتے اٹھ کے دروازے کی طرف بھاگا تھا، ساتھ منہ کھول کہ وہ جتنا زور سے چلا سکتا تھا، وہ چلایا۔

دروازے کا ناب کھولتے اسے ارحم نے ایک بار پھر پکڑا تھا، اس کی گرفت سے سعد کے یونیوفارم کا مونوگرام ایک جگہ سے پھٹ گیا تھی مگر اب کی بار سعد کے ساتھ ایک پھول کا گلدان لگا تھا جو اس نے پوری شدت کے ساتھ ارحم کے سر پہ پھوڑ دیا تھا۔ وہ توازن کھوتے ہوئے گرا تھا۔ ساتھ ہی سعد اس کی گرفت سے آزاد ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو در آئے تھے۔ منظر دھندلا ہو گیا تھا۔ مگر اس کے ہاتھوں نے گرتے پڑتے دروازہ کھولا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے راہداری کی طرف بھاگا تھا کہ اسے وہ دانیال دکھا۔

"کیا ہوا سعد؟ مجھے تمہارے چیخنے کی آواز آئی تھی۔۔ سب خیریت تو ہے ناں؟" وہ گھبراتے ہوئے اسے پوچھ رہا تھا اور سعد اس کی ہاتھوں سے زمین پہ گرتا جا رہا تھا۔

"تمہارے بھائی نے۔۔۔" اس کی الفاظ آنسوؤں کی زنجیر کے وجہ سے ٹوٹ گئے تھے۔ وہ فوراً ہی نیچے کی طرف بھاگا تھا۔

دانیال نا سمجھی کے عالم میں ارحم کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔اس نے بند دروازے کا ہینڈل گھمایا مگر دروازہ بالکل لاکڈ تھا۔اس نے دروازے پہ دستک دی۔

"بھائی۔۔؟بھائی کیا آپ اندر ہیں؟"اس کی لہجے میں پریشانی کا عنصر شامل تھا۔

جواب ندارد تھا۔اس نے ایک اور بار دستک دی،دانیال کا دل ڈوب رہا تھا۔ایسا کیا ہوا تھا جو سعد ایسے روتے ہوئے اس کی کمرے سے نکلا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اسی وقت دروازہ کھلا تھا۔اور کسی نے اس کی وجود کو یک دم اندر کے جانب کھینچا تھا۔

....

وہ بھاگتے بھاگتے اپنے کمرے میں آیا تھا۔اس نے بیگ اٹھایا تھا،اپنے بیگ میں فون کو تقریباً پھینکا اور کمرے سے باہر نکلا۔

وہ اپنے ماں باپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی الماری کی طرف بڑھا تھا۔اس کا دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔مگر اسے خود سمجھ سے باہر تھا وہ کیا کرنے جا رہا ہے؟

اس نے الماری ہے دونوں پٹ کھولے تھے، گلدان سے سیف کی چابی نکالی اور سیف کھولتے اسے دو تین شاپر نظر آئے۔اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئی تھیں۔ مگر خود پہ ضبط پاتے اس نے دو تھیلیوں کو اٹھا کر سیف کو صحیح سے بند کیا تھا۔

ابھی اسے کمزور نہیں پڑنا تھا۔ابھی اسے اس بارے میں نہیں سوچنا تھا جو چند منٹ پہلے ہوا تھا۔ابھی اسے فرار کا راستہ ڈھونڈنا تھا۔

وہ جلدی جلدی بغیر جرابوں کے جوتے پہنے فریج کی طرف بڑھا تھا۔فریج کے دورازے پہ ایک نوٹ چسپاں تھا۔

"لنچ بالکل نہیں بھولنا، میں نے بہت محنت سے ڈونٹس بنائے ہیں۔"

اور وہ نوٹ پڑھتے سعد کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کے گرا تھا۔

یہ وہ آخری لنچ تھا جو وہ سارہ کے ہاتھوں سے کھانے والا تھا۔

اس نے فریج کھولا اور ڈبہ بیگ میں رکھتے وہ فاطمہ منزل سے باہر نکلا تھا۔اور اس نے مڑ کے ایک نظر بھی اس گھر کو نہیں دیکھا تھا۔

....

دانیال کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے ارحم کے منہ سے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔۔ ویسے ویسے اس کا پورا جسم ساکن ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے ابھی اپنا بھائی بھائی نہیں، بالکل کوئی حیوان لگ رہا تھا۔

ارحم کے لب تھک گئے زبان کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔اور رہا ہی کیا تھا بولنے کے لیے۔۔۔

"تم میری مدد کرو گے ناں دانیال؟اس سب کو چھپانے میں۔۔۔میں جانتا ہوں تم میرا یہ کام کرو گے۔" وہ مدھم سا مسکراتے ہوئے دانیال سے کہہ رہا تھا۔

اور دانیال جواب تک ساکت سا اس سے تھوڑا فاصلے پہ بیٹھا تھا، اٹھ کے آیا اور ہاتھ کا مکا بناتے ارحم کے جبڑوں پہ دے مارا۔ وہ کراہتے ہوئے پیچھے کو ہوا تھا۔

"واٹ دا ہیل !" وہ دانیال کو گالی دیتے جبڑہ تھامے ہوئے تھا۔

"مجھے شرم آتی ہے۔۔۔ تمہیں اپنا بھائی کہتے ہوئے۔۔یعنی کہ لاہور میں جو تم پہ الزام لگے تھے۔۔۔۔وہ۔۔سارے سچ تھے۔۔؟" وہ بے یقینی سے دو قدم پیچھے ہوا تھا۔

"اپنے دوروس کو بولو میرا کام کرے۔۔"اس کی بات کہ دانیال ٹھٹکا نہیں تھا۔ اسے پتا تھا کہ ارحم جانتا ہے وہ ڈارک ویپ کا سپلائر ہونے کی حیثیت سے پیسے کماتا

ہے۔وہ اسے دھمکا رہا تھا۔اس کا بھائی ایک پل میں ہی اتنے اونچے مقام سے کسی عزازیل کی طرح نیچے گرتا چلا گیا تھا۔

''تم اپنے حواس میں بھی ہو؟تم سمجھ بھی رہے ہو تم بول کیا رہے ہو؟ تمہیں ہو کیا گیا ہے ارحم؟تم سعد کو قتل کروانا چاہتے ہو۔۔آر یو میڈ؟تم۔۔۔تم کیا ہو؟''

اب کے دانیال کو بھی اس سے خوف آ رہا تھا۔۔وہ کیا تھا،وہ کیسی باتیں کر رہا تھا؟ اس کا بھائی ایسا تو نہ تھا۔۔یہ کون تھا۔۔اسے کیا ہو گیا تھا؟

''تو تم۔۔سیدھی طرح نہیں مانو گے؟''ارحم کے آواز پل میں گہری ہوئی تھی۔ دانیال کو اس سے بے اختیار خوف آیا تھا۔وہ دروازہ کھولنے بڑھا ہی تھا کہ ریوالور کے لوڈ ہونے پر اس کا پورا جسم مجسمہ بن گیا۔

''کیا سعد تمہیں اتنا پیارا ہے کہ تم اس کی لیے اپنی جان دے دو؟''ارحم بستر پہ چھوٹی سی پستول رکھے، طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

دانیال کا پورا جسم سن ہوتا چلا گیا۔

....

وہ اسکول کے سامنے آکر رکا تو اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے خود کی حالت درست کی تھی۔ شرٹ کو ٹک ان کرتے، بالوں کو سیٹ کرتے، ٹائی کو درست کرتے وہ قدرے بہتر حالت میں اسکول میں داخل ہوا تھا۔

سب سے پہلے اسے دو کام کرنے تھے۔اپنے واحد دوست کو سب کچھ سچ بتانا تھا اور دانیال سے مدد لینی تھی۔

وہ سارہ کو سب نہیں بتا سکتا تھا، وہ پینِک کر جاتی تھی۔دانیال سمجھدار تھا۔وہ اس کی بات کو سمجھ سکتا تھا۔وہ حقیقت کو مان سکتا تھا۔

اسے دانیال کو کال کر کے مدد لینی تھی۔اسکول کی گھنٹی بجی تو سب گراؤنڈ میں اسمبلی کے لیے داخل ہو گئے تھے۔

ہم سب نے بچپن میں سوچا ہوتا تھا کہ ہم گھر سے بھاگ جائیں گے۔ مگر ہم کبھی ایسا کر نہیں پاتے تھے۔ کیونکہ شاید ہمیں پتا تھا کہ ہمارے گھر میں کوئی تو ہوگا ہماری پرواہ کرنے والا۔

مگر کچھ سعد جیسے بچے اپنے گھروں سے ہر روز کتنی ہی تعداد میں فرار ہو جاتے ہوں گے، اتنی ہی آسانی سے۔

گھر سے کوئی فرار ہو جائے تو گھر والے کتنی آسانی سے الزام گھر سے فرار ہونے والے پہ ڈال دیتے ہیں نا۔ وہ اس بات پہ دھیان ہی نہیں دے پاتے کہ کبھی کبھی۔۔۔ گھر سے فرار ہونے کی وجہ گھر کے باہر والا نہیں، گھر کے اندر والا بھی ہوتا ہے۔

....

(لاہور، حال)

وہیل چیئر پہ بیٹھے اس کا پورا وجود نمکین پانی کی طرح ہواوں میں گرتا جارہا تھا، گھلتا جارہا تھا۔ آنکھوں سے بہتا نمکین پانی اس کی پہلو میں درد کا دریا تعمیر کر رہا تھا۔

وہ سسکیوں کو ہاتھوں کی ہتھیلی سے دباتے زاروقطار رو رہی تھی۔ ہچکیاں، سانسیں، آنسو، آوازیں۔۔۔سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

مگر اس کی پہلو میں بیٹھے اس وجود نے ایک آنسو بھی شاید نہیں بہایا تھا۔اس کی آنکھیں سنسان تھیں، ویران تھیں، بنجر خواب اور مٹی مٹی ہوتی یادیں۔

اس کا تو پورا وجود ہی ان سالوں میں قبرستان کی اکیلی قبر جیسا بن گیا تھا۔وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے مگر ہمت جواب دے گئی تھی۔وہ اور کیا کہتا، اور کتنا کہتا؟

اس کی زندگی کی حفاظت ہو گئی تھی، مگر اس کی زندگی تباہ بھی تو ہو گئی تھی۔۔ہاتھ پہلو میں رکھے وہ بالکل ساکت سا دیوار تک رہا تھا۔اسے سارہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، مگر اسے فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

"مجھے لگا تھا وہ مجھے پولیس اسٹیشن لے کر جا رہا ہے۔۔۔مگر۔۔۔"

اس نے واپس بولنا شروع کر دیا تھا۔ کہانی کو ختم کرنا تھا۔ یادوں کو مٹانے کی کوشش۔۔

....

ٹھنڈی ہواؤں نے زور پکڑ لیا تھا مگر دل کی اداسی کا انسان کیا کرے؟

اس خوشگواری موسم میں اس کی دکھی سسکیاں خلل پیدا کر رہی تھیں۔ آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں مگر نہ لبوں کی تھرتھراہٹ کم ہو رہی تھی، نہ دل ہلکا ہو رہا تھا۔

دکھ،درد،پچھتاوا،احساس، غلطی،بے حسی۔۔

سب نے ایک ساتھ ایرج پہ آ کر حملہ کیا تھا۔آنکھوں سے بہتا پانی کسی بھی چیز کا مداوا نہیں کر سکتا تھا۔

آدھی کپ چائے اب بھی ویسے ہی ٹیبل پہ پڑی رہ گئی تھی۔بسکٹس بھی اکا دکا کے علاوہ ویسے ہی سیٹ پڑے تھے۔

سوچ بسکٹس اور چائے سے بہت دور،بہت اندھیرے میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ ماضی کے کسی اندھیرے میں۔ماضی کی کسی یاد میں۔

اس کی سامنے بیٹھا ارمغان بے حس و حرکت اسی کو دیکھ رہا تھا، بغیر کسی تاثر کے، بغیر کسی تعجب کے۔

اس کی آنکھوں میں کچھ نہیں تھا، اس کا دل بھی ہر جذبات سے عاری تھا۔ وہ ہار رہا تھا، وہ ہارتا ہی تو آیا تھا۔

اسے سعد کی پرواہ نہیں تھی، اسے سارہ کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ اب تو اسے نہ ارحم کی پرواہ رہی تھی اور نہ ہی خود کی۔

اس کا دل کیا تھا تو صرف یہ کہ وہ واقعی ایرج کو لے کر کہیں دور لے جائے، ہر نقصان سے پرے، کسی محفوظ خول میں۔ کسی ایسی جگہ جہاں وہ تا قیامت ایک ہو کر رہیں۔

مگر اس کی سامنے موت تھی، جس کا باب بہت جلد اس کی کیے کھل جانے والا تھا۔

ساری زندگی جس نے موت کی دعا کی تھی، اب اس کی سامنے آ کھڑی تھی تو وہ زندگی میں پہلی بار موت سے خوف کھا رہا تھا۔ اس کے دل نے مہلت مانگی تھی۔ وہ پہلی بار مرنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔

لوگ کہہ تو دیتے ہیں کہ وہ موت سے نہیں ڈرتے، مگر موت کا کانٹا جب پل پل کی سانسوں کو لمحوں میں وقفے وقفے سے کھینچتا ہے ناں۔۔ تب بہت ڈر لگتا ہے انسان کو۔ بہت زیادہ۔۔۔

محبت اس نے کی تھی، ایرج نے تو کبھی اسے قبول بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے ہمدردی کر گئی تھی مگر اس نے اپنے آپ کو اس کی "ہمدردی" کے لیے تو قربان

نہیں کیا تھا۔۔وہ تو مر جانے والا عشق کرتا تھا اس سے۔ مگر اسے اندازہ ہوا تھا کہ اتنی تکلیفوں کے بعد بھی، کوئی نہیں ہو گا اس کی موت پہ رونے والا۔ایرج بھی نہیں۔

محبت کے بدلے میں محبت نہ بھی ملے تو انسان مووآن کر جاتا ہے، مگر محبت کے بدلے میں ملنے والی دوستی اور ہمدردی حد سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔

وہ چاہتا تو دنیا کو آگ لگا دیتا اس کی لیے۔ مگر ایرج کو دنیا کی ''زندگی'' بہت پسند تھی۔وہ کیوں اپنی ''زندگی'' کو چھوڑ کر ایک ''موت'' کے ساتھ اپنی ''زندگی'' کو ''موت'' بنا دیتی؟

وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آیا تو اس کی نظر سب سے پہلے اپنے درمیان حائل میز پہ پڑی۔ ایرج کا ہاتھ میز کے بیچوں بیچ ہتھیلی کھولے اس کی سامنے پڑا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر ایرج کو دیکھا۔ وہ گونگی سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

ارمغان نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ میز تک رکھا تھا۔ اس کا دل کرچی کرچی ہوا۔ اس نے انگلیوں کو حرکت دے کر ہاتھ اس تک پہنچایا۔

ان دونوں کے ہاتھوں کا لمس ایک دوسرے کے دلوں کے سنگم میں ڈھل گیا تھا۔ ارمغان نے ایرج کا ہاتھ نرمی مگر گرفتگی سے تھاما تھا۔

اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا تھا۔

”اسے لگا تھا میں اسے پولیس اسٹیشن لے کر جا رہا ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔“

اس نے وہیں سے سلسلہ باندھا جہاں سے چھوڑا تھا۔

ایک آخری بار ماضی کی یاد کو یاد کرتے ہر چیز سے باخبر ہو جانے کی باری آ گئی تھی۔

اب کوئی بھی نہیں ہو گا جو بے خبر رہے گا۔ جس کو خبر نہ ہو گی۔

●●●●●●●●●●●●

(ماضی)

وہ دونوں گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔گاڑی منزل کی طرف گامزن تھی اور منزل لا پتہ!

زندگی میں اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ایسا انتہائی قدم اٹھائے گا۔زندگی پل میں کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔

اسے لگا تھا ارمغان اسے پولیس اسٹیشن لے کر جارہا ہے مگر وہ اسے بے ہوشی کی دوائی دے کر سلا چکا تھا۔البتہ وہ نیم نشے میں اب بھی جاگا ہوا تھا۔بس کسی کام کو کرنے کی یا مدد کی پکار کے لیے کوشش کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔اسے نہیں پتا تھا وہ اب کہاں جارہا ہے۔کیا وہ اغوا ہو گیا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا۔اس کے اندر ڈر نے

اور خوف کھانے کی بھی طاقت نہیں تھی۔سب اللہ کے حوالے کر کے وہ شکستہ حالت میں گاڑی کی بیک سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے ارمغان کو اپنی تمام کہانی سنا دی تھی۔اور اس کی بعد ارمغان نے اسے نیند کی دوا والا پانی پلا دیا تھا۔

وہ اس کی ساتھ کیا کرنے جا رہا تھا؟ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا۔

•••••••••••

"تم بہت بڑا رسک میرے سر اور اپنے سر ڈال رہے ہو دوروس۔ میں نے اس کام کی اجازت بالکل نہیں دی تھی تمہیں۔" ایلیٹ کے چہرے پہ پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں، باس؟ میں ایک اپنے ہی عمر کے بچے کو وہ سب جھیلنے کے لیے اکیلا چھوڑ دوں جو میں نے جھیلا تھا؟" ارمغان بھی اپنی بات پہ ڈٹا رہا۔

"میں نے کہا تھا دل سے کام مت لینا۔ میں نے تمہیں اجازت صرف اس حد تک دی تھی کہ تم اپنے ظالموں سے بدلہ اپنے آپ لے سکو۔ تمہاری یہ ٹریننگ ہے۔ اور تم الٹا لوگوں کو ریسکیو کر رہے ہو؟" ایلیٹ کے لہجے میں غصہ در آیا تھا۔

''آپ نے بھی تو بچایا تھا ناں مجھے۔۔؟ کیوں بچایا تھا۔۔رہنے دیتے وہیں۔۔''وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''وہ معاملہ الگ تھا، یہ معاملہ الگ ہے۔''

''یہ معاملہ بھی وہی ہے۔۔پہلے میں، پھر یہ چھوٹا سعد۔۔اس کی بعد نجانے کتنے اور لوگ۔۔مجھے ارحم کو مارنے میں وقت لگے گا' باس۔۔تب تک کے لیے۔۔بس تھوڑے عرصے کے لیے سعد کو اپنے پاس محفوظ رکھ لیں۔۔پلیز۔''اس کا لہجہ ٹوٹا تھا۔ایلیٹ الگ کشمکش میں الجھا ہوا تھا۔

''یہ کس مشکل میں ڈال رہے ہو ہم سب کو تم دوروس۔۔۔''اس نے کچھ سوچتے ہوئے سنہرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”آپ تو سب کر سکتے ہیں۔۔! بس یہ آخری بات مان لیں۔۔ پلیز۔۔“ وہ اس سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے دو سال کا بچہ اپنے باپ سے۔

ہاں۔۔۔ وہ اس کا باپ ہی تو تھا۔ وہ اس کا سگا باپ نہ سہی مگر اس نے ارمغان کو سگے باپ سے بڑھ کر پالا تھا۔ ایک جرائم کی دنیا میں ایلیٹ ارمغان کے لیے روشنی کے ننھے پھول جیسے تھا۔ ایلیٹ ارمغان کے ساتھ ہمیشہ الگ برتاؤ کرتا تھا۔ اسے ارمغان میں اپنے بیٹے کی جھلک نظر آتی تھی۔۔ اس کا بیٹا جو۔۔۔ بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔

ارمغان بالکل اس جیسا تھا۔ عکس بہ عکس۔ ایلیٹ کے لیے وہ ایک انمول سا تحفہ تھا۔

ایلیٹ اور ارمغان کا رشتہ اس بات کی گواہی تھا کہ کبھی کبھار غلط کاموں میں ملوث شخص غلط نہیں ہوتا۔

''ٹھیک ہے، جب فلائٹ کروا دو تو ٹیکسٹ کر دینا۔'' انہوں نے کافی منٹ تک سوچ کر اس کی بات بالآخر مان لی تھی۔

''آئی لو یو! تھینک یو سو مچ!'' ارمغان کے لہجے میں سکون در آیا تھا، اس نے ایک لمبی سانس خارج کی۔

''مگر یاد رکھو یہ آخری بات ہے جو میں تمہاری مان رہا ہوں۔۔واپس گھر آجاؤ، دوروس۔۔مجھے تمہارا بہت انتظار ہے چیمپئین۔''وہ مدھم سا مسکرائے۔

ارمغان بھی دوسری طرف مسکرایا تھا۔زخمی سا۔

کبھی کبھی انسان کو وہاں سے امید کی کرن مل جاتی ہے جہاں سب کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی انجان اتنے اپنے ہو جاتے ہیں کہ خون کا رشتہ معنی نہیں رکھتا۔ جب خیر کا کوئی راستہ نہ بچے تو خطرہ مول لینا چاہیے، کیونکہ کبھی کبھی ہر خطرہ زخم نہیں دیتا۔

●●●●●●●●●●●

وہ سب کچھ ایک فلم کی طرح سرانجام دیا گیا تھا۔پل میں سعد کا جعلی پاسپورٹ بنا تھا،پل میں وہ لاہور کے ائیرپورٹ پہ کھڑے جہاز میں سوار ہو کر بینکاک کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔

ارمغان ائیرپورٹ پہ بیٹھا آگے کا حل سوچ رہا تھا۔کیسے کس چیز کو بڑھانا ہے۔۔ کیسے کیا چیز کرنی ہے۔

اس نے دانیال سے کانٹیکٹ ختم کر دیا تھا۔وہ خود کو اور اس کو کسی بھی خطرے سے بچانا چاہتا تھا۔اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سعد جہاں بھی جا رہا ہے،اسے وہاں جتنی بھی مشکلات جھیلنی پڑیں گی،وہ محفوظ ضرور ہو گا۔

اسے واپس کراچی جانا تھا۔ ابھی بہت کچھ تھا جو اسے سرانجام دینا تھا۔ ایگل فٹبال کلب میں داخلہ لیتے ہوئے اس کے چہرے پہ ایک اداس سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی خواب تو بہت دور کہیں کھو گئے تھے۔

اس نے ساتھ ساتھ ایک ڈرگ مارٹ میں جاب بھی تلاش کرلی تھی۔ اسے کراچی میں رینٹ پہ ایک اپارٹمنٹ مل چکا تھا جہاں وہ اور ایک اس کا پالتو جانور رہتا تھا۔

اسے اس اسٹور میں کام کرتے ایک ورکر پہ نظر رکھنی تھی۔ اسے اپنا ایک اور ریپسٹ مل چکا تھا۔

....

ایک عرصے بعد اس نے ریڈ روم پہ اپنے ریپیسٹ کو قتل کر دیا تھا۔

وہ ایک عورت کی لاش تھی۔اس کی آنکھوں میں سیاہ چشمے اب بھی ویسے ہی دھنسے ہوئے تھے اور چہرے کے کٹے حصے سے بدبو اٹھ رہی تھی۔

کس نے کہا تھا ریپیسٹ صرف مرد ہوتے ہیں؟

وہ کمرے سے باہر جا رہا تھا تو اس کی نظر سارہ کے آئی ڈی کارڈ پہ پڑی۔وہ اسے بھی بہت جلد بینکاک بھیجنے والا تھا۔سعد کے پاس۔ایک محفوظ جگہ پہ۔

اس کا آئی ڈی کارڈ دیکھتے اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔فون سے اس کی تصویر لیتے اس نے دوسرے فون سے فاطمہ منزل کے ایک فرد کا نمبر ملایا اور اس نمبر پہ وہ پکچر سینڈ کر دی۔

اسے ارحم کو پریشان کرنا تھا۔وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ارحم محبت اور بھائی چارے کا کتنی حد تک ماسک پہن سکتا ہے۔

....

واصف نے اپنے بھائی کو بے دردی سے قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔اس کا جسم ٹوٹ ٹوٹ کر زمین بوس ہونے لگا تھا۔ایک وحشت سی اس کے پورے بدن کو قید کر چکی تھی۔

اس نے ہلنے کے لیے قدم ہلائے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔اس نے چیخنے کے لیے لب کھولے مگر کوئی آواز باہر نہ نکلی۔

وہ بے جان سا کھڑا اپھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ارمغان اس کے بھائی کو بے دردی سے چاقو مار مار کے قتل کر چکا تھا۔ہر سانس کو اس کی جسم سے نکال چکا تھا۔

وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا جب دوروس کی نظر اس پہ پڑی۔دوروس کا پورا منہ سرخ خون سے لدا ہوا تھا۔ہاتھ بھی خون سے نہائے ہوئے تھے۔پورا جسم خون کی رنگولی میں گم گیا تھا۔

دوروس اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا تبھی نجانے اس کی قدموں میں کہاں سے جان آئی تھی۔شاید یہ قدرتی طور پہ ریفلیکس ایکشن تھا۔

اس کی قدم خود بخود اسٹور سے باہر نکلے تھے۔اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے بس اپنی جان بچانی تھی۔

دوروس اسٹور سے باہر تک نہیں نکلا تھا۔ابھی اس کی لیے زیادہ اہم کام شاہد کی لاش ٹھکانے لگانا تھی۔وہ واپس اسٹور کو لاک کرتے مڑ گیا۔اسے کوئی ڈسٹر بینس نہیں چاہیے تھی۔

....

واصف گھر نہیں گیا تھا۔ شاید بھوکلاہٹ میں وہ کسی الگ راستے پہ آچکا تھا۔اس نے قریب ہی بنے فون بوتھ کے اندر خود پہ قابو پاتے ریسیور اٹھا کر ون فائو کو کال ملائی تھی۔

پہلی ہی گھنٹی پر کال اٹھالی گئی۔

"ایس پی حیدر بات کر رہا ہوں، بتایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

واصف کے چہرے پہ پسینے کی بوندیں اور خوف کی وحشت نمایاں تھیں۔

....

جب تک پولیس اس اسٹور تک پہنچی تھی، تب تک ہر طرف کا صفایا ہو چکا تھا۔ کوئی ایک داغ، ایک سراغ نہیں ملا تھا حیدر کو اس قاتل کے نام پر۔ حیدر نے اب تک اس قاتل کا نام نہیں پوچھا تھا۔ اتنی افراتفری میں سب ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

جب ان کے ہاتھ کچھ نہ لگا تو حیدر واصف کو ایک الگ کونے میں لے گیا۔

''کیا نام تھا اس کا جس نے تمہارے بھائی کو قتل کیا۔ کیسا لباس تھا اس کا؟'' نیلی آنکھوں میں سوال تیر رہا تھا۔

واصف یاد کر کر کے اس کا حلیہ بتانے لگا۔جو جو اسے یاد آتا جا رہا تھا۔سفید شرٹ، ٹراوزر۔پی کیپ۔۔اس نے سب بتایا۔

"نام جانتے ہو اس کا۔۔نام کیا تھا اس کا؟" حیدر کے ذہن میں کلک نہیں ہو رہا تھا کوئی۔

"ارمغان۔۔ارمغان مطاہر علی۔" واصف نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔اور حیدر اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔۔۔

"اور۔۔۔اور تمہارے۔۔بھائی کا نام کیا تھا؟"

"شاہد۔۔"

حیدر کا تمام وجود جہاں تھا، وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ذہن میں ایک ساتھ سب کچھ کلک ہوا تھا۔ پرانی یادیں واپس روپ دھارے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

(بینکاک، ماضی)

وہ دونوں گل مہر کے پیڑ کے نیچے بیٹھے اپنا لنچ کھا رہے تھے۔ اس جگہ پر کوئی آبادی نہ تھی۔ ہر طرف سبزہ تھا اور چمگادڑوں کی آوازیں شور پھیلا رہی تھیں۔

”تمہیں ان سب کو قتل کرنا ہے؟“ نیلی آنکھوں والے لڑکے نے آنکھیں بڑی بڑی کر کے دیکھا۔

”ہر ایک کو۔“ برابر میں بیٹھے ارمغان نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

”تمہیں وہ سب یاد ہیں۔۔؟“ نیلی آنکھوں والے لڑکے نے پھر سوال کیا۔

”نقش نقش حفظ ہیں۔“ ارمغان کے اندر کا خون کھول اٹھا تھا۔

”نام پتا۔۔۔سب معلوم ہے۔۔؟“ لڑکے کو اس کی دلیری اور چال بازی پہ حیرانی ہوئی تھی۔

"شفیق، نکو، جلیل، شاہد، راشد اور۔۔۔ارحم"۔

ارمغان نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

خون کی پیاس صدیوں تک ان آنکھوں میں جلتی رہنے والی تھی۔وہ جانتا تھا۔

(حال)

وہ واصف سے دور کھڑے اپنے ساتھی پولیس آفیسر کے پاس آیا۔

”ایف آئی آر نہ کاٹنا، کیس کو بند کر دو۔“ وہ کہہ کر پلٹ گیا۔

پیچھے کھڑا حوالدار اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔۔یہ کیسا آرڈر دے گئے تھے سر؟

”پر سر ہم یہ کیسے کر سکتے۔۔“

”جاو پھر اکیلے اپنا سر گرم کرو، خوار ہو۔اس کیس کو کھولو گے، خوار ہو گے۔کچھ نہیں ملے گا۔اسی لیے کہہ رہا ہوں لاش کو ڈھونڈ کر جنازہ پڑھاؤ، قاتل کو مت ڈھونڈو۔“ حیدر نے پلٹ کر سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

سر اتنے یقین سے کہہ کر گئے تھے تو کوئی تو بات ہو گی، حوالدار نے سوچا۔اسے تو چھٹی چاہیے تھی اور حرام کا پیسا توڑنا تھا۔سو مسکراتے ہوئے باقی ساتھیوں کو کیس سے ہاتھ اٹھانے کا آرڈر دینے مڑ گیا۔

....

اس واقعے کو ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا مگر حیدر کی سوئی اٹکی،ایک ہی نقطے کے گرد طواف کر رہی تھی۔

اسے ارمغان سے جلد رابطے میں آنا تھا،اسے اپنے دوست سے ملنا تھا۔اسے ارمغان کو خبر دار کرنا تھا۔وہ اپنی زندگی کورسک کے ساتھ جی رہا تھا۔اسے ارمغان کو سب بتانا تھا۔کیا وہ اسے یاد بھی ہو گا۔۔؟

سیٹ سے پشت ٹکائے وہ کار ڈرائو کر رہا تھا کہ ٹھٹک کر اسے گاڑی روکنی پڑی تھی۔

سنسان سڑک کے کنارے ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے تقریباً بھاگا تھا۔

اس لڑکی تک پہنچتے اس نے اس کا منہ اپنی طرف کیا۔پھر چہرہ تھپتھپایا۔پھر سانسوں کو چیک کیا۔وہ زندہ تھی۔چہرے پہ کوئی گہرا گھاؤ نہیں تھا البتہ چھوٹی سی خراش سے خون رس رہا تھا۔

حیدر پاکٹ سے فون نکالنے والا تھا کہ ارادہ ترک کر دیا۔اسے خود کچھ کرنا تھا۔

جلدی۔

جھجکتے ہوئے اس نے اس بے ہوش لڑکی کو گود میں اٹھایا اور گاڑی میں بٹھاتے

ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

....

رات بھر وہ ہسپتال میں رہا تھا۔اس کے چہرے پہ چھوٹی چھوٹی پٹیاں بندھی ہوئی

تھیں۔کلائی سے کنولا جڑا ہوا تھا۔وہ اب تک بے ہوش تھی۔

حیدر بار بار اسے دیکھتا، تو دیکھتا رہ جاتا تھا۔ اسے بار بار خود کو ان فوکس رکھنا پڑ رہا تھا۔ کوئی کام ٹھیک ڈھنگ سے سر انجام نہیں ہو رہا تھا۔ اسے بس اس بے نام لڑکی کے ہوش میں آنے کی جلدی تھی۔

اسے سوالات کرنے تھے۔

آدھے پہر کے بعد اس لڑکی کو ہوش آیا تو حیدر نے دیکھا تھا اس کی آنکھیں سرمئی تھیں۔ وہ مبہوت سا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اسے ڈاکٹر نے آواز دی تو خود کو جھنجوڑتا وہ اس لڑکی تک آیا تھا۔

''اسلام و علیکم، میں ایس پی حیدر ذوالفقار۔ آپ کی طبعیت کسی ہے؟'' اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

لڑکی کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔وہ بس انجان سی ادھر ادھر نظریں گھما رہی تھی۔

”آپ گھبرائیں نہیں، آپ ہسپتال میں ہیں۔۔کل رات غالباً آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟“ حیدر نے بغور اس کی چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔

لڑکی ذہن پہ زور ڈالتے کچھ سوچنے لگی تھی۔پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔

”آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔۔آپ کو کچھ یاد ہے۔۔؟“

رپورٹس کے مطابق کوئی بھی جنسی تشدد کے ثبوت نہیں ملے تھے تو یہ واقعی کوئی ایکسیڈینٹ تھا۔شاید کسی گاڑی نے ٹکر ماردی ہو۔۔۔؟

"اس کا نام دوروس ہے۔"اس ایک لفظ نے حیدر کی پوری زندگی پلٹ دی تھی۔

کمرے میں سکوت چھا گیا۔وہ بالکل ششدر سا اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔۔

•••••••••••

اسے نہیں اندازہ تھا کہ اس کی زندگی اتنا بڑا ٹرن لے گی۔ جس کیس پہ وہ ایک عرصے سے کام کر رہا تھا، وہ واقعی میں حل ہو گیا تھا۔ اس سب کڑی کا ملاؤ دوروس تک ہو رہا تھا۔

وہ بے حس و حرکت اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ ارمغان تو نہیں تھا جس کو اپنا بدلا لینا تھا۔۔ یہ تو کوئی اور ارمغان تھا۔۔ یہ تو کوئی ظالم ارمغان تھا۔۔

"ارمغان۔۔ واقعی اتنا ظالم ہو سکتا ہے۔۔؟" اس نے خود سے سوال کیا تھا۔۔ چالیس عورتوں اور بچوں کا اسالٹ۔ سب کچھ دوروس تک آ کر رک گیا تھا۔

"ارمغان ایسا تو نہیں تھا۔۔۔"

اس کی آواز گونج کے ٹوٹی تھی۔

سب کچھ بکھرا بکھرا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے اب تمام ایف آئی آرز پہ نظرثانی کرنی تھی۔ان تمام لوگوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنی تھی جنہوں نے ان چالیس لوگوں کے لیے رپورٹ درج کروائی تھیں۔

وہ آنکھیں مسلتا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ایک ملاقات اس کے انتظار میں تھی۔چند سوالات اس کے دماغ میں تھے۔

....

(لاہور،حال)

وہ دم سادھے اسے سنتی رہی۔ہوائیں اس کی تھمتی سانسوں کی طرح ٹھہر گئی تھیں۔

”حیدر تمہیں۔۔۔مارنے آرہا ہے؟“ایرج نے بے صبری سے پوچھا تھا۔

وہ اس کی بات پہ مسکرایا۔

"شاید۔"

"تمہیں کیسے پتا ارحم بھی اس کی ساتھ آئے گا؟" اسے اب بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں مگر دل اچانک سے بے چین ہوا تھا۔

"کیونکہ النساء اسے سب بتا دے گی۔۔" ارمغان نے لمبی سانس بھرتے کہا۔

"تم اس کی دوست تھی۔ وہ تمہارے لیے اتنا تو کر دے گی۔۔" اس نے اضافے کے ساتھ کہا۔ پھر سر جھکا لیا۔

ایرج آگے سے کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔سب بہت کنفیوژنگ ہو گیا تھا اس کے لیے۔۔اس نے ٹیبل سے ہاتھ ہٹاتے اپنا دوپٹہ درست کیا۔چہرے پہ سلوٹیں اب بھی ویسے ہی نمایاں تھیں۔

خاموشی نے ایک بار پھر خلل ڈالا تھا۔چائے کی خوشبو پھر سے ہر سو چھانے لگی تھی۔پتے مرجھا رہے تھی، جھوم رہے تھے،ٹوٹ رہے تھے۔دل کی طرح۔

"ایرج۔۔"ارمغان نے خاموشی توڑتے سرگوشی کی۔

"ہمیں چلنا چاہیے۔"اسے نظرانداز کرتے وہ کرسی سے اٹھی تھی۔

وہ حیران سا اسے دیکھتا رہا۔ایرج نے چہرہ پھیرا تھا مگر ارمغان کرسی پہ ہی بیٹھا رہا۔

"کب تک تم بھاگو گی ایرج؟"اس کے لہجے میں کچھ شکستہ سا تھا۔

"میں تھک گیا ہوں یار۔۔۔مجھے کہیں ٹھہرنا ہے اب۔۔۔مجھ سے اب اور نہیں چلا جا رہا،ایرج۔۔میری ہمت ٹوٹ رہی ہے۔"اس نے سر گرا لیا۔آنکھیں اسے دکھانے کے قابل نہ تھیں۔آنکھوں سے بہت کچھ ظاہر ہو جاتا تھا۔

"مجھے خود سے دور کرنے کا طریقہ بتادو' ایرج۔۔اگر میں تمہیں قبول نہیں ہوں تو میرے دل میں بسی اپنی زندگی کو تم کھینچ نکالو۔۔مجھ سے اور برداشت نہیں ہو گا۔۔۔"آنسو آنکھوں میں جمع ہونے لگے تھے مگر لہجہ مضبوط تھا۔

"مجھ سے واقعی برداشت نہیں ہو گا اب۔۔۔"لہجہ مضبوط رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔۔دل بھی ڈوب رہا تھا۔کسی درد کی جھیل میں جہاں کانٹوں کے پھول اس کی منتظر تھے۔

وہ خاموش ہو گیا۔وہ اور کتنا بولتا۔بات لفظوں سے دور جا چکی تھی۔۔بات لفظوں سے بیان نہیں کی جاسکتی تھی۔

اندرون لاہور میں تاروں کے درمیان فیری لائٹس روشن ہوتی جارہی تھیں۔
قدیم دیواروں پہ مصنوعی روشنی تاریک رات میں دھرتی روشن کررہی تھی۔

اندرون لاہور محبت تھا۔وہاں کی ہر چیز یادوں کا احساس دلاتی تھی۔ مگر کچھ یادیں تو بہت خار لیے ہوتی ہیں۔ جسم اور دل، دونوں پہ خراش چھوڑ جاتی ہیں۔

ارمغان سر جھکائے، بالکل خاموشی سے خود کو باور کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ یک دم ٹھٹک گیا۔اسے اپنے چہرے پہ کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔

وہ 'کسی' کے ہاتھ نہیں تھے۔

ایرج نے دونوں ہاتھوں کے ہتھیلی سے اس کا چہرہ تھاما تھا۔ پھر اسے آہستگی سے اوپر کی جانب اٹھایا۔

دونوں کو نظر آرہا تھا کہ دونوں کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کا عکس برپا ہو رہا تھا۔ ایک طرف زندگی تھی، ایک طرف موت۔

"تمہیں مجھ سے محبت کیوں ہوئی' ارمغان۔۔۔" ایرج نے آنکھیں موند لیں۔

"زندگی کیوں، کیسے، کب سے بہت پرے ہے، ایرج! تم زندگی ہو۔ صرف میری نہیں، بہت سے لوگوں کی۔۔ اور زندگی بتا کر تھوڑی ہی حاصل ہوتی ہے۔" وہ بے ساختہ مدھم سا مسکرایا۔

"میں کسی کی زندگی نہیں ہوں' ارمغان۔۔ میں کسی کو پسند نہیں آسکتی ہوں۔۔ میری زندگی ایک تباہ خانہ ہے، بنجر، سنسان، بے جان۔۔ میری زندگی میں کچھ نہیں ہے، میں بھی کچھ نہیں ہوں۔۔" ایرج نے اداسی سے کہا تھا۔ ارمغان اسے دیکھتا رہا۔ اس کے گندمی چہرے کو، اس کی بند آنکھوں کو جن کے پیچھے نمی جمع ہو رہی تھی۔

"میں جس کی زندگی میں جاتی ہوں، میں اسے تباہ کر دیتی ہوں۔۔ مجھ سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ میں بالکل اچھی نہیں ہوں۔۔ مجھے لوگوں سے خوف آتا ہے۔۔ مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔۔ مجھے اب۔۔۔ دل لگانے سے ڈر لگتا ہے۔" اس کے آنسو برداشت کی حد پار کر گئے تھے مگر وہ سانسیں کھینچے خود کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں تھی۔

اس کے لفظ اس کے لبوں سے جدا ہوئے تھے تبھی ارمغان کرسی سے اٹھا اور اس کے ہم قدم آ کھڑا ہوا۔ایرج کا ہاتھ ارمغان کے چہرے سے گر کر پہلو میں آ گیا۔ سر جھک سا گیا تھا۔

"تم نے کبھی خود کو میری نظروں سے دیکھا ہے'ایرج؟"ارمغان نے بے حد مدھم اور نرم آواز میں کہا تھا۔ہنوز اسی کو دیکھتے ہوئے۔اس سے تھوڑے سے فاصلے پہ کھڑے۔اس کی ہاتھ بھی گرے ہوئے تھے۔

ارمغان کی بات پہ ایرج نے ہمت کر کے اپنی آنکھیں کھولیں تو دونوں آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔اسنے ارمغان کے چہرے پہ نظریں مرکوز کی تھیں۔

''تم انتہائی خوبصورت، ذہین اور بہادر لڑکی ہو' ایرج۔ تم اپنی اور دوسروں کی نظروں میں کچھ بھی ہو۔۔تم جو میری نظروں میں ہو، وہ میرے لیے کافی سے بہت زیادہ ہے۔''ارمغان نے صاف آواز میں کہا تھا، اس کی لہجے میں کوئی شک و شبہ کا عنصر تک نہیں تھا۔

وہ جہاں تھی، وہیں رہ گئی۔ زندگی میں پہلی بار اس کی کسی نے دل سے تعریف کی تھی۔اور پہلی بار کسی کی تعریف اسے دل پہ لگی تھی۔

اندرونِ لاہور کی سڑکیں گدلے پانی سے بھیگی ہوئی تھیں۔ان پانیوں کے سنگم پہ فیری لائٹس کا ایک الگ امتزاج برپا ہو رہا تھا۔

کچھ یہی حال ان دونوں کی آنکھوں کا بھی تھا۔سیاہ آنکھوں میں بھوری آنکھوں کا سفر، بھوری آنکھوں میں سیاہ آنکھوں کے شوق۔

"محبت زندگی نہیں ہوتی، محبت تو لمحات ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی آتے ہیں، پھر چلے جاتے ہیں۔زندگی تو وہ ہوتی ہے جسے پا کر جینے کا اشتیاق دل میں جاگے۔۔۔"

ارمغان ایک بار پھر گویا ہوا تھا،ایرج نے پھر اس کی سماعت پہ کان دھرے تھے۔

"مجھے تم سے محبت بہت بعد میں ہوئی تھی'ایرج۔مجھے تم سے زندگی کا احساس سب سے پہلے حاصل ہوا تھا۔ایک شخص محبت کے پیچھے اپنی زندگی قربان کر دیتا ہے۔۔اور میری تو زندگی ہی تم سے ہو کر رہ گئی ہے ایرج۔میرے پاس قربان کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔۔تم اس حصار سے دور چلی جاؤ گی،اور میں مر جاؤں گا۔"

وہ بہت صاف لفظوں میں اپنی بات واضح کر رہا تھا۔اس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ وہ جملے کہیں سے بھی جذباتی نہیں لگتے تھے۔ جیسے وہ حقیقت بیان کر رہا ہو۔جو وہ بول رہا ہے، وہ سچ ہو۔

ایرج اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی،اسے سنتی رہی۔گھنے سیاہ بال، تیکھے نقوش، اٹھی ہوئی ناک، سیٹ ہوئی داڑھی۔اسے وہ اچھا لگا تھا،اس سے زیادہ اس کی باتیں اچھی لگی تھیں۔مگر ذہن اب بھی کہیں الجھا ہوا تھا۔کسی ماضی کے انبار میں گم۔

ایرج نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کی پشت کو ہلکے سے چھوا تو اس نے بے ساختہ نیچے کو دیکھا۔

"تم میرے ساتھ میری زندگی کے ایک باب کو تمام کرنے میں میری مدد کرو گے' ارمغان؟"ایرج کا ہاتھ اب بھی ہنوز اس کی ہاتھ سے مس ہو رہا تھا۔

"پھر شاید فیصلے آسان ہو جائیں میرے لیے۔"وہ بغور اسی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی،اور وہ اس کے ہاتھوں کو۔

"تم نہیں مرو گے ارمغان۔۔میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔"

ایرج نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں باہم پھنسائی تھیں۔ مٹھی بند کرتے اس نے ارمغان کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما۔ارمغان پہلے اپنے ہاتھوں کے اس اشتراک کو دیکھ رہا تھا۔پھر ایرج کی طرف دیکھا۔

”مجھے وہاں لے جاؤ جہاں اس زخمی سی کہانی کا اختتام ہونے والا ہے۔ہم دونوں نے بہت دکھ جھیل لیے ہیں۔۔“

دونوں کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔وہ رو نہیں رہے تھے،وہ شاید خوش تھے۔ انجانی سی خوشی میں۔

دونوں گدلے پانیوں میں پاؤں دھرتے اندرون لاہور کو خیر باد کرتے باہر کی طرف جارہے تھے۔وہ گدلے پانی۔۔وہ کلونجی کے بسکٹس اور وہ چائے کی پیالی۔۔ سب ان دونوں کو بے جان سا جاتا دیکھتے رہے۔

وہ گواہ تھے اس کہانی کے،وہ گواہ تھے کہ دو لوگ ایسے بھی آئے تھے جنہوں نے اندرون لاہور کی قدیم دیواروں کو اپنا ہمراز بنایا تھا۔دو لوگ ایسے بھی آئے تھے جنہوں نے دل کی باتوں کو دل تک رکھا تھا۔ایک وعدہ جو ایفا ہونا تھا۔بہت جلد۔۔ بہت جلد۔

....

ہیلمٹ پہنتے ارمغان بائیک پہ بیٹھا تھا، بائیک پہ بیٹھ کر اس نے اپنی جیکٹ کو شانوں سے درست کیا اور ایرج کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم بہت ریش ڈرائونگ کرتے ہو۔۔اب آہستہ چلانا ورنہ میں کود جاؤں گی۔"

ایرج اس کی کندھے سے سہارا لیتے بیٹھی۔

اس کی بات پہ ارمغان نے محض صرف سر ہلایا تھا اور چابی گھماتے بائیک کو پارکنگ سے باہر لے آیا۔

لاہور کی سڑکوں پہ اس کی بائیک شاہین سے زیادہ رفتار پہ اڑ رہی تھی۔ ایرج کو سمجھ نہیں آیا وہ دوپٹہ دیکھے، بال سنبھالے یا خود کو، اس کو پیٹ سے پکڑے وہ مارے خوف کے آنکھیں بند کیے ہوئی تھی۔

''اسپیڈ کم کرو ارمغان! میں گر جاؤں گی!'' وہ حلق کے بل چلائی۔

"کوئی بات نہیں، میں سنبھال لوں گا۔" اس نے خود سے سرگوشی کرتے بائیک کی رفتار اور بڑھاتے ہوئے سڑکوں کو چیرا تھا۔

ایرج تو فوت ہونے کی حالت میں تھی، آنکھیں بند کیے اس نے تمام دعاؤں کو آواز بلند پڑھا تھا، وہ بھی جو ٹوٹی پھوٹی یاد تھیں۔

ارمغان اس کی حرکت پہ مسکرایا۔ وہ بار بار اس کو تھپڑ، گھونسے مارے جا رہی تھی۔۔ مگر وہ کہاں سننے والا تھا؟

اندھیر سڑکوں پہ نم نم سا سماں تھا۔ لاہور میں ایک لڑکا اپنے "بیک پیک" کے ساتھ آوارہ گردی کر رہا تھا۔

وہ ارمغان مطاہر تھا،اسے خود سے فرق نہیں پڑتا تھا، کسی اور سے کیا پڑتا؟

....

Six-محبت

ویسے تو اس کا آفس اتنا دور نہیں تھا مگر اس نے پھر بھی لمبا راستہ اختیار کیا تھا۔

نجانے کیوں؟

سفید عمارت کے سامنے اس نے موٹر سائکل پارک کی تھی۔ایرج کھوئے کھوئے حواس کے ساتھ بائیک سے اتری،اس کا پاؤں مکمل سن ہو چکا تھا۔بال اڑے اڑے ہوئے سے۔ناک لال ہو رہی تھی۔

وہ اتری اور بائیک پہ بیٹھے ارمغان کو گھورنے لگی۔جو دھیان سے ہیلمٹ اپنے سر سے جدا کر رہا تھا۔ہیلمٹ اتار کے اس نے بالوں کو ہاتھوں سے درست کیا۔پھر ایرج کی طرف آنکھیں گھمائیں۔

وہ اس کی آنکھوں میں اٹھتے شعلوں کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا تھا۔ایک گال کی ایک جانب گڑھا پڑا۔

”میں نے کہا تھا بائیک آہستہ چلانا۔“اس نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا تھا،البتہ آنکھوں اور چہرے سے غصہ صاف ظاہر تھا۔

”ہمیں وقت پہ بھی تو پہنچنا تھا۔“وہ شرمندگی سے بولا۔

”میں مر جاتی۔“اس نے کہا تھا اور ارمغان نے بے اختیار اس کی منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ایرج کا وجود اس کی حرکت پہ ساکن ہوا تھا۔

”یہ کام میرا ہے،اس میں تم کہیں بھی نہیں ہو۔کم از کم میرے جیتے جی نہیں۔“ اس کی لبوں پہ کوئی مسکراہٹ نہیں تھی اب وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تم ہر وقت موت کی باتیں کیوں کرتے ہو۔" اس نے ارمغان کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹاتے اسے تھاما۔

"زندگی موت سے نہیں ڈرتی۔ تم کیوں ڈرتی ہو موت سے۔۔؟" وہ اب بھی اسی سنجیدہ لہجے میں بائیک پہ بیٹھا کہہ رہا تھا۔ ایرج اس کی سامنے کھڑی تھی۔

"مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا، موت کے بعد کے منظر سے لگتا ہے، اس کے لیے بھی جو مر چکا ہے، اور اس کے لیے بھی جو زندہ ہے۔" ارمغان کا ہاتھ چھوڑ دیا گیا تھا۔

"موت تکلیف تب دیتی ہے جب انسان اپنے رقیب کے سرہانے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہو۔ ورنہ موت تو سکون دیتی ہے۔" ارمغان اب بائیک سے اتر رہا تھا۔ بائیک کو لاک کرتے ہوئے اس کی پشت ایرج کی طرف ہوئی۔

"ائندہ سے مرنے مرانے کی باتیں مت کرنا۔" وہ کہہ کر پارکینگ سے مڑی تھی۔

"کیوں؟" بے ساختہ سا سوال۔

"کیونکہ تم پر زندگی بہت جچتی ہے۔" وہ دبے قدموں اس سے دور جانے لگی۔

ارمغان اس کی پشت حیرانی سے دیکھتا اس کی پیچھے پیچھے آیا تھا۔ چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

وہ دونوں آفس کے اندر داخل ہوئے تو تمام لوگ جو وہاں موجود تھے، بالکل فریز ہو گئے۔ جو بیٹھا ہوا تھا، وہ بیٹھا رہ گیا، جو کھڑا ہوا تھا، وہ کھڑا رہ گیا۔

مفلر نما دوپٹے کو گلے پہ گھماتے وہ ایسے داخل ہوئی تھی جیسے آفس اسی کا تو ہے۔ اس کے پیچھے ارمغان کا دراز قد وجود نمایاں ہوا تھا۔ ایرج سے تھوڑا لمبا۔

آنکھوں پہ سیاہ چشمہ ٹکا ہوا تھا۔ لیدر جیکٹ سفید شرٹ پہ پہن رکھی تھی۔ وہ ہر بار کی طرح اب بھی اتنا ہی اچھا لگ رہا تھا۔

ایرج اندر آتے ہی رک سی گئی تھی، تمام لوگوں کی مرکوز نگاہ نے اسے یکدم کنفیوژ کر دیا تھا۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا وہ پہلے سلام کرے، یا کہاں جائے؟

وہ حیران و پریشاں سب کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنے قریب کسی وجود کا احساس ہوا۔

"میں تمہارا ہاتھ تھام سکتا ہوں، ایرج؟" اس کے کان کے قریب سر گوشی ہوئی تھی۔

وہ بمشکل مسکرائی۔

”یہ کیسا سوال ہے؟“اس نے ارمغان کو پھسپھساتے سے لہجے میں کہا۔

ارمغان نے اس کو آگے کچھ نہیں کہا۔بس اس کی پشت سے دو قدم آگے بڑھائے اور اس سے تھوڑا سا آگے آکر کھڑا ہوا تھا۔

”یہ ایرج جاوید صدیقی ہیں۔“اس نے بس اتنا کہا تھا۔اور ہر کسی کو سپاٹ نظروں سے دیکھا۔چہرے پہ مسکراہٹ کا نام و نشان نہیں رہا تھا۔

”تارا،روم میں آؤ۔“تارا جو اس کے نزدیک تھی فوراً ہی آ کھڑی ہوئی تھی،اس سے کہا گیا۔

اس نے ایرج کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔بس مدھم آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''میرے ساتھ چلو۔''وہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔
ایرج بھی تقریباً بھاگتے اس کے ہمقدم آئی تھی۔

تارا نے البتہ دو تین فائلز اٹھائیں اور لفٹ پہ بٹن دبا کر اوپر کی جانب چلی گئی تھی۔

نیچے فلور پہ پھر سے گہما گہمی کا سماں چھا گیا تھا۔ہر کوئی اپنی خوش گپیوں میں مصروف ہو چکا تھا۔جلد برپا ہونے والے طوفان سے بالکل بے خبر۔

•••••••••••

وہ دونوں سیکنڈ فلور پہ بنے اس کے روم میں آ گئے تھے۔ دروازہ کھولتے ہی آفس کا کونا کونا اس پہ واضح ہوا تھا۔

سفید مدھم لائٹس پورے کمرے کو روشن کر رہی تھیں۔ سرمئی دیواریں کسی بھی نقش و نگار سے پاک تھیں۔

ایک دیوار پہ ماہنامہ کلینڈر لٹکا ہوا تھا۔ کانچ کی بنی ٹیبل کے ایک طرف سربراہی ریوالونگ چیئر تھی، دوسری طرف دو الگ الگ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ سربراہی کرسی کے بالکل سامنے ایل ای ڈی آویزاں تھی جو ابھی بالکل سیاہ تھی، بند۔

وہ کمرے میں آکر خاموش رہے تھے۔ایرج نے اس کی سوچتی نگاہوں کو زمین پہ مرکوز دیکھا تھا۔اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔کمرے پہ طائرانہ نگاہ دوڑاتی رہی۔

ان کے پیچھے چند لمحوں بعد ہی بند دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ارمغان نے سر اٹھا کر دروازے کو دیکھا۔پھر ''آجاؤ'' کے اشارے پر تارا نے دروازہ دھکیلا تھا۔

دروازہ خود بخود اس کی پیچھے بند ہو گیا۔اس نے سیاہ اور مرون رنگ کا جوڑا زیب تن کر رکھا تھا،دوپٹہ غائب تھا۔

وہ "جی سر" کر کے، فائلز کو سینے سے لگائے مؤدبانہ سا اس کی سامنے کھڑی ہو گئی، ساتھ ساتھ تجسس بھری نگاہ ایرج پہ بھی ڈال لیتی۔

"ہم جب یہاں نہیں تھے، تو کوئی آیا تھا؟" ارمغان نے تارا کو بغور دیکھتے کہا تھا۔

"نہیں باس۔۔ کسی کو آنا تھا کیا؟" تارا نے الٹا سوال کیا۔ ارمغان چند لمحے بالکل خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ اچانک سے ٹینس ہو گیا تھا۔ ایرج اس کی پریشانی بھانپ چکی تھی۔

"تارا، ابھی اس آفس میں کچھ ہونے والا ہے۔ شاید کل یا اسی رات۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی بھی کسی بھی قسم کے دباؤ یا ٹینشن میں نہ رہے۔ ہمارے آفس پہ ریڈ پڑنے والی ہے۔ میں تمھیں یہ اسی لیے بتا رہا ہوں تاکہ تم پینِک نہ کرو۔ تم پینِک

نہیں کرو گی تو دوسروں کو سنبھال سکو گی۔'' وہ بے حد سنجیدگی اپنے لہجے میں عیاں کیے اسے سمجھا رہا تھا۔

تارا کے چہرے پہ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں البتہ وہ بغور ارمغان کو سن رہی تھی۔

''ابھی کیوں، کب، کیسے کا ٹائم نہیں ہے۔ مجھے ابھی بہت سی کالز کرنی ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم سب ہینڈل کرو۔ میں نے تم پر ہمیشہ بھروسہ کیا ہے۔ تم اس کام کو بھی سرانجام دو گی۔۔ مجھے یقین ہے۔ رائٹ؟''

اس کی بات پہ تارا نے پراعتماد سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ البتہ اس کا ذہن بہت سے شکنجوں میں پھنس رہا تھا۔ اسے پہلے خود کو نارمل کرنا تھا، پھر باقی سب دیکھنا تھا۔

میں برابر والے روم میں ہوں۔مجھے ایرج سے چند باتیں کرنی ہیں،اور بھی چند لوگوں سے باتیں کرنی ہیں۔پلیز۔۔ڈونٹ ڈسٹرب۔"اس کا لہجہ نرم ضرور تھا مگر سپاٹ۔

تارا سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی تھی۔پیچھے وہ دونوں رہ گئے تھے۔ایرج اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے آئی تھی۔وہ ٹیبل سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔

"تم پریشان مت ہو۔"اس نے ایرج سے کہا۔

"یہ تو مجھے تم سے کہنا چاہیئے۔"اس کے لہجے میں بھی سنجید گی تھی۔

"جو میں نے تارا کو کہا، وہی تمہارے لیے بھی ہے۔"ارمغان نے اس کی بات نظر انداز کی تھی۔وہ آفس آکر بے حد سپاٹ اور روبوٹک سا ہو گیا تھا۔

"ارمغان۔۔تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔تمہیں کسی چیز سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"وہ اس کی قریب آئی تھی۔دو انچ کا فاصلہ دونوں کے درمیان حائل ہوا تھا۔

"میں تو قاتل تھا۔"وہ بے اختیار طنز کر گیا۔آنکھوں میں کرب اٹھ گیا۔

”باطل کا قتل دفاع کی پہلی سیڑھی ہوتا ہے۔۔میں یہ اس وقت سمجھ نہیں پائی تھی۔میں ارحم کو سمجھ نہیں پائی تھی۔۔“

ارمغان نے کچھ نہیں کہا۔

”میں تم کو بھی۔۔ سمجھ نہیں پائی تھی۔“اسنے بالآخر اعتراف کیا تھا۔ایرج کی آنکھیں زمین پہ مرکوز تھیں۔ارمغان کی اس پر۔

”اب سمجھ آگیا ہوں میں تمہیں؟“کچھ تھا اس کی انداز میں کہ ایرج نے چہرہ اٹھایا، اس سے آنکھیں ملائیں۔

"سمجھ نہیں آئے ہو۔شاید۔۔"ایرج کا جملہ ادھورا رہ گیا۔لفظ ٹوٹ گئے۔

"شاید۔۔"اس نے پشت ٹیبل سے الگ کی،وہ دو قدم اس تک آیا تھا،ایرج دو قدم پیچھے ہوئی۔دونوں کی آنکھیں اب تک ایک طلسم کی طرح ایک دوسرے میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"کچھ نہیں۔"ایرج نے حتمی سے لہجے میں کہا۔

"جملہ مکمل کرو'ایکویریس۔"وہ دو قدم اور آگے کو آیا،وہ دو قدم اور پیچھے کو ہوئی۔

"تمہارے گھر پہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے ایک سوال پوچھوں گی۔"

ایرج کی آنکھوں میں اب بھی کوئی تاثر نہیں تھا، لبوں پہ کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔

یہی حال ارمغان کا بھی تھا۔

اس نے سر ہلایا۔

"تم نے مجھے ریمائنڈ نہیں کروایا۔" بے تاثر لہجہ۔ وہ دو قدم اور آگے آیا تھا۔ اب ایرج پیچھے نہ ہوئی۔

"مجھے لگا تم اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔"

اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی، سخت لہجہ نرم پڑا تھا۔

ایرج کو چبھن سی ہوئی تھی۔دل میں کچھ عجیب سی شے چبھی تھی۔وہ دو قدم پیچھے ہوئی۔کوئی یاد دماغ میں گھپ گئی۔اسے اپنے منہ میں خون سا ذائقہ آنے لگا تھا۔ اس نے ارمغان سے نظریں چرائی تھیں۔

"صحیح کہا تھا شاید میں نے،میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ کہہ کر رکی نہیں،بلکہ اپنے اور اس کی درمیان سے نکل کر دروازے کی طرف جانے لگی کہ ارمغان نے غم وغصے سے اس کی کلائی تھامی تھی۔ارمغان کی آنکھوں میں یکدم شعلے جلنے لگے تھے،خون گرم ہو رہا تھا۔

"تم میرے ساتھ اب کھیل رہی ہو' ایرج۔" اس کی آواز ہیبت ناک حد تک گہری اور سرد ہوئی تھی۔ کلائی پہ گرفت مضبوط تھی پھر بھی ایرج نے اپنا ہاتھ جھٹک کر اس کی گرفت سے خود کو آزاد کیا۔

"میں شاید خود سے کھیل رہی ہوں ارمغان، اور اب یہ کھیل میرے ہوش و حواس پر حاوی ہونے لگا ہے۔۔" وہ دکھ سے کہتی دروازہ کھولے باہر کو نکل گئی تھی۔

روم کے اندر اب صرف ارمغان رہ گیا تھا۔ مٹھیاں بھینچے، دانت پیستے وہ خود کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایرج کا دل پگھلاتے پگھلاتے اس کی زندگی پانی بن کر بہہ گئی تھی۔ اسے پہلی بار خود پہ دکھ ہوا تھا۔

فون پہ کسی کی کال کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی،اس نے جیب سے ایک فون نکالا تھا۔نام دیکھ کراس نے ایک لمبی سانس خارج کی،اس نے فون کان سے لگایا۔

....

وہ لمبی لمبی،گہری گہری سانسیں لیتی برابر والے کمرے میں آگئی تھی۔اپنے پیچھے اس نے دروازہ بند کیااور بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

"میں یہ کیا کرنے جارہی تھی۔"اس نے دماغ میں سوچا۔سانس پھول رہا تھا۔جیسے کسی نے سانس نکال کر واپس زندگی عطا کردی ہو۔

''میں اتنی بے وقوف ہوں۔۔''اس نے خود کو کوسا۔وہ کلاس میں پانی ڈالنے لگی تھی۔اسے خود پہ رونا آرہا تھا،غصہ بھی آرہا تھا۔

''مجھے یہاں سے صرف گھر جانا ہے۔مجھے کوئی تعلق یہاں قائم نہیں کرنا ہے۔مجھے اپنے گھر جانا ہے۔''وہ دل ہی دل میں منتر دہرا رہی تھی۔وہ دل کو قائل کر رہی تھی۔

''میں اب کسی کی ڈامینیشن میں نہیں آؤں گی۔مجھے اپنا کریئر آگے بڑھانا ہے۔۔مجھے گھر جانا ہے۔۔اپنی فیملی کے پاس۔۔''وہ پانی کے لمبے لمبے گھونٹ بھر رہی تھی۔

”مجھے اب کسی سے محبت نہیں کرنی ہے۔۔میں محبت کے قابل نہیں ہوں۔۔“

زندگی اکثر انسان کو کتنا مجبور کر دیتی ہے ناں۔ جس سے دل نہیں لگانا چاہتا ہے انسان، اسی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔اور جب تک اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔۔تب تک بہت دیر ہو جاتی ہے۔۔بہت دیر۔

•••••••••••

منصوبہ-Five

کال کنیکٹ ہو گئی تھی، البتہ ہر گاہ خاموشی چھائی رہی۔

"تم کال نہیں اٹھا رہے تھے۔۔۔" یہ سوال نہیں تھا، بس ہلکا پھلکا لہجہ تھا۔ جس میں کچھ چھپا ہوا تھا۔

"مصروف تھا باس۔۔ کیسے کال کی، سب خیریت؟" وہ بظاہر تو نارمل سے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ البتہ اسے حیرانی ہوئی تھی، ایلیٹ بہت کم ہی خود سے کسی کو کال کیا کرتے تھے۔ اپنے پرسنل نمبر سے۔

"ہاں بس۔۔ تم سے بات کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔" وہ ان کی بات پہ حیرانی سے مسکرا دیا۔

"خیریت۔۔آج مجھ پہ پیار آرہا ہے بہت؟"اس کا لہجہ ہلکا پھلکا سا ہوا تھا۔کسی بھی شک و شبہے سے پاک۔ایک ایلیٹ ہی تو تھا جس پہ ارمغان خود سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔

دوسری طرف خاموشی چھاگئی تھی۔سکوت۔

"باس؟"اس نے فون کان سے ہٹا کر دیکھا،کال جاری تھی۔

"مجھے۔۔۔مجھے تم سے معافی مانگنی تھی بچے۔۔"ان کی آواز پھنس پھنس کے آرہی تھی۔جیسے وہ بہت کچھ ضبط کر رہے ہوں۔

ارمغان کو تجسس ہوا تھا۔وہ یہ کس ایلیٹ سے بات کر رہا تھا جو اس ناچیز سے معافی مانگنے لگا تھا۔

''آپ کو کس چیز کی معافی مانگنی ہے، باس۔''اس نے بظاہر مذاق کیا تھا۔

''میں نے تمہیں مار دیا ارمغان۔۔میں نے تمہیں مار دیا۔''اسے ایلیٹ کے آنسو خود کے وجود پہ بارش کی طرح محسوس ہوئے تھے۔اوراس کے الفاظ اس کے دل پہ کسی کڑکتی بجلی کی طرح نازل ہوئے تھے۔

''میں سمجھا نہیں باس۔۔آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''وہ واقعی کچھ سمجھ نہیں پایا تھا، بند کمرے میں حبس بڑھتا جا رہا تھا۔

"مجھے۔۔۔معاف کر دوار مغان۔۔میں نے تمہیں مار دیا۔۔" وہ اس کی علاوہ کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔اور ار مغان کو اس کی علاوہ کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا۔

"مجھے تم بہت عزیز تھے ار مغان۔۔میں نے تمہیں۔۔کھو دیا۔۔" ایلیٹ کہہ رہا تھا، ار مغان کہ منہ سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا۔

"میں بزدل نہیں تھا۔۔مجھے لگتا تھا میں بزدل نہیں ہوں۔۔مگر آج۔۔آج میں نے خود کو چن لیا۔۔میں نے تمہیں قربان کر دیا۔۔" وہ بیچ بیچ میں کھانس رہے تھے۔آواز کمزور ہو گئی تھی۔

"میں۔۔۔ سمجھ نہیں پا رہا ہوں آپ کی بات، باس۔۔" وہ بوکھلایا سا فون کان سے لگائے، کرسی پہ بیٹھا چلا گیا۔

"تم مجھے اب بھی باس کیوں کہہ رہے ہو ارمغان۔۔"

اس نے شرٹ کو کھینچ کر سانس لینے کی کوشش کی۔

"اپنی موت کو دل سے قبول کرنا بچے۔۔ کاش میں تم کو بچا پاتا۔ اپنی موت کو خود پہ حاوی نہیں ہونے دینا۔۔ بہت بہادر ہو نا تم۔۔ تم بہت دلیر ہو ارمغان۔۔ تم محبت کو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔۔ میں نے تم کو محبت کی سزا دے دی۔۔ مجھے۔۔ مجھے معاف کر دینا۔"

فون کھٹ سے بند ہو گیا تھا۔وہ دم سادھے کرسی پہ گر گیا تھا۔آنکھیں اور ہوش، دونوں پھٹے پھٹے سے ہو گئے تھے۔وہ ایک ہاتھ سے سر مسلتا واپس کال ملانے لگا۔

''آپ مجھے نہیں مار سکتے باس۔۔میں نے آپ پر بھروسہ کیا تھا۔۔''وہ ساتھ ساتھ بڑبڑا رہا تھا۔ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

''میں نے تھوڑی سی مہلت ہی تو مانگی تھی باس۔۔اب مجھے اس کی اتنی بڑی سزا نہیں دے سکتے۔۔''ہاتھ سے فون چھوٹ رہا تھا۔اس سے کوئی کام ٹھیک سے نہیں ہو رہا تھا۔

"آپ یہ نہیں کر سکتے باس۔۔ نہیں۔۔ابھی نہیں۔۔ابھی تھوڑا سا وقت اور۔۔ پلیز باس۔۔پلیز۔"اس کا اپنا آپ یخ ہوتا جا رہا تھا۔آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔۔

وہ موت سے کیوں ڈر رہا تھا۔۔وہ موت کو قبول کیوں نہیں کر پا رہا تھا؟

"مجھے۔۔مجھے۔۔"اس کے جملے آدھے ادھورے ٹوٹ رہے تھے۔وہ فون کو زمین پہ پٹختا،دروازہ دھکیلتا روم سے باہر بھاگا تھا۔

زمین پہ پڑے فون پہ نیا پیغام جگمگایا تھا۔

''پلین ہائی جیک، لاہور۔ مشفقہیں ن۔ فیلڈ۔''

کمرہ خالی سنسان ہو گیا تھا۔

کس کو معلوم تھا اس عمارت کی سفید دیواریں سرخ کے شوخ رنگ میں ڈھلنے والی تھیں۔۔؟

....

وہ سفید کمرے کے واحد بیڈ پہ بیٹھے کسی سوچ میں غرق تھی جب کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔وہاں وہی کھڑا تھا۔بلو پینٹ، سفید شرٹ۔ مگر اس کا چہرہ کچھ اور ہی واضح کر رہا تھا۔

اس کے چہرے سے پریشانی اور خوف عیاں تھا۔ہاں....ایرج نے پہلی بار ارمغان کے چہرے پہ خوف کے تاثرات کو پایا تھا۔آئے بروزا کھٹے ہوئے تھے، آنکھیں وہاں سی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے اس تک آیا۔ایرج نے دیکھا تھا اس کی ہاتھ میں پستول ہے۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔

دو قدم کے فاصلے پر وہ اس کی سامنے رک گیا۔ دونوں کی آنکھیں اک بار پھر ملی تھیں۔

"کیا ہوا۔۔؟ سب خیریت ہے۔۔؟" ایرج پوچھ اٹھی تھی مگر ارمغان نے جواب نہیں دیا۔

ایک پل گزرا تھا، پھر دو۔ وہ بس اسے یک ٹک دیکھے گیا تھا۔ جیسے زندگی میں آخری بار اسے دیکھ رہا ہو۔ اس نے نظریں ہٹانا چاہیں، وہ نہیں ہٹا سکا۔ اس نے بات کرنا چاہی، لب ہنوز پیوست رہے۔

کچھ لمحوں کو تاعمر منجمد رہ جانا چاہیے۔ نہ زندگی اس لمحے سے آگے بڑھے، نہ پیچھے۔

"کیا ہوا--" وہ پھر سے کچھ بولنے ہی والی تھی کہ ارمغان نے اس کا ہاتھ تھاما۔وہ ساکت ہوئی۔ارمغان نے اس کی ہتھیلی پر پستول رکھی تھی۔وہ بہت بھاری تھی۔ ایرج کو اپنا ہاتھ کانپتا محسوس ہوا۔

"میری بات کان کھول کر سنو ایرج۔چاہے کچھ بھی ہو جائے۔۔تم یہ دروازہ نہیں کھولو گی۔چاہے میں مر ہی کیوں نہ رہا ہوں۔۔تم یہ دروازہ نہیں کھولو گی۔"

وہ اس کو دونوں شانوں سے پکڑے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو۔مگر کیوں--" وہ سٹپٹا گئی تھی۔

"ایرج۔۔ سوالوں کا وقت نہیں ہے۔۔ میری بات پہ دھیان دو۔۔اس دروازے کو لاک کرو۔اور جب تک میں نہ کہوں۔اسے مت کھولنا۔کسی کے لیے بھی نہیں۔ جب تک میں نہ کہوں، کسی کے لیے بھی یہ دروازہ مت کھولنا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے کہہ رہا تھا۔

"اوکے۔۔" ایرج نے سمجھداری سے سر ہلایا تھا۔مگر اس کی سمجھ کچھ نہیں آیا، وہ ایسا کرنے کیوں بول رہا ہے، ایسا کیا ہو رہا ہے۔۔ وہ کچھ نہیں جان پائی تھی۔

"گریٹ۔ میں جارہا ہوں، میرے پیچھے دروازہ لاک کرو۔ یہ گن تمہاری سیفٹی کے لیے ہے۔اسے چلانے سے کترانا نہیں۔ تمہاری جان بہت قیمتی ہے۔ اگر میں تمہاری حفاظت نہ کر پاؤں، تو تمہیں اپنی حفاظت خود کرنی ہے۔۔ سمجھ رہی ہو نا

ایرج؟'' وہ اسے بغور دیکھتے اس کو تمام تر چیزوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ بس سر اثبات میں ہلاتی رہ گئی۔

وہ کہہ کر، اس کے شانے چھوڑ کر مڑ گیا تھا۔ ایرج کو اپنا وجود بھاری لگنے لگا۔ نجانے کون سا خوف، کس چیز کا خوف دل میں جنم لے رہا تھا۔

وہ دروازے تک پہنچا تھا کہ یک دم پلٹا۔ ایرج اسے ہی دیکھ رہی تھی، کھوئی کھوئی نظروں سے، بہت سے سوال آنکھیں میں بسائے۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ ہاتھ دروازے کہ ہینڈل تک گیا۔

"آئی۔۔۔"اس نے کہنے کے لیے لب کھولے تھے مگر الفاظ نے ساتھ نہ دیا۔اس کی مسکراہٹ ٹوٹ گئی،اس کا اپنا آپ بھی چور ہو گیا۔

"بس اپنا خیال رکھنا ایرج۔"وہ کہہ کر،دروازہ کھول باہر نکل گیا تھا۔دروازہ اندر باہر اندر باہر جھول گیا۔

وہ بے خیالی میں قدم بڑھاتی دروازے تک آئی تھی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

ارمغان سے اس کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔اس نے دھیرے دھیرے لاک لگایا تھا۔پھر وہ بستر تک آئی۔وہاں پڑی پستول کو اٹھاتے اس نے چیک کیا تھا۔

ان میں پوری چھے گولیاں تھیں۔وہ پستول کو واپس رکھ رہی تھی کہ دو گن شوٹس کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

وہ نمک کا مجسمہ بنی تھی۔

....

Four-شکار

وہ تمام لوگ لاہور خیر و عافیت کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔تمام سفر بہت ٹھیک اور کسی بھی شک و وہم سے پاک رہا تھا۔

حیدر کو اب بھی حیرانی ہوئی تھی۔ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ دوروس کو اس کی آنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔اس نے اسے روکنے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا؟وہ آخر کون سی چال چل رہا تھا۔

حیدر اور باقی حوالدار لاہور ائیر پورٹ سے سیدھا اسی جگہ نکلے تھے جہاں انہیں جانا تھا۔

ٹریفک کے باعث انہیں چالیس منٹ لگے تھے شاہی محلہ تک پہنچنے میں۔

''سر۔۔سیدھا وار کرنا ہے؟'' حوالدار پرجوشی سے بولا۔حیدر نے بس اسے سرد نگاہوں سے گھورا تھا۔اس کے ساتھ ارحم کسی اور جہاں میں کچھ سوچ رہا تھا۔

اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جہاں وہ جا رہے ہیں، وہاں بہت خطرہ ہے۔ فریملیس چشمے آنکھوں پہ ٹکے ہوئے تھے۔وہ ذہنی طور پہ ہر پرڈِکشن سے گزر رہا تھا۔

اسے ایرج کی پرواہ تھی۔دوروس سے وہ رابطے میں رہا تھا۔اس نے اسے بتایا تھا کہ ایرج سین سے بالکل اچانک غائب ہوئی ہے۔

اسے پتا تھا کچھ گڑبڑ ضرور ہو گی۔اسے ایرج کی فکر نہیں تھی شاید۔۔اسے ایرج سے خوف آرہا تھا۔اس کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔۔

ان سالوں میں اسے اسی چیز کا تو سب سے زیادہ ڈر تھا۔حانا اور زویا کو وہ اپنا مکمل وقت کبھی نہیں دے پایا تھا۔وہ اپنے پاسٹ سے موو آن نہیں کر پایا تھا۔وہ کرتا بھی کیسے ؟اس نے سب کچھ واضح کرر کھا تھا۔

شاید اس نے بہت بڑی غلطی کردی تھی۔بہت بڑی۔

دو گاڑیاں سفید عمارت کے سامنے آر کی تھیں۔اندر اجالے کا سماں تھا۔شاید یہ ورکنگ آر تھا۔وہ سب گاڑی سے اترے تھے۔

حیدر نے اپنی جیکٹ کو کندھوں پہ درست کیا تھا۔اس کی گہری آنکھیں اندھیرے میں بالکل سیاہ ہو گئی تھیں۔

''ناؤ۔۔سر؟'' دانیہ آنکھوں پہ چشمہ درست کرتے اس کی سامنے آئی تھی۔

''ناؤ۔۔۔دس!'' اس نے پینٹ میں کسی پستول نکالی اور بند دروازے کے لاک پر اس نشانے سے دو فائر کیے کہ صرف لاک ٹوٹ کر گر گیا۔

''ہر طرف سے گھیرو۔جہاں جہاں کوئی بھی دروازہ ہے، وہ پہرے پہ کھڑے ہو۔ دانیہ اور ارحم، تم لوگ میرے ساتھ آو۔ابھی ہم صرف اخلاق کا مظاہرہ کریں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے دروازہ دھکیلتے اندر آیا تھا۔دانیہ بھی مسکرائی۔

البتہ ارحم نہیں مسکرایا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے عمارت کے اندر قدم رکھ دیے تھے۔

....

(کراچی، حال)

''بھئی کب آئے گا اس کا مالک، کب سے دماغ خراب کرر کھا ہے اس ایک بلے نے، پورا گھر سر پہ اٹھار کھا ہے۔'' بڑی باجی معصوم سے بلے کو دیکھ کر بڑبڑاتے کہہ رہی تھیں۔

وہ بلا بے نیازی سے اپنا کھانا کھا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ بھی لیتا۔

''پتا نہیں بڑی باجی کب آئے گا اس کا مالک، کب سے گیا ہوا ہے ناں؟ پہلے جب جاتا تھا تو ایک دو دن میں آجاتا تھا۔'' جھاڑو لگاتی، کمر پہ دوپٹہ باندھے ماسی اپنا کام بھی کر رہی تھیں ساتھ ساتھ بات بھی۔ جتنا مالکن کا دھیان بٹا سکتی تھی، وہ بٹا رہی تھی۔ کونوں کونوں سے جھاڑو کون لے اب بھلا؟

''ہاں بھئی آئے دن منہ اٹھا کہ چل دیتے ہیں بڑے میاں نجانے کہاں۔ اور پوچھو تو اوپر سے ایسی ایسی نگاہوں سے دیکھے گا جیسے بلے کی زمہ داری کے پیسے دے کر ہم

پہ احسان کر رہا ہے۔ ویسے پیسے تو بڑے دے کر جاتا ہے۔'' بڑی باجی ہنستے ہوئے بولیں۔

''ہاں تو باجی ذرا پیسے بڑھا دو ناں میرے، دیکھو کیسے ہاتھ گھس گئے ہیں برتن مانجھ مانجھ کے'' وہ اب جھاڑو چھوڑ کر، اپنی ہتھیلی پھیلائے مسکین سی شکل بنائے باجی سے التجا کرنے لگی۔

''تم تو رہنے ہی دو۔ ایسے بن رہی ہو جیسے پورا پاکستان تم سے ہی تو برتن دھلا واتا ہے۔'' وہ گھور کہ اسے دیکھتیں، پھر کھانا کھاتے بھورے موٹے بلے کو۔ پھر سیب چھیل چھیل کر کھانے لگتیں۔

نجانے اس بلے کے مالک اب کب آنا تھا؟ آنا تھا بھی یا نہیں۔۔۔؟

....

(لاہور، حال)

اب جو ہونے والا ہے۔اس کی لیے زندگی میں کوئی تیار نہیں ہوتا۔زندگی میں کافی اوقات ایسے آتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ ہمیں موت کیسے آئے گی؟ کیا ہم زہر کھا کر مر جائیں گے؟ یا کہیں سے گر کر؟ یا ہمارا قتل ہو جائے گا؟ یا ہم خودکشی کر لیں گے۔۔یا پھر قدرتی موت۔ہم سب موت کی بہت سی پریڈکشنز کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ کیسا ہو گا وہ آخری لمحہ۔۔مگر ہم میں سے کوئی بھی نہیں جان پاتا کہ جب وہ آخری لمحہ آنکھوں کے سامنے رقص کرتا ہے۔تب سب بھول جاتا ہے۔ انسان موت کے لیے جتنا بھی تیار رہے۔۔اسے موت سے خوف ضرور آتا ہے۔وہ

سوچتا ہے کہ کیا میرے اعمال اس قابل ہیں کہ میں جنت میں جاؤں۔یا میرے اعمال اتنے برے ہیں کہ میں جہنم کا مسافر بن جاؤں۔

زندگی مر جانے سے بعض لوگوں کو تکلیف نہیں ہوتی۔مگر روح مر جانے سے ہر ایک انسان کو تکلیف ہوتی ہے۔۔

اور بہت تکلیف ہوتی ہے۔

....

گن شاٹ کی آواز سن کر اس کے قدم خود بخود دروازے کی طرف بڑھے تھے مگر یکدم اس کے کان میں کسی کی سرگوشی گونجی تھی۔

"تم یہ دروازہ نہیں کھولو گی۔۔۔"

اس کے پاؤں زنجیر ہو گئے۔اسے سمجھ نہیں آیا وہ کیا کرے۔اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا مگر پورا وجود کسی ان دیکھے خوف میں ڈھلتا جا رہا تھا۔وہ سکون سے ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھی تھی۔کمرے میں گول گول گول گول گھومتے وہ سوچ رہی تھی باہر کا منظر کیا ہو گا۔ایسا کیا ہوا ہو گا باہر کہ کسی کو فائر کرنے کی ضرورت پڑے۔

اسے ان سب میں صرف ایک شخص کی فکر تھی۔

....

ارمغان اسے دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔اس کے پیچھے باقی تمام لوگ خوف کے مارے لرز رہے تھے مگر وہ بالکل ٹھنڈا پڑا تھا۔وہ تو پہلے ہی مرا ہوا تھا۔

وہ پاکٹ میں ہاتھ ڈالے، سینا چوڑا کیے مین گیٹ کے مقابل بنے کیبن سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ساتھ تارا تھی۔اس کی حالت بھی کچھ خاص نہیں تھی۔وہ بھی ڈری، سہمی ہوئی تھی۔اس نے نگاہ گھما کر دیکھی تو ادھر ادھر سے،الگ الگ جگہوں سے مختلف لوگ برآمد ہو رہے تھے،سب کے ہاتھوں میں پستول تھی،کوئی بھی اپنی وردی میں ملبوس نہیں تھا۔

"ہینڈز اپ۔" حیدر اس کی بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں کا قد برابر تھا۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے میں گڑھی ہوئی تھیں۔ دونوں کا انداز پر سکون تھا۔

"وارنٹ۔" ارمغان نے اسی بے تاثر لہجے میں کہا۔

حیدر نے مسکراتے ہوئے ہاتھ دانیہ کی طرف بڑھایا تو اس نے حیدر کے ہاتھ پہ وارنٹ رکھ دیا۔ حیدر نے وہ وارنٹ ارمغان کے سامنے لہرایا تھا۔

تارا کے پیچھے ایک لیڈی آفیسر آ کھڑی ہوئی تھی تو اسے بھی ہاتھ اوپر کرنے پڑے تھے۔ اس حال میں واحد ارمغان تھا جس کے ہاتھ ہنوز پاکٹ میں تھے۔

''آئیڈینٹٹی۔''ارمغان نے ایک اور مطالبہ کیا تو حیدر اس کی بات پہ ہنسا تھا۔

ارمغان نہیں ہنسا۔

حیدر نے جیب سے آئیڈنٹٹی نکال کر اس کی سامنے کی۔

''ہم یہاں کی تلاشی اور آپ کو سولہ قتل اور اغوا کے کیس میں گرفتار کرنے آئے ہیں۔''حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔کچھ تھا ان دونوں کے انداز میں جو سب کو بہت عجیب لگا تھا۔ان دونوں میں سے کوئی بھی کسی بھی دباؤ کا شکار نہیں تھا۔ایسا لگ راہ تھا دو دوست عرصے بعد مل رہے ہوں۔

ارحم بغور اسے دیکھتے کسی گہری سوچ میں مبتلاء تھا۔وہ شخص دیکھا دیکھا لگ رہا تھا۔
مگر کہاں۔۔۔؟

ارحم دو قدم آگے ہوا تھا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔" حیدر نے بظاہر سپاٹ لہجے میں کہا، مگر اس کی لب آپ بھی مسکرا رہے تھے۔

ارمغان اس کی بات پہ کچھ نہیں بولا البتہ اس کا ہاتھ۔۔۔بہت دھیرے سے۔۔ پاکٹ سے نکل کر بیلٹ تک گیا تھا۔

"میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔" ارمغان نے عام سے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" حیدر نے اسے بغور دیکھا۔

"نہ ہی میں نے کسی کو اغوا کیا ہے۔" اس کا ہاتھ پستول کو چھو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" حیدر کا ہاتھ بھی اپنے گن ہولڈر تک گیا تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے ایک پل کے لیے جدا نہیں ہوئی تھیں۔

چند لمحے ہر سو سناٹا چھا گیا۔ موت سا سناٹا۔ ہر کوئی انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ اور پھر ایک جھٹکے سے دونوں نے ایک دوسرے پہ گن تانی تھی۔

وہاں کھڑے تمام لوگ یکدم الرٹ ہوئے تھے۔ارحم بھی حواس باختہ انہیں دیکھنے لگا۔اس کا ہاتھ بھی اپنی پستول پہ تھا کہ اس نے سر اٹھایا۔

اور اس کی قدموں میں حرکت برپا ہوئی تھی۔وہ تیز قدموں سے بھاگا تھا۔ہر کوئی اس کی حرکت پہ بھوکلایا تھا۔خود حیدر اور ارمغان بھی۔

ان دونوں کا پلین فیل ہو رہا تھا۔

ارحم کہاں جا رہا تھا۔۔۔؟وہ دونوں اس کے زاویے میں دیکھنے لگے تھے کہ سب کی نظر سیکنڈ فلور تک اٹھی تھی۔

گلاس گرل کے پار سکینڈ فلور پہ واحد وجود اس کا تھا۔کسی ملکہ کی طرح وہ شان سے گرل کے قریب کھڑی تھی۔واحد۔اکیلے۔سپاٹ۔

....

بدلہ-Three

اس سے کمرے میں اور برداشت نہیں ہو رہا تھا۔اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں پہ پٹی باندھ دی ہو،وہ سب دیکھ بھی رہی ہو مگر نہیں بھی۔

گول گول چکر کاٹتے نجانے اس کا ہاتھ کتنی ہی بار لاک کی طرف اٹھا تھا۔اور کتنی ہی بار اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

کمرہ وحشت زدہ ہوتا جا رہا تھا۔حبس بڑھ رہا تھا اور پورا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوب گیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں موجود گن اسے بار بار اکسا رہی تھی۔وہ محفوظ تھی۔اس کے پاس ایک عدد پستول تھی،اسے کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔۔؟

اس نے قدم ایک بار پھر دروازے کی طرف بڑھائے، چابی لاک کے اندر گھماتے اس نے تالا پہلی باری میں کھول لیا تھا۔

ایک ہاتھ میں پستول موجود تھی دوسرے ہاتھ میں دروازے کا ہینڈل۔

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا تھا۔دروازہ اندر کی جانب دھکیل کر وہ خود باہر آئی تھی۔کمرے کے عین سامنے ایک راہداری تھی جس کے نیچے مین ہال کا منظر نمایاں ہوتا تھا۔اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ساتھ ساتھ تجسس میں قدم بھی اٹھ رہے تھے۔وہ راہداری پار کرتے گلاس گرل کے سامنے آئی تھی۔ نیچے کا تمام منظر اس کی آنکھوں پہ عیاں ہوا۔

تمام لوگ گراؤنڈ فلور پہ بکھرے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ پر ہٹے کٹے بندے پستول لے کر کھڑے تھے۔اور ان سب کے بیچ وہ کھڑا تھا۔کسی شخص پر پستول تانے۔

ایرج کا دل دھک سے رہ گیا۔اس نے چلانے کی کوشش کی مگر آنکھیں کہیں اور گھوم گئیں۔

وہ منجمد ہوتے اسے دیکھ رہی تھی۔اس انجان شخص کے پیچھے وہی کھڑا تھا۔اسے دیکھتے ایرج کا دل ہر بار کی طرح اس بار بھی ایک دھڑکن مس کر گیا تھا۔

وہاں ارحم کھڑا تھا۔۔وہ لب بھینچے اسے دیکھے گئی۔ہاتھ میں موجود پستول بہت بھاری لگنے لگی تھی،اسے تو اپنا ذہن بھی بھاری لگنے لگا تھا۔۔۔

وہ آج بھی انہیں فریم لیس چشموں کو چہرے پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ مگر آج وہ اس کی طرف وہ کشش برپا نہیں کر پایا تھا جو وہ ہر دفعہ کر لیتا تھا۔وہ ایک لمحہ تھا جب ایرج

اس کی طرف مائل ہوئی تھی،اور وہ لمحہ ایک لمحہ بن کے ہی گزر گیا تھا،ہر بار کی طرح سال نہیں بنا تھا۔

اسے ارحم سے گھن نہیں آئی تھی،اسے خود سے گھن آئی تھی۔اسے ان تمام وقتوں سے گھن آئی جب جب وہ اس کی کشش کے حصار میں پاگل ہو جایا کرتی تھی۔جب جب وہ اپنی دوستوں کو اس کی بارے میں بتایا کرتی تھی۔جب جب وہ تاریک راتوں میں آلتزر کو ڈھونڈتی تھی۔اسے اپنی زندگی سے نفرت سی محسوس ہوئی۔

اس نے تو اپنی زندگی تباہ کردی تھی۔

اس کا پستول والا ہاتھ اٹھا تھا،مگر پھر گر گیا۔اس کے وجود پہ لرزہ طاری ہو گیا۔وہ اسی کو دیکھ رہی تھی،بغیر پلک جھپکائے جب اس نے بھی یکدم ایرج کی جانب

دیکھا۔۔ان دونوں کی آنکھیں ملی تھیں۔وہ اس کی آنکھوں میں چمک دیکھ سکتی تھی۔

اور پھر اگلے ہی لمحے ارحم اس تک بھاگا تھا۔

....

ارمغان ارحم کے پیچھے جانے لگا تھا کہ حیدر نے اسے بازو سے پکڑا۔

''چھوڑو مجھے۔'' وہ پہلی بار حلق کے بل دھاڑا تھا۔حیدر پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔

''آئی سیڈ لیو!'' وہ جان لگاتار ارحم کے پیچھے جانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

''ارمغان۔۔کام ڈاؤن۔'' حیدر نے بغور اسے دیکھتے کہا۔

''کیسے کام ڈاؤن۔۔وہ۔۔وہ اس کے پیچھے جا رہا ہے۔ایرج کو خطرہ ہے۔۔ چھوڑو مجھے!'' وہ واپس اس سے خود کو چھڑوانے کی کوشش کر رہا تھا۔اس کی آنکھیں ہنوز ایرج اور ارحم کو دیکھ رہی تھیں۔

سب ہی ان دونوں کو فرسٹ فلور پہ دیکھ رہے تھے۔وہ دو لوگ کسی بحث میں ملوث لگ رہے تھے۔

ارمغان کی چھٹی حس اسے ایک چہرے کا اشارہ دے چکی تھی۔۔وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ ایرج تک جانا چاہتا تھا۔

"حیدر پلیز! لیٹ می گو!" اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ حیدر نے اسے کیوں تھاما تھا۔ اس نے حیدر کو کاٹ کھانے والی نظروں سے دیکھا، حیدر کی ٹھنڈی نیلی آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا۔ارمغان نے دوسرے ہاتھ سے اس کے سینے پہ مکا مارا تو حیدر یکدم ہونے والے حملے پر اسے چھوڑ کر پیچھے کو ہوا۔

اس کی گرفت سے ارمغان نکل چکا تھا۔اور ارمغان کے قدم زمین پہ نہیں ٹکے تھے۔۔وہ دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پہ آیا تھا کہ سنسان سے ہال میں گن شاٹس کی آوازیں گونج اٹھی تھیں۔

ارمغان کو لگا اس کا دل بند ہو گیا ہے۔

کسی فلم کے سلو موشن سین کی طرح وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ہر زینے پہ دل دھڑکنے کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔دماغ پھٹ رہا تھا۔

اوہ گاڈ۔۔ نہیں۔۔۔

اس کی آنکھوں میں وحشت طاری تھی۔۔وہ اس منظر کے لیے تیار نہیں تھا جو سیڑھیوں کے پار اسے دکھنے والا تھا۔

(''تمہارے گھر پہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے ایک سوال پوچھوں گی۔'')

اس کے جملے وہ واحد آواز تھے جو اس کی ذہن پہ طاری تھے۔

جوتے سفید ٹائلز پہ گھس رہے تھے۔

(''تم پہ زندگی بہت جچتی ہے' ارمغان)

وہ ایک ایک کر کے زینہ چڑھ رہا تھا۔چاہ کر بھی اس کے قدم ایک وقت میں دو زینے پار نہیں کر پائے تھے۔۔

(''میں محبت کے قابل نہیں ہوں'')

سانسوں کی مالا ٹوٹ کر بکھر رہی تھی۔

(”سمجھ نہیں آئے ہو، شاید۔۔۔“)

اس نے بلآخر آخری زینے پہ پاؤں رکھ دیا۔

اور اس نے شدت سے چاہا تھا کہ وہ آخری زینہ کبھی نہ آتا۔ وہ ہمشہ سیڑھیاں چڑھتا رہتا۔

ایرج کا چہرہ سرخ خون میں بھیگ چکا تھا۔ اس کی بالوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

وہ اس کی طرف بھاگا۔

....

ارحم اس کی طرف سیڑھیوں پہ قدم اٹھا رہا تھا۔ایرج کی نگاہیں ارحم کے وجود سے چپکی رہیں۔اس نے ارحم کے وجود کا تعاقب کیا تھا یہاں تک کہ وہ راہداری کے کونے پہ اسے کھڑا نظر آیا تھا۔

اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔۔وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ایرج تک آ رہا تھا۔

ایرج نے اسے دیکھا، پھر اس کے بڑھتے قدم کو۔اس کے ذہن میں وحشت اور خوف پھیل گیا۔اسے ارحم سے ڈر لگا تھا۔

ارحم چند فاصلے پر اس کے سامنے آرکا تھا۔۔ایرج کی ہاتھ میں موجود پستول پہ گرفت مضبوط ہوئی تھی۔اس نے پستول دوپٹے کے اندر چھپا رکھی تھی۔

"اوہ گاڈ! شکر اللہ کا تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔۔اوہ مائے گاڈ۔۔" وہ اسے بے یقینی سے دیکھتا سر پہ ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔اور ایرج اسے ویران آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی۔

"میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا ایرج۔۔میں اتنا پریشان ہو گیا تھا۔۔" وہ اب فکرمندی سے بتا رہا تھا۔آنکھوں میں وہ چمک اب بھی ٹھہری ہوئی تھی۔

کیا اس کی فکر مندی سچی ہے؟ ایرج نے سوچا تھا۔

کیا اس نے واقعی اسے ہر جگہ ڈھونڈا تھا؟

(”تم التئیر ہو، ایرج۔“)

ایرج کی پستول پہ گرفت ہنوز ویسے ہی رہی۔ ذہن پھر الجھ رہا تھا۔۔ پہلی بار اس کے دل کی جگہ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

''میں بالکل پاگل ہو گیا تھا ایرج۔۔آئی کانٹ ٹیل یو۔'' وہ بار بار ایک ہی جملہ بولے جا رہا تھا۔اور ایرج کا ذہن کسی شاخ میں اٹک رہا تھا۔اسے ارحم کے جملے پر خلوص بھی لگ رہے تھے اور ان سے نفرت بھی ہو رہی تھی۔

(''میں نے تمہارے بارے میں کبھی ایسے نہیں سوچا۔'')

''چلو ایرج۔۔ہم گھر چلیں۔۔سب تمہارا کتنا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ دو قدم آگے ہوا تو ایرج کے دو قدم خود بخود پیچھے ہوئے۔ارحم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''لیٹس گو ٹو آر ہوم۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ایرج کو کندھے سے لگانا چاہا تو ایرج کا ہاتھ یکدم اس کی چہرے پہ ثبت ہوا تھا۔

”دور رہو مجھ سے گھٹیا انسان!“ وہ غرائی تھی۔البتہ اس کا دل،اس کا وجود کسی مرتی مچھلی کی طرح کانپ رہا تھا۔

ارحم کا جسم،ارحم کے لب۔۔۔سب بالکل ساکت ہو گئے۔۔وہ ہاتھ اپنے گال پہ رکھے بے یقینی سے ایرج کو دیکھ رہا تھا۔اس نے بولنے کے لیے لب کھولے مگر ایرج نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”مجھے شرم آتی ہے تمہیں اپنا۔۔۔کزن کہتے ہوئے۔ تمہیں تو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے تھا.“ایرج دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

''تم نے ایک نہیں۔۔دو نہیں۔۔ تم نے چھ لوگوں کی زندگیاں برباد کر دیں ارحم۔۔ تمہیں۔۔ تمہیں مر جانا چاہیئے!'' وہ ایک اور قدم پیچھے ہوئی۔وہ کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔وہ جملے نجانے کیسے اس کی منہ سے نکل رہے تھے۔۔ نجانے وہ ہمت اس میں کہاں سے در آئی تھی۔

''ایرج تمہیں کوئی غلط فہمی---''ارحم ضبط کرتے آگے بڑھا تھا مگر وہ یکدم پھر سے پیچھے ہوئی۔کسی دوایک جیسے مقناطیس کی طرح۔

''دور رہو مجھ سے۔۔مجھے تم سے گھن آرہی ہے،شدید نفرت ہو رہی ہے۔۔۔ تم مجھے اس بار بے وقوف نہیں بنا سکتے۔۔ تم اس بار مجھے استعمال نہیں کر سکتے۔۔'' اس نے بے ساختہ پستول لوڈ کی تھی۔لہجے کی جان ہاتھوں میں آنے لگی تھی۔

ارحم پستول لوڈ ہونے کی آواز پہ اپنی جگہ ٹھہر گیا۔اس نے بے یقینی سے ایرج کو دیکھا تھا۔اور پھر اس کی چہرے پہ منحوسیت طاری ہوئی تھی۔

"سچ آ لٹل بچ یو آر!"اس نے ایرج کو گالی دیتے ہاتھ اپنی بیلٹ میں کھلی پستول تک پہنچایا تھا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

ایرج نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے تھامتے، نشانہ فوکس کرتے بے ہنگم سے فائر کئے تھے۔

ایک،

دو،

تین،

چار،

پانچ،

چھے۔۔۔

ایک کے بعد ایک فائر ہوتے گئے تھے۔۔ایرج کا ہاتھ سن ہو گیا تھا۔ ہتھیلی کی جلد پھٹ گئی تھی۔ گولیاں پستول سے نکلتے ارحم کے جسم میں پیوست ہوتے اس کے جسم کو چھلنی کر گئی تھیں۔اس کا جسم ہر فائر پہ جھنجھوڑ گیا تھا۔وہ دھچکا کھاتے ہوئے زمین پہ گرتا چلا گیا۔ مگر ایرج نے پستول پہ ہاتھ نہیں روکا تھا۔۔وہ بے جان فائیر کرتی گئی، مگر اب کوئی گولی نہیں نکلی تھی۔ایرج کا پورا چہرہ ارحم کے سرخ سیال میں بھیگ گیا تھا۔ تھوڑی کے نیچے سے خون ٹپک ٹپک کر زمین میں بھسم ہو رہا تھا۔

بال خون میں رنگ گئے تھے۔اس کا پورا جسم خون کا غسل کر گیا تھا۔آنکھوں میں سرخ سا پانی گیا تو اس کی پھٹی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔وہ آنکھیں بند ہوتے زمین سے جا لگی تھی۔اس کا ذہن تاریک ہو رہا تھا۔

جو آخری بات اس نے سوچی تھی وہ ارحم کا قتل تھا۔۔اس نے قتل کر دیا تھا۔۔اس نے گناہ کر دیا تھا۔۔

وہ آنکھیں بند کرتے تاریک جہاں میں گم ہو گئی تھی۔بے ہوش ہونے سے پہلے اسے خود پہ کسی کی انگلیوں کے لمس محسوس ہوئے تھے۔

وہ زخمی سا مسکرائی۔اس نے اپنے آپ ہار مان لی تھی،کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے اب خود کی حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں۔۔وہ آگیا تھا۔وہ ہمیشہ آجاتا تھا۔

....

آخری زینے سے راہداری پار کرتے اسے دو پل بھی نہ لگے تھے۔اس کی آنکھوں میں،اس کی ذہن میں اور اس کی دل میں ایرج کے اس خون آلود چہرے اور جسم کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

وہ تقریباً بھاگتے ہوئے آناًفاناً اُس تک پہنچنے کی کوشش میں تھا کہ اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔وہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے کو ہوا۔اس نے اپنے پیروں کے نیچے دیکھا۔

وہ ارحم کی بے جان، چھلنی ہوئی لاش تھی۔اس نے اپنے جوتے اس کے منہ کے قریب کیے۔ارمغان کے آنکھوں میں وہ سارے منظر دوڑ گئے تھے۔

اس نے جوتوں کے نوک سے اس کی چہرے پہ لات ماری تھی۔اور اس کی لاش پھلانگتا وہ ایرج تک آیا۔گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے اس نے ایرج کا ہاتھ نرمی سے دبایا تھا۔خون روکنے کی کوشش۔اس نے ایرج کی سانسوں کو چیک کیا۔ سانسیں چل رہی تھیں۔

وہ فوراً اسے گود میں اٹھاتے کمرے میں لایا تھا۔اور چلاتے ہوئے ایڈ کا انتظام کرنے کو کہہ رہا تھا۔جیسے وہاں ارحم کی لاش موجود ہی نہیں تھی۔

تمام لوگ اس ایک کمرے کے باہر جمع ہو رہے تھے۔

حیدر اور دانیہ اور اس کے گارڈز اسی کے ساتھ کھڑے رہے۔

"سر یہ کیا ہو گیا۔۔۔؟" وہ ششدر اڑی اڑی نگاہوں سے حیدر کو دیکھنے لگی۔

"یہی ہونا تھا۔البتہ ارحم کو ایرج نے مار دیا۔مرنا ارحم کو ہی تھا۔بس ایسے نہیں۔" وہ کہتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھا تھا۔اس کے پیچھے پیچھے دانیہ بھی آئی تھی۔

وہ دونوں راہداری کے درمیان رک کر ارحم کی باڈی کو دیکھنے لگے۔حیدر نے پیچھے کھڑے اپنے ساتھی کو دیکھا تو وہ سمجھداری سے سر ہلاتا ارحم کی باڈی کو اٹھانے لگا تھا۔

وہ دونوں ایرج کے روم کی جانب بڑھ گئے۔

....

کمرے سے سب کو باہر نکلنے کا حکم دیا جاچکا تھا اسی لیے سب فکر مندی چہرے پہ سجائے کمرہ خالی کرتے رہے۔ حیدر جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، کمرہ خالی ہونے پر اندر چلا آیا۔ تارا اسے چاہ کر بھی روک نہیں پائی۔ دانیہ کمرے کے باہر ہی ٹھہر گئی تھی۔

ایرج کا وجود بیڈ پہ لیٹا ہوا تھا۔ہاتھ پہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور دوسری ہتھیلی سے کنولا جڑ کر آئی وی بیگ تک جا رہا تھا۔

ارمغان اس کے سامنے کرسی پہ بیٹھے، دونوں ہاتھوں کی مٹھی لبوں پہ جمائے اسی کو یک ٹک دیکھ رہا تھا، ہر چیز سے پرے، کسی بھی شخص سے بے نیاز۔

حیدر چھوٹے چھوٹے قدم چلتا اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔پھر اس نے ہاتھ اس کی کاندھے پر جمایا۔ارمغان نے کوئی حرکت نہیں کی۔نہ ہی حیدر کچھ بولا تھا۔اس کے شانے کافی ٹینس لگ رہے تھے۔وہ خود بھی۔

''کیوں آئے ہو میرے پیچھے۔''چند لمحوں کی خاموشی کو ارمغان کے سرد لہجے نے توڑا تھا۔

"تم سے ملنے۔" حیدر نے مدھم سا کہا۔اس کی آنکھیں ارمغان پہ ہی مرکوز تھیں۔

"مجھے اریسٹ کرنے نہیں آئے تھے؟" ارمغان نے ایک اور بات پوچھا۔

"اریسٹ کرنے آرہا تھا۔ مگر پھر النساء نے سب بتادیا مجھے۔" اس نے ارمغان کے شانے تھپتھپائے۔

چند منٹ اس سین کو، اس کمرے کو یہیں چھوڑتے ہیں اور واپس کراچی کی طرف اپنا زاویہ موڑتے ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ حیدر کے سامنے النساء کھڑی ہے۔ وہ

اسے کچھ بتانا چاہتی ہے۔وہ حیدر سے دو قدم دور کھڑی ہے اور اس کی زبان الفاظ کو ترتیب دینے سے کترا رہی ہے۔۔۔

(کراچی،چند گھنٹوں پہلے)

حیدر اسے نا سمجھی سے دیکھتا رہا تھا۔اسے ایسا کیا بتانا تھا حیدر کو؟اسے تجسس ضرور ہوا تھا۔

"اس دن جب میں ہسپتال میں ایڈمٹ تھی۔۔"اس کی لہجے میں عجیب سی ہچکچاہٹ تھی۔

"اس دن میں نے "دوروس" کا نام لیا تھا۔۔اس کی بات پہ حیدر نے سر ہلا دیا۔

ہاں۔۔اس نے دوروس کا نام لیا تھا۔

"مگر اس نے میرے ساتھ کچھ نہیں کیا تھا۔۔اس نے تو۔۔۔اس نے تو مجھے ریسکیو کیا تھا۔۔"النساء کا سر جھک گیا۔۔۔اور حیدر دو قدم پیچھے ہوا تھا۔اس کی پشت ٹیبل سے جا لگی تھی۔

"اس نے مجھے وہیں اس لیے چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا آپ اس راستے سے ضرور گزریں گے۔"وہ اب ہر راز سے پردہ اٹھا رہی تھی۔

"اس رات آپ جس دوست کے یہاں جا رہے تھے۔۔وہ میسج دوست نے نہیں کیا تھا۔۔وہ ارمغان نے کیا تھا۔۔"

وہ بے دم سا رہ گیا تھا۔آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔آنکھوں میں بے یقینی در آئی تھی۔

''اس نے وہ نوٹ اس لیے وہاں چھوڑا تھا تاکہ آپ اس پر شک کریں۔۔اس نے مجھے اسالٹ ہونے سے ریسکیو کر کے کلوروفارم سے بے ہوش کر دیا تھا۔۔''اس کے الفاظ سے اس کا ذہن گھوم رہا تھا۔۔

''میں نے دوروس کا نام اس لیے لیا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ میں اسی کا نام لوں۔۔۔''
النساء کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔اور حیدر کی آنکھوں میں بے یقینی۔۔

"کیونکہ۔۔۔جس کو گرفتار کرنے آپ لاہور جارہے ہیں۔۔وہ آپ کے ڈرائنگ روم میں اس وقت موجود ہے۔"النساء نے ہاتھ مسلتے کہا۔حیدر کے ایک لفظ سمجھ نہیں آیا تھا۔اسے بس ایک چیز یاد آئی تھی۔

اللہ نے اس کی دعا شاید سن لی تھی۔

"مجھے بے ہوش کرنے سے پہلے اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی، حیدر۔۔اس نے کہا تھا کہ میں اس کا نام لوں۔۔کیونکہ میری دوست (ایرج) اس کے قبضے میں ہے۔۔"اس کی آنکھیں اب بھیگ رہی تھیں۔

"مجھے لگا تھا کہ اصل اغوا کار وہ ہے۔۔ مگر در اصل اس نے مائنڈ گیم کھیلا ہے حیدر۔۔اسے ارحم اپنے پاس چاہیے۔ایک لیگل طریقے سے۔۔"النساء نے سر اٹھا کر حیدر کو دیکھا تھا۔

"شاید ایرج اسی کے پاس ہو، مگر بالکل محفوظ۔۔شاید وہ وہ نہیں ہے جسے ہم اب تک کچھ سمجھ رہے تھے۔۔"

حیدر نے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے آنکھیں مسلی تھیں۔

(لاہور، حال)

"وہ اریسٹ وارنٹ؟" اس نے ایک بار پھر پوچھا۔ وہی سرد لہجہ برقرار تھا۔

"جعلی تھا۔" حیدر نے پھر سے اسے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

"ارحم کو کیوں لائے تھے۔" اس نے اب سر اٹھا کر حیدر کو دیکھا تھا۔ آنکھوں میں شک تھے، شبہات تھے۔

"تم نے کہا تھا۔" حیدر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ارمغان نے آگے سے کچھ نہیں بولا تھا۔ اس نے سر واپس جھٹک دیا۔ آنکھیں پھر سے اس بے ہوش وجود پہ جم گئی تھیں۔

"ڈو یو لو ہر؟" حیدر نے چند منٹ کی توقف سے پوچھا۔ لہجہ اب بھی نرم تھا۔

"آئی ڈو۔" اس نے اعتراف کیا۔ حیدر نے لمبی سانس خارج کی۔

"بہت بڑا رسک ہے یہ، مجھ سے بہتر تم جانتے ہو۔" حیدر نے اس کا کندھا مسلا۔

"رسک لے چکا میں حیدر، بہت پہلے سے۔" وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

"تمہیں اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔" اس نے ایک نظر اٹھا کر بھی ایرج کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نظریں ارمغان پہ ہی جمی ہوئی تھیں۔

"میری جان تو کچھ ہے ہی نہیں، حیدر۔۔ میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جس سے تم ایرج کا موازنہ کر سکو۔" وہ زخمی سا مسکرایا۔ حیدر اداس ہوا تھا۔

"میں باہر ہی ہوں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، مجھے بتانا۔" وہ کہہ کر پلٹنے لگا تھا کہ ارمغان کی آواز پہ رکا۔

"گلے نہیں لگاؤ گے دوست کو؟" حیدر یکدم پلٹا تھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا، ارمغان اس کے گلے سے لگ چکا تھا۔ وہ منجمد سا کھڑا رہا۔ پھر اس نے ارمغان کی پیٹھ کو تھپتھپایا تھا۔

"شکریہ!" ارمغان اب بھی ویسے ہی کھڑا تھا۔

وہ دونوں چند لمحوں بعد جدا ہو گئے۔ حیدر اسے دیکھتا رہا۔

''فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس کی بات پہ ارمغان نے محض سر ہلا دیا۔

حیدر بھی جانتا تھا اب کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا تھا۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ اسے ارحم کی باڈی کو دفن بھی کرنا تھا۔ ایرج کے روم سے وہ باہر نکلا تو سامنے اندھیر راہ داری میں واحد اس کا وجود سیاہی میں ڈوب چکا تھا۔ اس نے دونوں اطراف طائرانہ نگاہ دوڑائی تھی۔ راہ داری کے دونوں اطراف شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں بنائی گئی تھیں۔ وہ بغور اس بند کھڑکی کو دیکھنے لگا۔ اسے نجانے کیوں احساس ہوا تھا کہ کوئی

اسے دیکھ رہا ہے۔ سر جھٹکتے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے کافی سارے کام نپٹانے تھے، یہاں واپس بھی آنا تھا۔

••••••••••

وہ دونوں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ خاموشی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ گھر پہ ان دو کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ سوائے چمچ کے پیالوں پہ ٹکرانے کی آواز کے کوئی اور شور برپا نہیں ہوا تھا۔ سارہ سر جھکائے لقمے لے رہی تھی جب سعد نے پوچھا تھا؛

"ارمغان کی موت کیوں یقینی ہے' سارہ آپی؟"

اس کی یوں سوال کرنے پہ سارہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یقینی نہیں ہے۔۔ مگر یہی دستور ہے شاید۔" سارہ نے اداس لہجے میں کہا تھا۔

"کیسا دستور۔۔؟" سعد نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔

"کلائنٹ کا حکم ماننا حق ہے۔اس کی علاوہ کوئی چارہ نہیں۔اور آپ کلائنٹ کے ساتھ ڈبل گیم نہیں کھیل سکتے ہیں، کلائنٹ کو آپ کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔اور یہاں ارحم ارمغان کا کلائینٹ تھا۔ارمغان نے دونوں رولز توڑے ہیں۔۔وہ ارحم کو مارنا چاہتا ہے۔۔اور اگر اس نے ارحم کو مار دیا۔۔تو سنڈیکیٹر اسے بھی نہیں چھوڑے گا۔" سارہ نے آسان لفظوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''سنڈیکیٹر کو ہم توڑ نہیں سکتے ہیں؟ ہم سنڈیکیٹر کو ہرا بھی تو سکتے ہیں۔۔''سعد نے ایک اور سوال سارہ کے سامنے پیش کیا تھا۔اس کی لہجے میں ارمغان کے لیے صاف فکر مندی تھی۔

''سنڈیکیٹر سے کوئی لڑ نہیں سکتا ہے'سعد۔جو اس کی خلاف آواز اٹھائے گا،وہ مر جائے گا۔یہی دنیا کا دستور ہے۔ہم سب روز اینڈ کالمز میں پھنسے ہوئے ہیں۔۔ہم سب بھی تو میٹرکس کی قید میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔۔

ہم سب بہت سے ایسے راز چھپائے ہوئے ہیں جو کہ جاننے کے بعد دنیا بھر میں ممالک کی جنگیں شروع ہو جائیں۔نائن الیون کا راز، فیمینسٹ موؤمنٹ، میسوژنی،الیومناٹی،ایل جی بی ٹی کی مہم اور پیڈوفیلیا۔یہ سب سنڈیکیٹر کے راز ہیں۔

لل ناز، سیم اسمتھ، بلی آئلیش، ٹریوس اسکاٹ، ٹیلر سوئفٹ، بی ٹی ایس، بلیک پنک، ویکنڈ، لاناڈیل رے اور نجانے کتنے ہی گلوکار اور اداکار ایسے ہیں جو شیطان کو خود کی روح بیچ چکے ہیں، جن کی شہرت سے سیہ ٹینسٹ کا لنک جڑتا ہے۔

ہم عام شہری دنیا کا صرف 0.5 پرسنٹ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ہم سب الیومیناٹی اور سیہ ٹینسٹ کے غلام بنتے جارہے ہیں۔ جو کہ عنقریب دجال سے کنیکٹ کر جائے گا۔ ہمارا ایمان اسی لیے کمزور ہوتا جارہا ہے کیونکہ ہمارے پاس انٹرنیٹ کی سہولت ہے۔ کسی بھی مذہب میں شیطان صحیح نہیں ہے۔ تو بات اسلام اور عیسائیت کی نہیں ہے، بات عالمی جال میں پھنس جانے کی ہے۔ جو شیطان کا کلٹ قبول کر لیتا ہے، وہ آج شہرت اور پیسے کے عروج پہ ہے، لوگ اسے جانتے ہیں،

پسند کرتے ہیں۔۔۔اور جو اس سب کو قبول نہیں کر پاتا، وہ دنیا کے زوال کے قریب۔۔

ہمیں لگتا ہے دجال سے بچنا اتنا بھی کٹھن نہیں ہو گا۔ مگر اب کی دنیا کو دیکھا جائے تو سمجھ آتا ہے کے دجال کے پیروکار دنیا کا نقشہ بدل رہے ہیں تو پھر دجال کا فتنہ کیا کیا نہیں کرے گا۔۔؟

میٹرکس کو کوئی توڑ نہیں پاتا ہے، سعد۔ اور کوئی اس کے آگے بڑھنا بھی نہیں جانتا۔۔ مگر جو جانتا ہے۔۔ وہ مر جاتا ہے۔۔

اور سنڈیکیٹر کو مات دینا ایک شخص ضرور جانتا ہے۔۔

ارمغان۔۔!

تو تم دعا کرو سعد کہ ارمغان اس جنگ سے خود کو خود ہی الگ کر لے۔۔کیونکہ اگر وہ جیت بھی گیا۔۔تب بھی وہ ہار جائے گا۔“

سارہ جو مختصر بات کرنے کا سوچ رہی تھی، پورا لیکچر دے کر وہاں سے وہیل چیئر گھما گئی تھی۔

سعد میز پہ اکیلا رہ گیا تھا۔ ناکارہ۔ وہ پلیٹ اٹھائے کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے سارہ اور اپنی پلیٹ دھوئی اور عشاء کی نماز کے لیے وضو بناتے وہ جائے نماز لے کر اکیلے کمرے میں آگیا۔

چار فرض کی نیت کرتے اس نے نماز شروع کر دی تھی۔ اسے آج ایک طویل نماز کے بعد ایک طویل دعا کرنی تھی اپنے رب سے۔

اور پھر وہ رب ہی تو ہوتا ہے جو سب آسان کر دیتا ہے۔ وہ رب ہی تو ہوتا ہے جو سب کی مشکلات میں سب کی سنتا ہے۔

••••••••••••

پہلی بار جب اس کی آنکھ کھلی تو آنکھوں میں پانی نے سب دھندلا کر دیا۔ اسے بس کچھ سفید سی جھلک نظر آئی۔

....

دوسری دفعہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے سر کے اوپر گھومتا پنکھا دکھائی دیا۔ آنکھوں اور منظر کے ارد گرد سب سفید تھا۔ موت جیسا سفید۔

وہ جانتی تھی وہ کہاں ہے مگر وہ اس حالت میں کیسے آئی تھی؟

بے حد تکلیف کے باعث اس نے آنکھیں پھر موند لیں۔

•••••••••••

تیسری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے نرم ہوا کا احساس ہوا۔ جیسے اس کا پورا جسم کسی بادل کے پیالے میں سفر کر رہا ہو۔ اس نے آنکھوں کو اوپر، نیچے، دائیں، بائیں گھمایا۔ اسے اس سفید کمرے میں، اپنے سامنے۔۔ایک سیاہ وجود کی جھلک نظر آئی۔
وہ کیا تھا؟ کوئی سایہ؟ کوئی وہم؟ یا کوئی شخص؟

وہ زندہ تھی؟ کیسے زندہ تھی۔؟

اس نے آنکھیں پھر موند لیں، مگر اب دماغ جاگ رہا تھا۔

....

چوتھی بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے منظر صاف دکھائی دیا۔ سیلنگ سے لٹکا پنکھا سست رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر اس نے خود پہ اوڑھی سفید چادر کو دیکھا۔ کیا وہ کفن تھا؟ کیا وہ مر چکی تھی؟

اس نے آنکھوں کو ایک بار اور جھپکا، پانی کی ایک بوند آنکھ سے بہہ کر کان کی لو میں چلی گئی۔ اس نے اپنے پاؤں کو ہلانے کی کوشش کی، وہ کامیاب رہی۔ مگر اس کے ہاتھ اور بازو میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔ ہاتھ پہ سفید پٹی بندھی تھی، دوسرے ہاتھ سے سوئی جڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔

اسے اپنے قریب آہٹ سنائی دی۔اس نے آنکھیں گھما کر دیکھنا چاہا، مگر آنکھوں پہ بوجھ تھا۔کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔۔اس نے آنکھیں ایک بار پھر موند لیں۔

....

پانچویں بار جب اس کی آنکھ کھلی تو حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی جھلکیاں بھی ذہن میں ابھرنے لگیں۔وہ کہاں تھی، جانتی تھی،اس کے ساتھ آخری دفعہ کیا ہوا تھا، اسے یاد آنے لگا تھا۔

راہداری، پستول، گن شاٹس، خون، بدبو، سیاہی، درد، زخم۔۔

ایک درد کی ٹھیس دماغ اور ہاتھوں کی رگوں میں دوڑ اٹھی۔۔اور اسے یاد آنے لگا۔ آخری بار جب وہ ہوش میں تھی تو اس نے کسی پہ فائر کیا تھا۔۔۔اس کے سامنے کچھ ہوا تھا تو وہ ایک قتل تھا۔۔جو اس نے کیا تھا۔۔وہ حادثہ نہیں تھا۔۔وہ قتل تھا۔

مگر اس سے پہلے کیا ہوا تھا۔۔اس نے کس کو گولی ماری تھی؟

اس کے ماتھے پہ لکیریں ابھری تھیں۔اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"تم نے۔۔۔۔زندگی۔۔۔۔تباہ۔۔۔۔ارحم"

اس کی آنکھیں ایک بار پھر کھلیں۔

"گھٹیا۔۔۔۔سعد۔۔۔۔ارمغان۔۔۔۔ارحم"

اس کی آنکھیں ایک بار پھر بند ہو گئیں۔

"پستول۔۔۔۔گولی۔۔۔۔خون۔۔۔۔ارحم"

اس کی آنکھیں ایک بار پھر کھلیں۔تکیے سے سر اٹھا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔
اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

"قتل۔۔۔۔خون۔۔۔۔ہوس۔۔۔۔ارحم۔۔۔؟"

اس کا وجود بخار میں تپ رہا تھا۔ جسم کھول رہا تھا۔اس نے اپنا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو درد سے کراہ نکلی۔ مگر اب کی بار اس نے برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔۔

اس کی نظریں اس پہ گئیں،وہ اسے جانتی تھی،وہ اسے پہچان سکتی تھی،وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ سکتی تھی۔وہ اس کی آنکھوں میں بھڑکتی آگ بھی دیکھ سکتی تھی۔

"دوروس۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔ارمغان"

”ارمغان۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔۔سروائور“

پھر اس کی سانسیں چند پل کو ٹھہر گئیں۔

....

عشق-Two

اس کی آنکھیں کبھی کھل رہی تھیں، کبھی بند ہو رہی تھیں۔اور ارمغان دم سادھے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔اچانک ہی اس کی آنکھوں میں نمی امڈ آئی تھی۔۔

اسے ایرج پہ غصہ آیا تھا۔

مگر وہ ایرج پہ غصہ کیسے کر سکتا تھا؟

وہ بس اس پہ آنکھیں مرکوز کیے اسے دیکھتا رہا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے بیٹھنے میں سہارا دیا۔ڈرپ ختم ہو گئی تھی اسی لیے اس نے احتیاط سے سوئی کنولا سے الگ کر دی۔ایرج بغور اسے دیکھ رہی تھی۔وہ خاموشی سے ہر کام کر رہا تھا۔اس نے کوئی بات نہیں کی۔۔ایرج اداسی سے مسکرائی۔

"بات بھی نہیں کرو گے مجھ سے؟" وہ جھکا ہوا تھا،ایرج نے بمشکل اس کی شرٹ تھامی۔اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔اب وہ احتیاط سے ایرج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے،اس کا کنولا نکال رہا تھا۔سوئی جدا کرتے ایرج کے منہ سے دبی دبی سی کراہ نکلی۔

''درد تو نہیں ہوا؟''اس نے سنجیدہ لہجے میں سوئی نکال کر اس سے پوچھا۔ایرج نے سر نفی میں ہلا دیا۔وہ اب سوئی کو ڈسٹبن میں پھینک رہا تھا۔

''ارمغان۔''ایرج نے بغور اسے دیکھتے کہا۔سر میں درد اٹھ رہا تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ بات بھی نہ کر سکے۔مگر ارمغان نے اس کو نظر انداز کیا تھا۔

وہ اٹھ کے جانے لگا تھا کہ ایرج نے ایک اور بار اس کی شرٹ تھامی تھی۔اس بار اس نے ہاتھ نہیں جھٹکا۔بس آنکھیں میں غم و غصہ لیے اسے دیکھتے رہا۔

''مجھے پتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو۔۔''ایرج نے اس کی آنکھوں کو بغور پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

''میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتا،ایرج۔''اس کی بات نے ایرج کے تمام لفظ چھین لیے۔

''مگر میں نے تمہیں ایک چیز سے منع کیا تھا تو کسی وجہ سے منع کیا تھا۔''وہ نرم لہجے میں کہنے لگا تھا۔۔

''مجھے شاید تمہاری بات مان لینی چاہیے تھی۔۔''یکدم اس کی آنکھیں بھیگی تھیں۔
ارمغان کو تعجب ہوا۔

"ارمغان۔۔میں نے قتل کر دیا۔۔میں نے گناہ کر دیا ہے۔۔"پل میں آنکھیں بھیگی تھیں پل میں گلا رندھا تھا۔ارمغان نے فوراً اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"نہیں ایرج۔۔ایسا کچھ نہیں ہوا۔۔تم نے اپنے ڈیفینس میں سب کیا۔۔اور تم نے اتنے سارے لوگوں کو انصاف پہنچایا ہے۔۔"وہ اس کا ہاتھ سہلاتے بغور اسے دیکھتے بول رہا تھا۔ایرج کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔آنسو گر رہے تھے۔۔نجانے کیا ہوا تھا اسے۔۔

وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔مگر وہ لب کاٹے جا رہی تھی۔۔

"کچھ نہیں ہوا ایرج۔۔کچھ بھی نہیں۔۔میں دیکھو تمہارے ساتھ ہوں۔۔ تمہارے پاس ہوں۔۔میں تمہیں کبھی بھی، کچھ بھی ہونے نہیں دوں گا۔"اس نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر ایرج کے آنسو صاف کیے تھے۔انگلیوں کی پوروں پہ اس نمکین پانی کے قطرے کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"میں نے۔۔اپنے ہی کزن کا قتل کر دیا۔۔میں نے۔۔گناہ کر دیا۔۔"وہ ایک ہی بات بار بار دہرائے جا رہی تھی۔

"تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔۔تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔۔تم نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔۔"وہ اب اس کے دونوں ہاتھوں کو نہایت نرمی سے پکڑے کہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ایرج نے منہ بالکل جھکا لیا تھا۔

ایرج نے ارمغان کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ نکالا تھا۔چہرہ اٹھا کر اس نے ارمغان کی آنکھوں میں دیکھا۔اس کی آنکھوں میں واقعی پریشانی تھی، کرب تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑتے اس کے سامنے کیے۔

"مجھے معاف کردو' ارمغان۔۔ تم قاتل نہیں تھے۔۔میں نے تم پر الزام لگایا۔۔ تم قاتل نہیں تھے۔۔ تم نے خود کو بچایا۔۔ تم نے خود کو خود انصاف دلوایا تھا۔مجھے معاف۔۔۔۔"

اس سے پہلے وہ کچھ کہتی، ارمغان نے ایک ہاتھ سے اس کی جڑے ہاتھ تھامے تھے اور دوسرا ہاتھ کی ایک انگلی اس کی منہ پہ رکھ دی تھی۔

"آئندہ۔۔۔یہ مت کرنا' ایرج۔تم نے میرے ساتھ کچھ برا نہیں کیا۔۔ آئندہ۔۔میرے سامنے یوں ہاتھ مت جوڑنا۔۔مجھے درد ہوتا ہے ایرج۔۔سب سے زیادہ۔۔یہاں (اس نے ایرج کے ہاتھوں کو اپنے سینے پہ دل کی جگہ رکھا)۔۔ یہ دھڑک رہا ہے، تمہارا شکریہ۔ورنہ میں اس کی دھڑکن کب کی بند کر چکا ہوتا۔۔" وہ کرب سے کہتا رہا تھا۔ایرج اسے بھیگی پلکھیں اٹھائے دیکھ رہی تھی۔

"آئی لو یو ایرج۔۔مجھے اب فرق نہیں پڑتا کہ تم مجھے پسند کرتی ہو یا نہیں۔۔مگر میری محبت تمہارے لیے پاک ہے۔میں پانچ سال پہلے تمہاری محبت میں گرفتار ہوا تھا۔اور پانچ سال بعد مجھے اپنے دل کے اس فیصلے پہ کوئی گلہ نہیں۔"اس نے ایرج کے دونوں ہاتھ ہنوز تھامے ہوئے تھے۔اس کا لہجہ شکستہ سا تھا۔

ایرج نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھوں پہ ٹکا آنسو کا قطرہ چن لیا تھا۔ارمغان نے بے ساختہ آنکھیں بند کی تھیں۔

اس کے ہاتھ نے ارمغان کا چہرہ تھاما تھا۔درد کم ہوتا گیا تھا۔دل صاف ہوتا گیا تھا۔

"مجھے تم سے نفرت نہیں ہے ارمغان۔اور میں محبت کرنے کے اب لائق نہیں رہی۔۔"

اس کی بات پہ ارمغان نے آنکھیں کھولیں تھیں۔اس کی اداس نظروں میں قربتیں عیاں تھیں۔ایرج نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تھا۔

وہ ساکت ہوتے اسے اپنے حصار میں لے چکا تھا۔آنکھوں میں آنسو ٹھہر گئے تھے۔ ایرج کی سسکیاں بند کمرے میں گونجی تھیں۔وہ اسے چپ کروانے کی کوشش میں تھا۔

وہ دونوں ویسے ہی ایک دوسرے کو سہارا دیتے،ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔۔ایک دوسرے کو سنبھال رہے تھے۔

ایرج اور ارمغان۔۔ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے تھے، مگر ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ موجود تھے۔

•••••••••••

حیدر لمبے لمبے ڈگ بھرتا عمارت سے باہر آگیا تھا۔دانیہ بھی ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے اس کی پیچھے پیچھے آئی تھی۔اس کی چہرے سے بے تحاشہ سوالوں کا احساس اسے ہو چکا تھا۔

"سر۔۔واٹ واز دیٹ؟ یہ سب ہوا کیا ہے۔۔"

"بعد میں دانیہ۔۔"اس نے دانیہ کو آدھے جملے کے بیچ ہی روک دیا تھا۔وہ بھی چپ سی ہو گئی۔اسے النساء کو تمام خبر دینی تھی۔

••••••••••

اس نے نرمی سے ایرج کو خود سے الگ کیا تھا۔اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔رونے کے بعد وہ اور زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔۔

ایرج نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔چہرے پہ ویرانی تھی۔ارمغان نے ہاتھ بڑھا کر کلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیا تھا۔

پانی پیتے ہوئے بھی وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ستا ہوا گندمی رنگت چہرہ،چوڑے کندھے،کسرتی جسامت، تیکھے نقوش۔۔

"تم نے مجھے اپنی بہن کی ڈیتھ کہ بارے میں نہیں بتایا۔۔" ایرج نے گلاس ٹیبل پہ رکھتے اچانک ہی سوال کیا تھا۔ جہاں ارمغان کے چہرے پہ نرم سے تاثرات تھے اس سوال پہ یکدم بدل کر پتھریلے ہو گئے۔

"چھوڑو۔۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔" اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"تم مجھ پہ بھروسہ کرتے ہو نا ارمغان۔۔ پھر ہر بار اس موضوع سے کیوں بھاگتے ہو۔۔؟" اس نے اداسی سے اسے دیکھا۔

"بات بھاگنے کی نہیں ہے۔۔ وہ واقعہ بہت دردناک ہے۔۔" اس نے نظریں چرائیں۔

"درد سہنے کی عادت تو اب تک ہو ہی گئی ہے ہم دونوں کو۔" وہ مسکرائی۔ ارمغان مسکرا نہیں سکا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ ٹانگوں پہ رکھتے خود کو پر سکون کیا تھا۔۔ وہ ایرج کو دیکھنے کے بجائے دروازے کے پار اندھیر راہداری کو تک رہا تھا۔

"ہادیہ آپی کے رشتہ ٹوٹنے کے دو دن بعد عظیم بھائی گھر آئے تھے۔۔۔"

اس نے مدھم آواز میں بولنا شروع کیا تھا۔

••••••••••

One-موت

کھلی فضا میں تین لوگ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے۔ جامد و ساکت۔

ہواؤں کا رخ ان کی طرف تھا، بال اڑ اڑ کر منہ کو آرہے تھے۔ مگر وہ نہ ہلے۔ ابھی ساکن رہنا ان پہ فرض کر دیا گیا تھا۔

بڑی سی فائرنگ مشین چھت کی دیوار پہ سیٹ کی جارہی تھی۔ دو لوگ اسے آگے پیچھے سے سیٹ کرتے مصروف سے نظر آرہے تھے۔

جبکہ وہ ان دونوں سے ذرا فاصلے پہ اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں اپنے جامنی ہونٹوں پہ سجائے وہ کسی گہری سوچ کا مسافر معلوم ہوتا تھا۔۔۔

"اسے تکلیف نہیں ہونی چاہئے، ایلی"

باس کا حکم اس کی ذہن میں گونج رہا تھا۔ اسے ان کی بات کی پاسبانی کرنا تھی۔ اس کی نظریں دور کھڑی سفید عمارت تک اٹھی تھیں۔۔

لبوں پہ مسکراہٹ چھا گئی۔

اس کا بدلہ آج ایفا ہونے جا رہا تھا۔ رستم کی دوستی کا بدلہ۔۔ آج پورا ہونے جا رہا تھا۔

بہت شاطر سمجھتا تھا دوروس خود کو۔ آج وہ اسے اپنے سامنے مرتا دیکھنا چاہتا تھا۔۔
وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جب رستم کی موت پہ کوئی رونے والا نہیں تھا ویسے ہی دوروس نے اپنے کتنے ہمدرد بنا لیے تھے۔۔

وہ اسے آج ختم کرنے والا تھا۔

آسان موت اسے صدقے کر کے وہ اس کی موت پہ ہنسنے والا تھا۔

دوروس کا مردہ وجود ایلی کی آنکھوں کے سامنے جھوم گیا۔وہ ہنساتھا،ہنستا چلا گیا۔

وقت آگیا تھا۔بس اب شکار کرنا رہتا تھا۔

....

"ہادیہ آپی کے رشتہ ختم ہونے کے دو دن بعد عظیم بھائی گھر آئے تھے۔"

ایرج خاموش رہی۔وہ اسے سن رہی تھی۔

"غالباً انہیں کوئی ضروری بات کرنی تھی۔اس وقت ابا گھر پہ نہیں تھے۔اماں نے انہیں گھر میں داخل ہونے دیا تھا۔میں نے ہادیہ آپی کو آگاہ کیا تو وہ بھاگی بھاگی آئی تھیں۔اماں نے ان دونوں کو چھت پہ بھیجا تھا۔کہا تھا کہ ابا کے آنے سے پہلے جو بات کرنی ہے، کر چکو۔

وہ دونوں چپکے چپکے، ناکام عاشقوں کی طرح چھت پر گئے تھے۔اماں نے مجھے کہا تھا کہ میں نیچے گیٹ پر نظر رکھوں۔۔۔میں گیٹ تک آگیا تھا۔ابا کے آنے کا وقت ہوا نہیں تھا اس وقت، تو میں پر سکون تھا۔مگر پھر چند منٹ بعد ہی گھر کا دروازہ اتنی زور سے بجا کہ میرے پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔۔

میں نے دروازہ کھولا تو ابا کا غصے سے بھرا چہرہ دیکھ کر میں ساکت رہ گیا۔ ویسے تو وہ جب بھی گھر آتے تھے، غصہ ہی رہتے تھے۔۔ مگر اس وقت۔۔ان کے چہرے پہ کچھ اور تھا۔۔اس سے پہلے میں کچھ کہتا،انہوں نے مجھ سے سوال کیا تھا۔۔

"عظیم کہاں ہے؟"

اس ایک سوال پہ میرا دل بند سا ہو گیا تھا۔ نجانے ابا کو علم کیسے ہوا تھا۔۔ مگر ان کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں سب معلوم ہو چکا ہے۔۔

میں نے انجان بننے کی کوشش کی تھی۔ کہا تھا کہ وہ تو یہاں نہیں آئے۔ مگر گھر کے باہر عظیم بھائی کی جوتی دیکھ کر انہوں نے میرے منہ پر رکھ کر ایک طمانچہ مارا تھا۔ میرا پورا وجود گھوم گیا تھا۔ مگر پھر بھی میں ان کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ خطرے کی گھنٹی

بج گئی تھی۔ مگر وہ نہیں رک رہے تھے، نہ میں انہیں روک پایا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے چھت کی جانب بڑھ رہے تھے۔۔اماں بھی ساتھ ساتھ ان کے پیچھے آئی تھیں۔۔ مگر وہ نہیں رکے تھے۔۔وہ سن ہی نہیں رہے تھے۔۔"

ایرج نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ کمرہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ بس ارمغان کی ٹوٹی پھوٹی آواز کمرے کی وحشت کو مکمل کر رہی تھی۔

"ہم تین لوگ چھت کے دروازے تک آئے تھے کہ ہم تینوں کے کانوں میں ان کی آواز پڑی تھی۔۔

"میں نہیں چاہتا کہ تمہارے بھائی کے کرتوت کی وجہ سے ہمارے درمیان دراڑیں آئیں۔۔ ہم بھاگ چلتے ہیں ہادیہ۔۔ ہم نکاح کر لیتے ہیں۔۔ پلیز۔۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔۔"

اماں نے بے ساختہ سر پہ ہاتھ پیٹا تھا۔

"ہم نکاح کر کے واپس آجائیں گے۔۔ پھر ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکے گا۔۔ پھر ہمارے درمیان کسی کو بولنے کی جرات نہیں ہو گی۔۔ ہم نکاح کر لیتے ہیں ہادیہ۔۔ کورٹ میرج۔۔"

اس سے پہلے عظیم بھائی کچھ اور بولتے۔۔ ابا دروازے پہ لات مارتے اندر داخل ہوئے۔۔ میں نے اور اماں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی مگر۔۔"

وہ پہلی بار سسکا تھا۔آواز ایسے ٹوٹی تھی جیسے سب ہار دیا ہو۔۔ایرج نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا تھا۔

”ابا نے عظیم بھائی کا گریبان پکڑ کر انہیں جھنجوڑا تھا۔

”بے غیرت انسان! پہلے رشتہ ختم کیا۔۔اب میری بیٹی کو ورغلا رہا ہے۔۔“ابا اس پہ تھپڑوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔۔اور وہ ان سے اپنا آپ چھڑوانے کی کوشش میں تھے۔۔

میں،اماں،ہادیہ آپی۔۔ہم تینوں ابا کو پیچھے کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔۔

''ابا عظیم کو چھوڑیں۔۔ابا اسے چھوڑیں۔۔''ہادیہ آپی چلاتے ہوئے ابا کا ہاتھ پکڑے عظیم کو ان سے الگ کر رہی تھیں۔۔

''ابا بس کریں! ابا اسے چھوڑیں۔۔''وہ روتے ہوئے بار بار ابا کا ہاتھ پکڑے انہیں سمجھا رہی تھیں۔۔

مگر پھر۔۔۔

''ہٹ میرے راستے سے گھٹیا عورت!''انہوں نے ہادیہ آپی کو ہاتھ کے زور سے بے حد جارحانہ طریقے سے دھکا دیا تھا۔۔

ہادیہ آپی پر وہ دھکا اتنا اچانک تھا کہ ۔۔وہ توازن برقرار نہیں رکھ پائی تھیں۔۔

اور اینٹ کا نوکیلا حصہ انکے سر کے پچھلے حصے کے اندر گھس گیا تھا۔

ہادیہ آپی کے گرنے کی بے دھم آواز پہ ہم ان تک پلٹے تھے۔۔ مگر تب تک فرش کی سرمئی زمین پہ سرخ رنگ کی پوشاک بچھ چکی تھی۔"

وہ کہہ کر یکدم خاموش ہو گیا تھا۔آنکھیں ایرج سے پھیر لی تھیں۔ایرج کے پاس کوئی الفاظ نہیں بچے تھے۔۔کوئی تسلی نہیں بچی تھی۔وہ جانتی تھی ارمغان آنکھیں پھیرے آنسوؤں پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔۔

"ارمغان، ادھر دیکھو۔۔" اس نے ارمغان کا ہاتھ تھپتھپاتے اس سے کہا تھا۔ وہ خود بھی بھیگی آنکھوں سے اس کی پشت دیکھ رہی تھی۔۔

ارمغان نے کوئی جواب نہیں دیکھا۔۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کے آنسوؤں کے ہمراز ہیں۔۔ تم میرے سامنے ایک چھوٹے بچے بن کر رو سکتے ہو، تم میرے سامنے اپنی ہر کیفیت کا اظہار کر سکتے ہو۔۔ اور میں تمہیں ہر بار ہاتھوں سے پکڑ کر چپ کروانے کے لیے منتظر ہوں۔۔ جیسے تم کرتے ہو۔۔"

ایرج کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر بکھرا تھا۔ارمغان نے اس کی طرف سر گھمایا تو اس کی آنکھیں سرخ متورم ہو رہی تھیں۔۔ایرج نے اس کا ہاتھ ہنوز تھاما ہوا تھا۔۔

"میں نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے کو اس وقت کھو دیا جب وہ مجھ سے ناراض تھی۔۔"

اس نے بہت مدھم آواز میں، سر جھکائے کہا تھا۔۔

"اس بات کا بوجھ میرے کندھے سے کبھی اترتا ہی نہیں ہے ایرج۔۔ کبھی نہیں اترتا۔۔" وہ اس کی ہاتھوں کو اپنی آنکھوں تک لے آیا۔۔

”میں جس سے محبت کرتا ہوں۔۔وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔۔میں اتنا منحوس کیوں ہوں ایرج؟“

وہ پہلی بار ایرج کو دیکھتے کسی بچے کی طرح سوال کر رہا تھا۔ایرج اسے دیکھ کہ رہ گئی۔۔وہ منحوس نہیں تھا۔۔وہ بالکل منحوس نہیں تھا۔۔

”جو درد جھیل کر زندگی جی لیتے ہیں،وہ منحوس نہیں ہوتے،وہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں“ایرج نے اس کی تھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا تھا۔۔

”تم نے اللہ کی دی تمام تر آزمائشوں کو پار کیا۔۔تم نے خود کبھی ہار نہیں مانی۔۔تم منحوس نہیں ہوار مغان۔۔تم بہت عزیز ہو۔۔تم بہت محبت کے مستحق ہو۔۔“

ارمغان دم سادھے اس کی بات سن رہا تھا۔۔

”تم دنیا میں محبت کی تلاش کرتے رہے ہو۔ تمہیں تو اندازہ نہیں ہے تمہاری اصل محبت تو جہانوں سے کہیں بہت پرے، کہیں بہت وسیع ہے۔۔“

ایرج کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر رہے تھے۔۔ارمغان کے بہہ رہے تھے۔۔

”اللہ کو تم سے بہت محبت ہے' ارمغان۔۔وہ تم کو بس زندگی سے محبت کرنے کی مہلت دے رہا تھا۔۔“ایرج کی آواز مدھم ہو گئی۔اس کا سر ارمغان کے سر کے نزدیک آ گیا تھا۔

"زندگی سے تو میں نے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔۔ مگر زندگی نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی۔" وہ زخمی سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ایرج کے ہاتھ ہنوز اس کی بند آنکھوں پہ جمے ہوئے تھے۔

ایرج خاموش رہی، وہ دونوں خاموش رہے۔وہ جانتی تھی ارمغان کیا کہہ رہا تھا۔وہ جانتی تھی۔۔

اس نے ارمغان کی آنکھوں سے اپنا ہاتھ ہٹایا۔انہیں ہاتھوں سے اس نے ارمغان کا چہرہ کسی کٹورے کی مانند تھاما تھا۔

"شاید زندگی کو بھی تم سے محبت ہو گئی ہے، ارمغان۔۔

زندگی کو بس خود کو بالکل خالی کرنے کی جگہ چاہیے تھی۔۔تاکہ زندگی پوری پوری ارمغان کی ہو جائے۔۔"

اس کی بات پہ ارمغان نے بہت دھیرے سے آنکھیں کھولیں تھیں۔۔اس کے پورے جسم پہ رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔وہ سرخ سوجی آنکھوں سے ایرج کو دیکھتا رہا تھا، ایرج مسکراتے ہوئے، بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔۔

آنکھوں کی باتیں تھیں، لفظوں سے نہیں ہو سکتی تھیں۔۔

"زندگی کو مجھ پہ ترس آگیا۔۔؟" وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔وہ کیسے مسکرا سکتا تھا؟

”نہیں۔۔زندگی ارمغان کو بالآخر سمجھ گئی ہے۔“اس نے سرگوشی میں ارمغان کو کہا تھا۔

”زندگی اب مجھے تنہا تو نہیں چھوڑے گی۔۔؟“اس نے ایک اور بار سوال کیا تھا۔ ایرج اس کی بات پہ کھل کہ مسکرائی۔

”کبھی بھی نہیں۔“

”اور اگر ارمغان مر رہا ہوا تو؟“اس نے ایک اور بار سوال کیا تھا۔

”زندگی ارمغان کو مرنے نہیں دے گی۔“

اس کی بات پہ وہ دونوں قریب آئے تھے۔ایک دوسرے کے حصار میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا تھا۔ گونگے آنسو بہتے رہے تھے۔وقت گزرتا رہا۔۔وہ دونوں جدا نہ ہوئے۔۔۔آنسو بہتے رہے۔۔وہ دونوں روتے رہے۔

....

گاڑی سے اتر کر وہ دانیہ کی طرف آیا تھا۔

”تم لوگوں کے لیے گلبرگ میں ہوٹل بک ہوگیا ہے۔اسٹے دیئر۔اگر مجھے ضرورت ہوئی تو میں تم لوگوں کو بلوا لوں گا۔فی الحال میں آج یہیں ہوں۔واپسی کا کچھ نہیں پتا ابھی۔تم لوگ جا کر ریسٹ کرو۔“

وہ دانیہ کو کارڈ، چابی اور نجانے کیا کیا پکڑاتے اسے ہدایت دے رہا تھا۔تمام ساتھیوں کو بھی اس نے وہی کہا جو اس نے دانیہ کو کہا تھا۔ہر کام پھرتی سے کر لیا کرتا تھا حیدر ذوالفقار۔غصے کا تیز تھا مگر احترام ضرور کرتا تھا۔

دانیہ اور تمام آفیسرز جب گاڑی میں سوار ہوگئے تو وہ عمارت کے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔باہر سنسان سا علاقہ تھا نو صرف وہی عمارت تھی جو روشن رہتی تھی۔خالی خالی سے مکان تھے جہاں سے وحشت کا سا احساس ہوتا تھا۔

وہ عمارت کے اندر آنے لگا تو اسے بہت شدت سے محسوس ہوا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے، کوئی اس پہ نظر رکھے ہوئے ہے۔

اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی خطرہ قریب ہے۔ وہ اس بات کو اس بار نظر انداز نہیں کر پایا تھا۔

اسے سب سے پہلے ارمغان اور ایرج کی خیریت لینی تھی۔ سفید عمارت کا دروازہ کھولتے اس نے قدم اندر جمائے ہی تھے کہ اس ایک چیخ نے اسے نمک کا مجسمہ بنا دیا تھا۔

دنیا بالکل تھم گئی تھی۔

....

Zero-زندگی

نجانے کتنے پل بیت گئے تھے کہ جب ارمغان اس سے الگ ہوا تھا۔ایرج پہلی بار اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔وہ اسے تعجب سے دیکھتا رہا۔

''کیوں مسکرا رہی ہو؟''اس نے پوچھا۔

''تمہیں پتا ہے۔۔جب میں تم سے پہلی بار ملنے اس گراؤنڈ آئی تھی۔۔تو تمہارے بارے میں میرا پہلا خیال کیا تھا؟'' وہ کہتے ہوئے کھل کر مسکرائی۔

ارمغان نے اتنے عرصے بعد اسے اتنا کھل کر مسکراتے دیکھا تھا، وہ بھی اپنے لیے۔۔اسے رشک ہوا۔ سوالیہ نظروں سے ایرج کو دیکھتے اس نے ایرج کو بات کو جاری رکھنے کا موقع دیا۔

''کہ تم بہت ہینڈسم ہو!'' وہ کہتے ہوئے بے تحاشہ ہنسی تھی۔ارمغان اس انکشاف پہ پہلے گنگ سارہ گیا، پھر وہ بھی مدھم سا مسکرادیا۔

''یعنی تمہیں مجھ سے اس وقت ہی محبت ہوگئی تھی مگر تم ماننے کو تیار نہیں تھی؟'' ارمغان نے سوال کیا۔

"مجھے اس وقت کوئی محبت وغیرہ نہیں ہوئی تھی تم سے۔" ایرج بھی بے نیاز ہوئی۔

"تو یعنی اب ہو گئی ہے؟" اس کی بات پہ ایرج کا چہرہ سرخ گلابی ہو گیا۔ اس نے چہرہ پھیر لیا تھا۔

ارمغان اس کی اس حرکت پہ کھل کر ہنسا تھا۔

"ایرج جاوید صدیقی شرماتی بھی ہیں؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اسے زندگی کتنی اچھی لگ رہی تھی اس وقت۔

"میں شرما نہیں رہی۔۔ تمہاری بات ہی ایسی ہے۔" اس نے الزام ارمغان کے سر ڈال دیا۔

"کیسی بات ہے؟" گویا ہوا۔

وہ کچھ بول نہیں سکی۔

"مجھے تم سے محبت ہے، یہ بات میرے لبوں پہ آخری جملہ بھی ہوا تو مجھے پچھتاوا نہیں ہو گا۔" وہ کہتے ہوئے اس کے بال پیچھے اڑسانے لگا۔

"اچھا اچھا یہ جذباتی باتیں بعد میں کرنا۔۔مجھے اپنا آفس تو دکھاؤ۔۔ان سفید دیواروں کو دیکھ کر میں تھک گئی ہوں۔" اس نے منہ بناتے کہا تھا۔

"مگر ابھی تمہیں ریسٹ کی ضرورت ہے۔" ارمغان نے شیو کھجاتے اسے کہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔چل پھر سکتی ہوں۔کچھ نہیں ہوا مجھے۔" اس نے دفاع کیا۔

"ہاتھ کا زخم گہرا ہے ابھی ایرج۔"

"ہاں تو ہاتھ کا زخم ہے،اتنا گہرا ابھی نہیں ہے۔۔اور اب تو درد بھی کم ہو گیا ہے۔۔۔!" وہ اٹھتے ہوئے کہنے لگی جیسے اب کوئی بات نہیں سنے گی۔

"ایرج ابھی تھوڑا ریسٹ کرلو۔۔پھر چلتے ہیں ناں۔" وہ اسے کندھے سے پکڑ کر بیٹھانے لگا۔

"میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں! اچھا واک پہ چلتے ہیں۔۔" اس نے اپنا کندھا چھڑواتے کہا تھا۔

"اچھا بھئی۔۔چلو۔ مگر صرف دس منٹ ہم نیچے سے جا کر اوپر آجائیں گے۔" ارمغان نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ اسے کمرے سے باہر لا رہا تھا۔

وہ اس کے ہمقدم، مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

کسی کی زندگی میں اتنی اہمیت رکھنا، کسی سے اپنا خیال رکھوانا۔۔ کسی سے اپنی بات منوانا۔۔ یہ سب کتنا انوکھا ہوتا ہے ناں۔۔ زندگی جب محبت میں گھل مل جاتی ہے۔۔ تب کتنی نکھر جاتی ہے۔

ایرج نے سوچا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر اندھیر راہداری کو عبور کرنے لگے تھے۔ راہداری بالکل تاریک اور گھپ تھی۔ جیسے کوئی سرنگ ہو۔

ارمغان نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ایرج اس کے پیچھے تھی،وہ آگے۔وہ دونوں خاموشی سے راہ داری میں چل رہے تھے،دور روشنی کی کرن سے جگمگا رہی تھی۔

یکدم ارمغان کے سر میں درد کی ٹھیس اٹھی تھی۔

"میں نے تمہیں مار دیا۔۔"

ایلیٹ کی آواز اس کی کان کے قریب بازگشت کرنے لگی تھی۔۔

وہ راہ داری کے بالکل درمیان رکا تھا۔سر پہ ہاتھ رکھے اس نے پیشانی مسلی تھی۔

"مجھے معاف کر دینا دوروس۔۔"

اس کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔

ایرج اس کی سامنے آئی، اس کی چہرے کو دیکھتے وہ پریشان ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ ارمغان نے بس نفی میں سر ہلا دیا۔

"پتا نہیں بس۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔ چلو نیچے چلتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ واپس تھام کر چلنے لگا تھا۔ سر میں درد ہنوز اتنی ہی تیزی سے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی بوجھ ڈال رہا ہو۔

"ارمغان! اگر طبعیت ٹھیک نہیں تو ہم بعد میں آجائیں گے۔۔ تم ریسٹ کرلو۔"

وہ اب بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

ارمغان نے کہنے کے لیے لب کھولے تھے، مگر اس کی الفاظ کراہ بن کر ٹوٹ گئے۔۔

راہداری کے پار بنی شیشے کی کھڑکی چھناکے سے چور ہوئی تھی۔اور اس میں سے ایک موٹی بلٹ ارمغان کے پیٹ میں چھید کرتے گزری تھی۔

ہر چیز ایک سکینڈ کی رفتار سے طے پائی تھی۔وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔۔اس کا جسم یکدم گرم ہوا تھا۔جیسے کسی نے گرم تیل میں اسے جھونک دیا ہو۔اس کی باڈی کو جھٹکا لگا تھا۔وہ زمین پہ آنے لگا۔۔

اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟

ایرج کی آنکھیں اس شدید آواز سے بند ہوئی تھیں۔۔اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تھیں۔۔تب اس کا ہاتھ سرخ خون میں رنگ چکا تھا۔

اسے لگا تھا وہ کوئی ڈراؤنا خواب ہے۔ابھی آنکھ بند کرتے او جھل ہو جائے گا۔۔

مگر اس کے دل پہ بوجھ بڑھتا گیا تھا۔اس نے اپنے پاؤں پہ وزن محسوس کیا تھا۔اس کی دنیا تھم گئی تھی۔اس کی سانسیں بھی تھم گئی تھیں۔

اس نے اپنے پاؤں کے قریب ارمغان کے جسم سے خون رستا دیکھا تھا۔خدا کی قسم اس نے اس چیز سے خوفناک کچھ نہیں دیکھا تھا۔۔

وہ چیخی تھی۔۔اس کی منہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا۔زمین پہ گرتے ہوئے اس نے ارمغان کو تھاما تھا۔اس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔

"نو نو نو نو نو نو۔" وہ کہہ رہی تھی، وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ارمغان بس اسے دیکھ رہا تھا۔اس کی سیاہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔اسے سمجھ نہیں آیا تھا اس کی ساتھ ہوا کیا تھا۔

"تارا۔۔۔"اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔وہ چلا چلا کر بولنا چاہتی تھی کہ کوئی ایمبولنس بلائے۔۔کوئی ہسپتال لے کر جائے۔۔مگر گلا بند ہو رہا تھا۔

''ایرج۔۔۔'' وہ سسکا تھا۔ایرج نے اس کی پیٹ پر ہاتھ رکھا تھا۔وہ گرم سیال کو بہنے سے روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ناکام کوشش۔

ارمغان کا خون فرش کو گیلا کرتے ایرج کے کپڑوں کو بھیگا رہا تھا۔

(مگر مجھے تو پچھلے سات ماہ سے اپنے ارد گرد صرف کامل چاند نظر آیا ہے۔)

اس کی آواز ایرج کے کانوں میں گونج رہی تھی۔۔

"ایرج۔۔" وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ایرج کپکپا رہی تھی۔وہ اس کے بالوں میں ہاتھ چلا رہی تھی۔ایک ہاتھ پیٹ پہ تھا۔

اسی وقت وہاں حیدر آیا تھا۔اسے حیدر کا ایک لفظ سنائی نہیں دیا تھا۔وہ بس ارمغان کو دیکھے جا رہی تھی۔دیکھے جا رہی تھی۔۔ان دونوں کی آنکھیں ایک پل کے لیے بھی نہیں جھپکی تھیں۔

"ایرج۔۔۔تم نے۔۔۔" اس کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔کوئی ارمغان کی باڈی کو اس سے جدا کر رہا تھا۔ایمبولینس کی آواز کہیں بہت دور گونج رہی تھی۔

"تم نے کہا تھا۔۔۔تم مجھے مرنے نہیں دو گی۔۔" ارمغان کا منہ سرخ خون میں لدا ہوا تھا۔کوئی اس کو اٹھا رہا تھا۔ایرج نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

وہ سرگوشی میں کچھ بولنا چاہ رہا تھا مگر کوئی اسے ایرج سے جدا کر رہا تھا۔

"ایک منٹ میں بات کر رہی ہوں نا!" وہ دھاڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔۔ وہ رو رہی تھی، ساکن سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مجھے بچالو ایرج۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔۔" وہ کہتے ہوئے چپ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر گر رہے تھے۔

ایرج سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔وہ بھاگی بھاگی اس کے پیچھے آئی تھی۔اسے حیدر گود میں اٹھا کر ایمبولنس میں ڈال رہا تھا۔پورے آفس میں ہنگامی صورتحال ہو گئی تھی۔

وہ بس میں بیٹھ رہی تھی۔۔

(میں تھک گیا ہوں ایرج۔۔)

ارمغان پہ کسی نے چادر ڈالی تھی۔اسے سانس نہیں آرہا تھا۔اس کی نظروں میں ایرج آئی تھی۔بمشکل اس کی سانس بحال ہوئی تھی۔

”میرے۔۔۔۔میرے۔۔۔ساتھ رہو“اس نے لرزتے ہاتھ ایرج کی طرف بڑھائے تھے۔اس نے انہیں مضبوطی سے تھاما۔۔

(”زندگی تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑے گی۔“)

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔۔میں ساتھ ہوں۔۔کچھ نہیں ہوگا۔“وہ کہہ رہی تھی مگر اس کا لہجہ ٹوٹ گیا تھا۔

”ہم شادی کریں گے۔۔ہم ایک بہت خوبصورت گھر میں رہیں گے۔۔ہم ساتھ رہیں گے۔۔“وہ اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔۔حیدر نے اس کے پیٹ پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا۔نرس اسے آکسیجن ماسک پہنا رہی تھی۔۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں۔۔میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔۔تم۔۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔۔بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"اس نے کہتے ہوئے ہاتھ دانتوں میں دبایا تھا۔اسے ابھی کمزور نہیں پڑنا تھا۔۔چاہے اس کا دل بند بھی ہو جائے۔۔اسے ابھی کمزور نہیں پڑنا تھا۔

اس کی بات پہ ارمغان مسکرایا تھا۔۔اس کا وجود کپکپا رہا تھا۔اس کے ہونٹ جامنی ہو رہے تھے۔۔

"مجھے تم سے محبت۔۔۔۔ہے۔۔۔ایرج۔"

اس نے کہا تھا کہ اگر وہ مر بھی رہا ہوا اور اس کا آخری جملہ یہ ہوا تو اسے کوئی پچھتاوا نہیں ہو گا۔اور اس کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔۔

خون بہہ بہہ کر ٹپک رہا تھا۔ایرج کے دونوں ہاتھ سرخ سیال میں بھیگ چکے تھے۔۔

"گاڑی تیز چلاؤ یار!" حیدر دھاڑا تھا۔اسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ارمغان نے اسکی طرف دیکھا۔اپنے دوست کو اپنے ساتھ دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی۔چلو کوئی تو تھا اسکے آخری لمحوں میں اسکے ساتھ۔

"تم مجھ سے وعدہ کرو۔۔تم ہار نہیں مانو گے ارمغان!" وہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔اس کی جان بھی آدھی ہو گئی تھی۔ارمغان نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

ایرج اس کا ہاتھ نرمی سے دبا رہی تھی۔آنسو پہ قابو نہیں رہا تھا۔

ہسپتال آگیا تھا۔ایمبولینس کے دروازے کھل گئے تھے۔حیدر اور دوسرے لوگ بھاگتے ہوئے اسٹریچر لائے۔

ارمغان کو اسٹریچر پہ لیٹایا جا رہا تھا۔ہسپتال میں لوگ انہیں دیکھ کر دور دور ہوتے جا رہے تھے۔

ارمغان کو فوراً ہی آپریشن وارڈ میں داخل کروایا گیا تھا۔تارا ایرج کے برابر اسے شانوں سے تھامے ہوئے،اسے سہارا دے رہی تھی۔۔

"کچھ نہیں ہو گا باس کو۔۔ہی از بریو!" وہ اسے تسلی دینے کی کوشش میں تھی۔

ڈاکٹر نے پولیس کیس کا حوالہ دیا تو حیدر کے آئیڈنٹٹی دکھاتے اس کی بولتی بند ہوئی تھی۔

"دعا کریں، ہم کام کر رہے ہیں۔اللہ سب بہتر کرنے والا ہے۔" اس ڈاکٹر کی بات اس کی کان میں پڑی تھی۔وہ تارا سے خود کو چھڑواتے راہداری میں بھاگی تھی، سب لوگ اسی کو دیکھ رہے تھے۔مگر اسے نماز ایریا کی تلاش تھی۔

اور وہ رب ہی تو ہوتا ہے جو ہر بندے کی فریاد سنتا ہے۔جو زندہ کو موت دیتا ہے، جو مردہ کو زندہ کر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔اس کے پاس ہی تو سب آتے ہیں، ہاتھ پھیلاتے ہیں۔

وہ کس کو رد کرتا ہے؟

....

وہ جائے نماز پہ کھڑی نماز کی نیت باندھے ہوئے تھی۔ مگر قرآن کا ایک لفظ بھی ٹھیک ڈھنگ سے ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔اس کی سسکیاں نہیں رک رہی تھیں۔اس کے آنسو بہتے جا رہے تھے۔۔

نماز مکمل کر کے وہ جائے نماز پہ بیٹھ گئی تھی۔اب اٹھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔پیر جواب دے گئے تھے۔زندگی اتنی مشکل کبھی نہ لگی تھی۔

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے۔پھر جس کے لیے دعا مانگنی تھی اس کی حالت سوچتے ہوئے بھی وہ زارو قطار روتی گئی تھی۔

نماز ایریا بالکل خالی تھا۔ایک بتی جل رہی تھی، باقی ہر سو اندھیرا تھا۔اس کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔گہری سسکیاں۔درد کے معنی تھامی ہوئی سسکیاں۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہا اللہ۔۔" وہ بے آواز کہنے لگی تھی۔ گونگے الفاظ، صاف دعا۔

"میں نے اس سے کہا تھا آپ اس سے محبت کرتے ہیں۔۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ آپ نے اس کی آزمائش ختم کر دی۔۔" حبس بڑھتا جا رہا تھا۔ درد کم نہیں ہو رہا تھا۔

"مگر پھر۔۔۔ پھر یہ کیوں ہوا اللہ۔ آسانیاں کیوں نہیں پیش آ رہی ہیں۔۔ میرا کونسا گناہ ہے اللہ جو میرے نصیب کی خوشیاں چھین رہا ہے۔۔"

وہ سر اٹھائے، خلاء میں دیکھتے، بات کر رہی تھی۔

”مجھے معاف کر دیں اللہ۔۔میرے گناہ معاف کر دیں۔۔اس کو زندگی دے دیں۔ اس سے زندگی نہ چھینیں۔۔اگر اس کو زندگی نہ ملی تو زندگی خود کی قبر بنا کر اس میں دفن ہو جائے گی۔۔“وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھے دیوانہ وار رو رہی تھی۔۔رو رہی تھی۔۔رو رہی تھی۔۔

”اسے زندگی دے دیں اللہ۔۔اسے معاف کر دیں۔۔مجھے معاف کر دیں۔۔ ہمیں مہلت دے دیں۔۔اسکی زندگی کو بخش دیں۔۔“آنکھیں درد سے پھٹ رہی تھیں۔

کون کسی کی یاد میں اتنا رویا ہو گا کہ آنکھیں پھٹتی محسوس ہونا شروع ہو جائیں۔

نماز ایریا کا دروازہ ٹھاہ کی آواز سے کھلا تھا۔وہ دھڑکتے دل کے ساتھ پیچھے پلٹی۔

"جلدی آؤ!" حیدر کہتے ہوئے بھاگا تھا۔ایرج بھی کھڑے ہوتے ساتھ ہی بھاگی تھی۔

وارڈ میں داخل ہوتے وہ فوراًاس کے سامنے آکے بیٹھی تھی۔ارمغان کا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔منہ پہ آکسیجن ماسک تھا۔

ایرج نے اس کا ہاتھ تھاماتب اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔اسے دیکھتے وہ مسکرایا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھنا چاہا تھا۔وہ ناکام ہو گیا۔

اس نے آکسیجن ماسک ہٹایا۔سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

''ایرج۔۔۔''وہ سسکا۔۔آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔نم نم آنکھیں۔

''میں مر جاؤں گا تو تم روؤ گی نہیں۔۔''وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ایرج کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

''ہماری محبت اتنی کمزور نہیں ہے کہ ہم بچھڑ جانے پہ ماتم کریں۔۔''اس کے ٹوٹے ٹوٹے لفظ بھی اکھڑنے لگے تھے۔۔

''ایسا کچھ نہیں ہو گا۔۔ تم کہیں نہیں جا رہے۔۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' وہ روتے ہوئے اس پہ غصہ کر رہی تھی۔ حیدر پیچھے کھڑا آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے تھا۔

اس کو دیکھتے ارمغان مسکرایا تھا۔

ارمغان نے چادر کے نیچے ہاتھ ڈالا۔۔۔ اور پھر نکال کر اس کی ہاتھ پہ کوئی شے رکھی تھی۔۔

ایرج اس شے کو دیکھ کر ساکت ہو گئی تھی۔۔

وہ اسی کی زرد رنگ کی کٹر نائف تھی۔ جس پہ آج بھی ارمغان کے خون کے تین قطرے سوکھے ہوئے تھے۔

ایرج نے ہتھیلی پہ چھری کو دیکھا، پھر ارمغان کو۔

"catch me in hell, aquarius"

وہ کہہ کر کھانسا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔۔

"نہیں نہیں نہیں نہیں۔۔آنکھیں کھولو ارمغان۔۔بات کرو۔۔پلیز بات کرو مجھ سے۔۔پلیز رکو۔۔رکو۔۔رکو۔۔انتظار کرو نا! میرا ویٹ کرو۔۔ارمغان۔۔ نہیں۔۔نہیں۔۔رکو۔۔نہیں۔۔میں نے دعا مانگی تھی۔۔ایسے نہیں۔۔۔ رکو۔۔رکو۔۔ارمغان۔۔صبر کرو۔۔بات کرو۔۔تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔۔ سنو۔۔میری سنو۔۔۔میں کہتی ہوں۔۔تم سنو۔۔اچھا۔۔اٹھو۔۔میں کہتی ہوں۔۔تم بس سنو۔۔"

وہ اس کا ہاتھ ہلاتے،اس کا چہرہ ہلاتے۔۔اس کی کان کے قریب جھک کر زارو قطار رونا شروع ہو گئی تھی۔

"مجھے تم سے۔۔۔بہت۔۔۔محبت ہے۔۔ایرج۔"اس کی لب ہلے تھے۔بہت ہلکے سے۔۔بے آواز سی آواز تھی۔۔

"مجھے تم سے۔۔۔۔"

اور الفاظ ٹوٹ گئے تھے۔۔ سانسیں تھم گئی تھیں۔

کبھی کبھی محبت کا احساس ہو جانا بھی کتنا ظلم کر دیتا ہے ناں انسان پہ۔۔۔ایک محبت کی وجہ سے مر جاتا ہے صرف دوسرے کو یہ احساس دلوانے کے لیے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔۔۔!

وہ اس کے سینے کو ہلاتی اسے جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اٹھو ارمغان! تم نے وعدہ کیا تھا!" وہ اس کے سینے پہ بے جان سے مکے مار رہی تھی۔۔ناکام سی کوشش۔

اس نے نڈھال ہوتے اس کی سینے پہ سر رکھ دیا تھا۔ہاتھ میں زرد چھری دبی ہوئی تھی۔

حیدر کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلا تھا جو بہنے کا منتظر تھا۔تارا منہ پہ ہاتھ رکھے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایرج کا چہرہ ارمغان کی گردن میں کہیں گم ہو گیا تھا۔حیدر نے اسے ہٹانے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں ہٹی تھی۔

اس کے آنسوار مغان کے گلے پہ گرتے بہتے جارہے تھے۔وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔وہ اتنا کبھی روئی ہی نہیں تھی۔

اس نے کہا تھاوہ مر جائے گاتب بھی زندگی اس سے محبت کرے گی؟

اور ایرج کی آنکھوں میں ارمغان سے محبت کا نمکین پانی عمر بھر کے لیے لکھ دیا گیا تھا۔

حیدر نے آگے بڑھ کر ارمغان کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا تھا،اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

("دنیا میں کتنے ہی سیریل کلرز آئے اور گئے۔۔ کیا تمہیں پتا ہے ایرج ان کے مرنے کا سبب سب سے زیادہ کیا چیز بنتی تھی؟")

ہسپتال کے کمرے میں سوگ نہیں تھا، بے یقینی تھی۔

("ان سب کو محبت ہو جاتی تھی۔")

ارمغان مر گیا تھا۔ جس کے لیے وہ خدا سے دعا کرتا تھا۔ وہ دعا آج قبول ہو گئی تھی۔

ایرج کو اس کے مرنے کے دکھ سے زیادہ اس بات کا دکھ تھا کہ جس زندگی کو اس نے ارمغان کے نام کرنے کا سوچا تھا، اب زندگی اس کے بغیر بھی گزارنی تھی۔

اس نے چادر سے اس کا سر ڈھکنے نہیں دیا تھا۔ وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے تھامے اس کی مردہ جسم پہ گال رکھے رو رہی تھی۔

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں،

ہر کام کرنے میں،

ضروری بات کہنی ہو،

کوئی وعدہ نبھانا ہو،

اسے آواز دینی ہو،

اسے واپس بلانا ہو،

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں۔۔۔

(منیر نیازی)

"ہسپتال سے خبر آئی ہے۔" اس کی آواز رنجیدہ تھی۔

"کیا۔۔؟"

"ارمغان ایکسپائر ہو گیا ہے۔"

ایلیٹ کی سانس رک گئی تھی۔ وہ بے جان سا صوفے پہ گر گیا۔

اس نے ارمغان کو مار دیا تھا۔

مجھے دوست سے ملے چند پل ہی ہوئے تھے،

کہ اس نے الوداع کا بول دیا

مجھے یار کو ابھی گلے لگانا تھا،

اس نے الوداع کا دروازہ کھول دیا۔۔

اس کی نیلی آنکھیں آنسوؤں سے سرخ ہو گئی تھیں۔دانیہ جیپ کے باہر کھڑے ضبط سے حیدر کو دیکھ رہی تھی۔اس نے پہلی بار انہیں روتے دیکھا تھا۔

"بہت۔۔۔بہت کمینے ہو تم ارمغان!"اس نے غصے سے اسٹیرنگ وہیل پہ ہاتھ مارا تھا۔آنکھیں مسلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ابھی اسے ارمغان کو اپنے کندھوں پہ اٹھانا تھا۔

زندگی تھم گئی تھی۔۔۔

مگر کتنے غلط وقت پہ تھمی تھی۔

کاش وہ زندگی ان سفید بند دیواروں میں تھم جاتی۔

ان ہنستی مسکراتی باتوں پہ تھم جاتی،

ان اظہار والفت کی باتوں پہ تھم جاتی۔۔

زندگی تھم گئی تھی،

مگر کس قدر غلط راستے پہ تھمی تھی۔

کاش زندگی تھم جاتی،

جب وہ پاس ہوتا،اور وہ ساتھ ہوتا۔

جب وہ پاس ہوتا۔۔اور جب وہ ساتھ ہوتا۔

”تم واپس کب آؤ گے۔۔۔ارمغان۔۔؟“اس کے لب نہ ہلے۔

”جب تم بلاؤ،ایکویرس۔“وہ مسکرایا۔ایرج مسکرا بھی نہ سکی۔

سب بنجارے سے بنجر ہو گیا۔جس پھول کو کھلتے دو لمحے نہ ہوئے تھے اس پھول پہ کوئی پاؤں مسلتا آگے بڑھ گیا۔

....

سرمئی گھر کہ فرش پہ سفید چاندی بچھائی گئی تھی۔ کونوں کونوں پہ اگربتیوں سے گلاب کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے جن سے سورج کی نرم گرم روشنی مدھم سی داخل ہو رہی تھی۔ باہر کے چھوٹے سے لان میں مردوں کا اہتمام تھا جن میں زیادہ تر حیدر کے ساتھی ہی تھے جو اس کی ساتھ لاہور آئے تھے۔

اندر خواتین کا اہتمام تھا۔ سارہ وہیل چیئر پہ بیٹھی، نمی آنکھوں میں سمیٹے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ گھر کا مالک ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کس کو دیکھ رہی تھی؟ کس کو تلاش رہی تھی؟

سعد حیدر کے ساتھ قبر کی بکنگ کروانے گیا ہوا تھا۔ ہر کام حیدر کر رہا تھا، اس کے پیسے، اس کا وقت۔ سب وہی کر رہا تھا۔

ایرج گرل کے پاس، گرل کو تھامے ویران سی بیٹھی تھی۔ آنکھوں کے نیچے بہت گہرے حلقے تھے، اتنے گہرے کہ آنکھیں دھنسی ہوئی لگتی تھیں۔

آنسوؤں کا چہرے پہ نشان پڑ گیا تھا۔ کپڑے بھی اس نے بمشکل سارہ کے اصرار پہ تبدیل کر لیے تھے۔

مگر اس میں اب کوئی بھی چیز کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ بس بیٹھی رہی تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی۔ اس نے بہت رو لیا تھا۔ اب آنسو سوکھ گئے تھے۔ اب دل مرجھا گیا تھا۔

اس کو دو لمحوں کی خوشی دے کر صدیوں کا غم تھما دیا گیا تھا۔اس نے پچھلی رات جائے نماز پہ گزاری تھی۔اللہ سے شکوہ بھی کیا تھا۔پھر اللہ سے دعا کی تھی۔پھر وہ جائے نماز پہ سو گئی تھی۔

ظہر کے بعد ارمغان کے تدفین تھی۔ابھی ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

دروازے کھولتے، سفید شرٹ پہ سیاہ پینٹ پہنے حیدر گھر میں داخل ہوا تھا، ہمراہ سعد تھا۔وہ ایرج کے پاس آیا۔

''ایرج۔۔پلیز کچھ کھالیں۔۔تم نے کل رات سے کچھ نہیں کھایاہوا۔آپ کو دوا بھی کھانی ہے۔''حیدر اس کے قریب بیٹھ کر،آنکھیں زمین پہ گاڑھے کہہ رہا تھا۔

''ارمغان کی باڈی کب آئے گی حیدر بھائی؟''اس کے لبوں پر بس ایک ہی سوال تھا۔حیدر نے لمبی سانس بھری تھی۔

وہ اٹھ گیا۔اس نے آنکھیں نہیں اٹھائی تھیں۔وہ بس بے جان ہوتی آنکھوں سے خلاء میں دیکھتی رہی۔

''وہ جہاں گیا ہے،وہ بہت اچھی جگہ ہے ایرج!''اس نے اٹھتے ہوئے اس کی پشت دیکھتے کہا تھا۔

"مگر اس نے کہا تھا کہ اسے زندگی نہ ملی تو وہ مر جائے گا،" الفاظ پھانس بن کے ادا ہوئے تھے۔

"اور وہ مر گیا۔" ایرج کا دوپٹہ سر سے سر کا تو حیدر نے آنکھیں ہٹا لیں۔

وہ تیز قدموں سے مردانے میں آگیا تھا۔

••••••••••

ایمبولینس سے کفن میں لپٹی اس ڈیڈ باڈی کو نکالا جا رہا تھا۔ میت کی ڈولی اٹھاتے اسے خواتین کے خانے میں رکھا گیا تھا۔

آخری دیدار۔

آخری ملاقات۔

کافور کی خوشبو اس کی ناک کے نتھنوں میں گھسی تو اس نے رفتہ رفتہ اپنا چہرہ پلٹا تھا۔ ہمت نہیں تھی، مگر ہمت کرنی تھی۔ وہ جانتی تھی اس ڈولی میں لاش کس کی ہے، بس وہ یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ اٹھی نہیں۔بس بیٹھی رہی۔وہاں بیٹھی خواتین اٹھی نہیں تھیں۔ارمغان نامحرم تھا۔بس ایرج کی خواہش پہ اسے اندر لایا گیا تھا۔

"ایرج۔۔اسے دیکھ لو۔۔ہمیں پھر باڈی کو لے کر بھی جانا ہے۔"اس کے قریب حیدر سرگوشی کرتا چلا گیا تھا۔

اس نے بے تاثر،ویران آنکھوں سے ارمغان کو دیکھا تھا۔وہ قدم قدم چلتے اس کے قریب آئی۔اس کے قریب بیٹھ گئی۔

("تم نے اچھا کیا،تم نے مجھے ابھی سے مار دیا۔")

اس کے احساس کی مقناطیسیت اس کی کانوں میں بازگشت کرنے لگی۔

("اب دل ہی مر گیا تو روح نکلنے میں کیسی تکلیف ہو گی۔۔")

وہ اس کے چہرے کو دیکھتے رہی۔اس کے لب مسکرا رہے تھے۔آنکھیں بند تھیں۔ وہ بھی مسکرا دی۔

("مجھ سے محبت نہ کرنے کے لیے شکریہ!")

اس کی آواز پہ وہ مسکرائی تھی۔محبت کرنے میں اسے دیر ہو گئی تھی۔محبت بھی ایسی ہوئی تھی کہ محبت کو وہ راس نہیں آئی تھی۔

(”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ایرج۔۔“)

وہ ہنسی تھی، تمام لوگوں نے اسے اچھنبے سے دیکھا تھا۔آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

(”کیچ می ان ہیل،ایکویرس!“)

جہنم؟کون سی جہنم؟جہنم میں تو وہ پڑ گئی تھی۔یاد بھی تو ایک جہنم تھی،اس کی باتیں بھی تو ایک جہنم ہی تھیں۔۔

حیدر زنانے میں آتا اسے دور ہٹانے لگا تھا۔وہ بنا کسی ضد کے پیچھے ہٹ گئی۔چار مرد آنکھیں جھکائے وہاں سے میت اٹھاتے اسے لئے جا رہے تھے۔

"کلمہ شہادت!" حیدر نے مدھم سا کہا تھا۔اس کے کندھوں پہ کتنا بوجھ بڑ گیا تھا۔دل پہ کتنا وزن آ گرا تھا۔

"لا آلہ الا اللہ" سب نے ساتھ کہا تھا۔سرمئی گھر کا آخری مکین بھی گھر سے رخصت ہو گیا تھا۔اب اس گھر میں صرف انجان لوگ باقی رہ گئے تھے۔

"تم واپس کب آؤ گے،ارمغان؟" ایرج زمین پہ ہی لیٹ گئی تھی۔

''جب تم بلاؤ۔'' مدھم سی آواز سرگوشی میں پڑی۔

''جھوٹے۔''وہ مسکرائی۔وہ سونا چاہتی تھی۔اسے نیند آرہی تھی۔

....

ظہر کی نماز کے بعد میت بس انہیں قبرستان تک لے آئی تھی۔قبر تک جاتے ہوئے بھی وہ سب سے آگے تھا۔ایک حصہ کندھے پہ رکھے۔وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ بے تاثر آنکھیں۔

وہی تھا جس نے ارمغان کی لاش کو قبر میں اتارا تھا۔رفتہ رفتہ اس نے کفن کے سارے گٹھے کھول دیے تھے۔

پھر اس نے اس کی چہرے سے کفن ہٹایا۔اس کی مسکراتی صورت واضح ہوئی تھی۔

"تم دیکھنا حیدر! میں اپنے تمام مظالم کا بدلہ لے کر ہی قبر میں اتروں گا۔"

حیدر کی آنکھ سے آنسو ٹوٹ کر کفن پہ گرا تھا۔

جو مر جاتا ہے،اس کی چھوٹی سے ہوتی بات بھی کتنی بڑی اور گہری لگنے لگتی ہے ناں!

اس نے آنکھیں رگڑتے دوسروں کے سہارے سے خود کو باہر کھینچا تھا۔تپتی دھوپ میں چبھن کا احساس ہو رہا تھا۔

سلیب رکھا گیا، سیمینٹ لگائی گئی، مٹی ڈالی گئی۔قبر بنائی گئی۔اور ارمغان ایک دہر سے دوسرے دہر تک انتقال کر چکا تھا۔

ایک باب مکمل ہو گیا تھا۔

زندگی سے ایک شخص نکل گیا تھا۔

وہ سب فاتحہ پڑھ کر روانہ ہو گئے تھے۔حیدر قبر کے سرہانے بیٹھ گیا۔سعد نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"اللہ آسان کرے۔" سعد کی آواز پیچھے سے آئی۔

"اللہ آسان کرے گا۔" حیدر کی آواز نہیں ابھری تھی۔

سورج تپش برساتا رہا۔ نم مٹی سوکھتی رہی۔

....

"میں ابھی کراچی نہیں جانا چاہتا آپی۔" سعد نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔

”ہمارے یہاں رہنے کا اب کوئی جواز نہیں بنتا۔“ سارہ نے اسے سمجھانے کی کوشش۔

”بنتا ہے۔ یہ گھر ارمغان کے نام تھا۔اس نے یہ گھر بہت عرصہ پہلے ہی ایرج کے نام کر دیا تھا۔ یہ آپ لوگوں کی جائز جگہ ہے۔“

حیدر ہاتھ باندھے سارہ سے کہہ رہا تھا۔ سیڑھیوں پہ کھڑی ایرج مسکرا بھی نہ سکی تھی۔

وہ چلا گیا تھا۔ مگر اس کے احسان اسے بار بار ایرج کے قریب لا رہے تھے۔

وہ خاموشی سے سیڑھیاں چڑھتے واپس اوپر آگئی تھی۔اسے کراچی جانا تھا۔پیکنگ کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

اس نے کراچی روانہ ہونے کے لیے ارمغان کا واحد سفید کرتا پہنا تھا جو اس کے ناپ سے بہت بڑا تھا۔مگر ایرج کو اب کیا فرق پڑتا تھا۔

وہ چھوٹا سا بیگ لے کر نیچے آئی تھی۔سامنے سعد اور سارہ کھڑے تھے۔وہ ساتھ نہیں جارہے تھے۔انہیں ابھی وہی گمنام زندگی گزارنی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا۔" سارہ نے اس سے کہا تو وہ بس مسکرادی۔پھر نظر اٹھا کر سعد کو دیکھا تھا۔نم آنکھیں، ستا ہوا چہرہ۔

''کال کرتے رہنا مجھے، میں بھول بھی جاؤں تب بھی۔''اس نے سعد کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے کہا تھا۔وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''تم بہت بہادر ہو۔ایرج، یہ بات یاد رکھنا''سارہ نے اسے ایک اور بار گلے لگایا تھا۔

''یہ بات کیسے بھول سکتی ہوں میں، سارہ؟'' لہجے میں کچھ نہ تھا۔نہ غم نہ خوشی نہ سوگ نہ ہنسی۔

حیدر دروازے سے اندر آیا تھا۔اس کو دیکھ کر ایرج نے سر ہلا دیا۔

اس نے دس دن بعد اس سرمئی گھر سے باہر قدم نکالے تھے۔ دروازے کے قریب سارہ اور سعد اسے جاتا دیکھتے رہے۔ وہ حیدر کے ہمراہ چلتی رہی۔ آنکھوں میں سوجن کم ہو گئی تھی۔ وہ اب بات بات پر مسکرا دیتی تھی۔ وہ کچھ بھولنے اور کچھ نہ بھولنے کی کشمکش میں زندگی بسر کرنے لگی تھی۔

صبر آ جاتا ہے۔ دل کا کیا ہے۔۔ دل تو مر کے بھی سانسوں کو بحال رکھتا ہے۔

وہ اور حیدر ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ باقی تمام لوگ وکٹمز کو لیے حیدر کے شیلٹر میں پانچ چھ دن پہلے ہی آ گئے تھے۔

سفید عمارت بند نہیں ہوئی تھی۔ وہاں تارا نے اسکول چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ حیدر نے ان دس دنوں میں بہت چھان بین کی تھی کہ ارمغان پہ گولی کس نے چلائی۔

دو لوگوں نے خود کو پیش کر دیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ بے قصور ہیں۔

وہ ارمغان کے قاتل کو ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ وہ ڈھونڈ ہی نہیں سکتا تھا شاید۔ کوشش کوشش اور پھر بھی ناکامی۔

"حیدر بھائی۔" ڈرائیو کرتے حیدر نے اس کی طرف کان کیے تھے۔

"آپ کو معلوم ہے کہ ارمغان کراچی میں کس فلیٹ میں رہتا تھا؟" ایرج نے مدھم آواز میں پوچھا تھا۔ اس کا چہرہ دھلا دھلایا، کسی بھی نشان، کسی بھی غم سے پاک لگتا تھا۔ presentable سا چہرہ۔

”یس۔“اس نے یک لفظی جواب دیا۔ایرج سر ہلا کر باہر دیکھنے لگی۔وہ لوگ اندرون لاہور کو کراس کر رہے تھے۔دھلی گیٹ پہ اس کی نظر پڑی تو اس نے فوراً ہی آنکھیں موندلی تھیں۔

”میں تمہاری زندگی میں کہیں بھی نہیں ہوں'ایرج؟“

اس رات ارمغان نے اس سے پوچھا تھا۔

”میری زندگی میں اب تمہارے علاوہ کچھ باقی ہی نہیں رہا'ارمغان۔“اس نے آسمان کی طرف آنکھیں کھولیں تھیں۔

"تم واپس کب آؤ گے۔۔۔ارمغان؟" ایرج کے لب ہلے تھے۔

"جب تم بلاؤ۔" بادلوں میں اس کا مسکراتا چہرہ نمایاں ہوا تھا۔

"جھوٹے۔"اس نے سر واپس گاڑی کے اندر کر لیا۔

....

حیدر نے اس کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو اندر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔حیدر نے ایرج کو راستہ دیا تو وہ ٹک ٹک کرتی اندر قدم رکھتی گئی۔

دروازے سے داخل ہوتے سب سے پہلے ڈرائنگ روم آتا تھا۔اس نے مدھم ہاتھوں سے اس کا سلائڈنگ ڈور کھولا۔اندر بھی سب کچھ خالی تھا۔صوفے لش سے تھے، مگر ویران۔

اس نے وہاں سے قدم اٹھا لیے۔وہ آگے چلتی آئی۔لب آپس میں پیوست تھے۔ چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔

آگے چلتی آئی تو ایک طرف کمرہ تھا دوسری طرف لاونج۔وہ لاونج میں آ گئی۔ سامنے بڑا ٹی وی لگا تھا۔بند۔کرسیاں خالی۔ گیلری کا دروازہ لاکڈ۔ایک طرف کچن تھا۔وہ وہاں بھی نہ ٹھہری وہ ارمغان کے کمرے کو ڈھونڈتی وہاں آ گئی تھی۔

کمرے میں اس کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ایرج کے لبوں کو مسکراہٹ چھو کر گزر گئی۔اس نے الماری کھولی تو وہ کپڑوں اور جرسی سے بھری ہوئی تھی۔اس نے اداسی سے الماری بند کردی۔

نظر اٹھاکر اس نے دروازے کے پار دیکھا تو حیدر اپارٹمنٹ کے وسط پہ کھڑا فون میں الجھا ہوا تھا۔اس نے سر جھٹک دیا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔پھر مسکرائی۔مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی امڈ آئی تھی۔وہ پھر بھی زبردستی مسکرائی۔

آئینے میں اپنا عکس دیکھتے اسے احساس ہوا اس کی پیچھے کوئی کھڑا ہے۔اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

وہاں کوئی نہ تھا۔

اس نے واپس آئینے میں خود کو دیکھا تو منجمد ہو گئی تھی۔اس کے پیچھے وہی کھڑا تھا۔ مسکراتے ہوئے۔ایرج کی آنکھ سے آنسو ٹوٹتے چہرے پہ اور پھر گردن تک پھسل گئے۔

''تم نے کہا تھا تم آؤ گے۔''ایرج نے بہت مدھم سی آواز میں کہا تھا، کہ بس اسی کو سنائی دے۔

"میں تو تمہارے پاس ہی ہوں ایرج۔۔ تمہیں مجھ سے ملنے کا شوق نہیں شاید!"

وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔چہرے کے ایک جانب گڑھے پڑ رہے تھے۔

ایرج کا ہاتھ سفید قمیض کی جیب تک گیا تھا۔وہ کیا کر رہی تھی؟

"مجھے تم سے ہر وقت ملنے کا شوق ہے،ارمغان۔"

اس نے پاکٹ سے وہی زرد نائف نکالی تھی۔اس نے ان پہ موجود خون کے تین قطروں کو دیکھا۔

"تو آجاؤ۔۔مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔۔میں تمہارے پاس ہی تو ہوں!"

ارمغان نے سرگوشی میں کہا تھا۔ایرج نے چہرہ جھکا لیا۔آنکھیں کلائی پہ مرکوز ہو گئی تھیں۔اس نے آستین اوپر کی۔ چھری کلائی تک لاتے اس کی ہاتھ کانپے تھے۔

"ایرج۔۔۔اب چلیں ہم؟"اس کی سماعت سے حیدر کی آواز ٹکرائی۔ایک طلسم ٹوٹ گیا۔وہ حال میں آئی تھی۔

اس نے کلائی دیکھی، پھر چھری۔اس نے فوراسے دونوں کو جدا کیا تھا۔

وہ یہ کیا کر رہی تھی؟

اسی وقت کمرے میں حیدر آیا تھا۔آنکھیں اس کی بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''چلیں؟''اس نے پوچھا۔

''ارمغان نے کہا تھا وہ آئے گا۔میں اس کے اپارٹمنٹ تک آگئی حیدر بھائی۔۔وہ اب تک نہیں آیا!''کہتے ہوئے اس کی حلق میں کانٹا سا پھنسا تھا۔

کمپوزر مشکل ہو رہا تھا۔اس کی بات پہ حیدر خاموش رہا۔

”صبر کریں ایرج۔ صبر انسان کو سب بھلا دیتا ہے۔“ حیدر نے مدھم سی آواز میں کہا تھا، آواز وہی گہری، کھائی سے آتی ہوئی۔

”مگر مجھے اسے بھولنا نہیں ہے! مجھے تو اسے ہمیشہ یاد رکھنا تھا۔۔ میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟“ وہ رو نہیں رہی تھی، بس فریاد کر رہی تھی۔

”محبت کی تکمیل چلتی سانسوں اور کامل زندگی کا وعدہ نہیں کرتی ہے' ایرج۔ کبھی کبھار تو موت ہی وہ آخری نکتہ ہوتا ہے جس پہ آکر زندگی کا دائرہ ٹھہر جاتا ہے۔ موت تو محبت کا سب سے آسان امتحان ہوتی ہے۔۔ کیونکہ یہ جدا نہیں کرتی، بلکہ ہمیشہ کے لیے امر کر دیتی ہے!“

وہ دیوار سے ٹیک لگائے اسے سمجھا رہا تھا، بڑے بھائی کی طرح۔ ایرج کا سر جھکا ہوا تھا۔ خود کو کنڑول کرنے کی کوشش۔

گیٹ کی بیل بجی تھی، وہ دونوں چونکے۔ ایرج بھاگتی ہوئی گیٹ کی جانب بڑھی تھی۔ حیدر اس کی پیچھے۔

اس نے گیٹ کھولا تو کوئی پتلی دبلی سی لڑکی، لگ بھگ بیس سال کی عمر کی، اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھورے رنگ کا بلا تھا۔

"آپ لوگ کون ہیں جی؟" اس لڑکی نے سوال کیا۔ بلا اس کی ہاتھ میں بے بسی سے دبا ہوا تھا۔

"صاحب جی کہاں ہیں؟" اس نے پھر سوال کیا۔ ایرج چپ رہی، الفاظ تلاشنے لگی۔

"ہم ان کے رشتے دار ہیں۔ آپ کون ہیں؟" حیدر نے آگے بڑھ کر لڑکی کو مخاطب کیا تھا۔

"اوہ اچھا اچھا! وہ صاحب جی کافی دنوں سے گئے ہوئے تھے۔۔"

حیدر نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا تو وہ بوکھلا گئی۔

''وہ صاحب جی جب بھی کہیں باہر جاتے تھے تو اپنا بلا ہمارے حوالے کر دیتے تھے۔ مجھے لگا وہ آ گئے تو انکا بلا واپس کرنے آ گئی۔'' وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے، بلا سامنے کرتے ہوئے کھسیانا سا ہنسی۔

ایرج نے فوراً اسے دم سادھے دیکھتا تھا۔

''میرے پاس ایک بلا بھی ہے، بھورے رنگ کا۔ اور وہ برابر والوں کے یہاں بار باران کی کیاری گندی کرتا ہے۔ حد کا نکما سست اور آوارہ بلا ہے، مگر بہت پسند ہے مجھے۔''

ارمغان نے اسے اپنے بلے کے بارے میں بائیک کے سفر کے درمیان بلند آواز میں بتایا تھا۔ وہ اپنے بلے کا ذکر کرتے کھسیانا سا ہنسا بھی تھا۔

ایرج کو وہ پھر یاد آیا تھا۔اسکی ہنسی،اسکا چہرہ،اسکا ہر کچھ۔۔۔

"یہ آپ لوگ انہیں دے دیجیے گا۔ ہمیں تو بڑا پریشان کرتا ہے جی۔اچھل کود کرتا اودھم مچاتا رہتا ہے۔پورا گھر سر پہ اٹھالیتا ہے۔"لڑکی بتانے لگی۔

ایرج نرمی سے مسکرائی تھی۔پھر اس نے آگے بڑھ کہ بلا تھام لیا تھا۔گبی آرام سے اس کی گود میں آگیا تھا۔

حیدر اتنے دنوں بعد پہلی بار مسکرایا تھا۔

”ویسے صاحب کہاں گئے ہوئے ہیں۔۔اتنے دن ہو گئے ہیں۔۔اب تک نہیں آئے؟“لڑکی نے ایک اور سوال کیا۔

”ان کا انتقال ہو گیا ہے۔“اور لڑکی کا منہ کھل گیا۔حیدر نے معذرت کرتے دروازہ بند کر دیا تھا۔لڑکی بھاگی بھاگی اپنی مالکن کو خبر پہنچانے دوڑی تھی۔

حیدر دروازہ بند کرتے اندر آیا تو ایرج سامنے،زمین پہ بیٹھی ہوئی تھی۔گبی کو اپنی گود میں سہلا رہی تھی۔

”اس نے کہا تھا وہ میرے قریب ہے،شاید سہی کہا تھا۔“

ایرج کی آنکھوں سے آنسو بہہ اٹھے تھے۔ حلق میں پھانس اٹکی۔

حیدر اسے اداسی سے اس کی پشت دیکھتا رہا تھا۔

....

فاطمہ منزل اس کے سامنے آرکی تھی۔

''کوئی بھی پریشانی ہو تو میرا نمبر آپ کے پاس موجود ہے۔'' حیدر نے سامنے دیکھتے کہا۔

"اندر نہیں آئیں گے؟" ایرج نے تعجب سے پوچھا۔

"ویسے تو میں چائے کبھی منع نہیں کرتا مگر پھر کبھی، ابھی سر پہ بہت کام ہے۔"

ایرج سر ہلاتے، گبی کو ہاتھ میں تھامے گاڑی سے اتر گئی تھی۔

گبی ہاتھ میں اچھل کود کر رہا تھا۔ اسے سنبھالنا ایک عذاب ثابت ہو رہا تھا۔ گبی کو وقت لگنا تھا اپنے نئے مالک کے ساتھ گھل ملنے میں۔ وہ بار بار میاؤں میاؤں کرتا ایرج کو دیکھ رہا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ گبی اس کی شکل میں کس کا عکس تلاش کر رہا ہے۔

ایرج نے بیل بجائی تھی۔

وہ ایک زندگی گزار آئی تھی۔

واپس اپنے گھر واپس لوٹ آئی تھی۔

جہاں اسے آنا تھا!

••••••••••

چار سال بعد

زندگی بھی پھر نہیں رکی۔اس کے مرنے کے بعد بھی وہ جیتی رہی،اس کی سانسیں چلتی رہیں۔وہ جذباتی باتیں ہوتی ہیں کہ ایک انسان کے مر جانے پر اس کا عاشق سولی چڑھ جائے گا یا وہ بھی دنیا کو خیر باد کر دے گا۔ایسا نہیں ہوا تھا۔وہ زندگی سیکھ رہی تھی۔ایک بار پھر۔وہ جینا سیکھ رہی تھی۔

اس کی زندگی میں ایک خول سا آگیا تھا۔دل کے پاس۔وہ اسے نظر انداز نہیں کر پائی تھی۔نہ بھلا پائی تھی۔بس اس کی ساتھ وہ جی رہی تھی۔

سارہ اور سعدان چار سالوں تک بے نام لاہور میں ہی رہے تھے۔مریم چاچی کا انتقال ہو گیا تھا۔حنا بیمار رہنے لگی تھیں۔ابا ایرج کو دیکھ کر اداس ہو جاتے تھے۔ان چار سالوں میں اس نے ابا کی گود میں سر رکھ کر انہیں سب بتایا تھا۔اس نے کیا کیا

جھیلا، کیا کیا سیکھا۔ سب کچھ۔ حنا اسے زندگی کی طرف گامزن ہونے کے مشورے دیتی رہتی تھیں۔

وہ ان کی ان چھوٹی چھوٹی کوششوں پہ مسکرادیتی۔ دانیال ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ اسے اپنی پڑھائی مکمل کرنا تھی۔ یا شاید پڑھائی صرف ایک بہانہ تھا۔

فاطمہ منزل سے کس کا دم نہیں گھٹتا تھا۔

وہ تین لوگوں کی فیملی اس گھر کو واپس آباد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ رات کو چھوٹی سی محفل لگاتے جہاں پورے دن کی روداد وہ تینوں ایک دوسرے کو سناتے تھے۔

حنا کو انگزائٹی اٹیکس ہوتے تھے۔ان سے اب کوئی کام ٹھیک سے نہیں ہو پاتا تھا۔

کبھی کبھی ایرج سوچتی تھی کہ وہ انہیں سعد کے بارے میں بتادے۔کال پہ جب وہ اس سے بات کرتی تو وہ اسے مائل کرنے کی کوشش کرتی تھی،وہ آگے سے کہتا تھا کہ وہ سب کو لیکر لاہور آجائے۔دونوں طرف مسئلے ہی تھے۔بات وہیں اٹک جاتی تھی۔

ایرج اب حنا کا کام میں ہاتھ بٹانے لگی تھی۔لوگو ڈیزائنگ اس نے عرصہ ہوا، چھوڑ دی تھی۔اب کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔

دل ارمغان کی گھڑی سے لیکر ارمغان کے پرفیوم تک آکر ختم ہو جاتا تھا۔ کتنی ہی سرگرمیوں میں اس نے حصہ لینے کی کوشش کی تھی، مگر چار سال بعد بھی اس کا پسندیدہ کام اسے یاد کرنا ہی رہا تھا۔

وہ کمرے میں بیٹھے، لیپ ٹاپ پر کچھ دیکھ رہی تھی جب دروازے پہ جاوید نے دستک دی تھی۔

''وہاں کیوں کھڑے ہیں۔۔آئیں۔۔'' وہ پاؤں سمیٹتے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔ جاوید مسکراتے ہوئے اس کی قریب آئے تھے۔اس کی سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار کیا، پھر اسی کے پاس بیٹھ گئے۔

''کیا کر رہی تھی بیٹا۔'' انہوں نے بغور اسے دیکھتے کہا تھا۔چشمہ اتار لیا گیا۔

''کچھ نہیں، سوچ رہی تھی کچھ جوتے خرید لوں۔'' وہ مدھم سا مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔۔

''ہاں تو لے لو!'' انہوں نے اس سے کہا۔ لہجے میں شفقت تھی۔

''دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ مسکراتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی۔

''اچھا۔۔ ایرج۔۔۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔'' وہ اس کی سامنے ہچکچاتے ہوئے بولے تھے۔

ایرج کی مسکراہٹ سمٹی۔وہ انہیں بغور دیکھنے لگی۔

"جی، بولیں۔"

"ایرج۔۔میں اور حنا چاہتے ہیں کہ۔۔تم شادی کر لو بیٹے اب۔"انہیں نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ایرج ایک پل کے لیے ساکت ہوئی تھی۔

"دیکھو بیٹے۔۔انسان اپنی زندگی میں بہت سے فیزز سے گزرتا ہے۔اس کے بہت سے پلیژر ہوتے ہیں۔۔مگر اسے ہر کوئی وہ نہیں مل جاتا جس کی وہ خواہش رکھتا ہے۔انسان جیتا ہے، مر جاتا ہے۔۔مگر دنیا تو چلتی رہتی ہے ناں؟"

ایرج نے سر جھکائے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تمہارے لیے میں اور حنا کافی عرصے سے رشتہ دیکھ رہے تھے۔اور جو رشتہ تمہارے لیے آیا ہے۔۔وہ ہمارے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں بھی وہ لڑکا اچھا ہی لگے گا۔میں تم پہ کوئی حکم یا کوئی زبردستی نہیں مسلط کروں گا۔مگر میں چاہتا ہوں کہ اب تم اس بارے میں سوچو بیٹا۔۔چار سال ہو گئے ہیں اس واقعے کو۔اگر تم اسے بھولنے کی کوشش نہیں کرو گی تو تم زندگی بھر اسے بھول ہی نہیں پاؤ گی۔۔"

وہ سر جھکائے ہنوز خاموش رہی تھی۔۔

"زندگی بہت حسین ہے، ایرج! تم بس کمرے سے قدم باہر تو نکالو۔ تم اللہ سے دعا تو مانگو۔ تمہیں سب کچھ مل جائے گا۔ سب کچھ۔" وہ اس کو اداسی سے دیکھتے سمجھا رہے تھے۔

"میری بات پہ سوچنا ضرور۔ لڑکے کی تصویر بھی ہے، تم دیکھنا چاہو تو حنا کے پاس بھی ہوگی۔" وہ اس کے سر پہ دوبارہ ہاتھ رکھ کر، اسے دعائیں دیتے باہر نکل گئے تھے۔

وہ ان کے جانے کے بعد بھی خاموش رہی تھی۔

وہ ان کو نہیں بتا سکتی تھی کہ کیسے آج بھی ارمغان کا نام سنتے اس کا دل رک جایا کرتا تھا۔

وہ ان کو نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اسے بھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

وہ ان کو کیسے بتاتی کہ اسے زندگی میں سب کچھ نہیں چاہیے تھا۔اسے ارمغان چاہیے تھا۔جو زندگی کا اصل حقدار تھا۔

اس نے سر کو دونوں پاؤں کے پہاڑ کے بیچ رکھ دیا۔وہ رو نہیں رہی تھی۔اب آنسو نہیں بہتے تھے۔اب بس سر پھٹتا تھا اس کی یادوں سے۔دل جلتا تھا اس کی باتوں سے۔

وہ کہیں پھنس سی گئی تھی،دماغ اور دل دونوں پہ بوجھ سا آن گرا تھا۔

....

وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ارمغان کا پرفیوم چھڑک رہی تھی۔پورا کمرہ اس کی مہک میں گھل مل گیا تھا۔جب وہ اسے گلے لگایا کرتا تھا تب بھی یہی خوشبو اٹھتی تھی اس سے۔جب وہ آخری سانسیں لے رہا تھا،تب بھی یہی خوشبو اٹھی تھی اس سے۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑے اب اپنے بال بنا رہی تھی کہ اس کے پیچھے وہی آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ روز آیا کرتا تھا۔اس سے باتیں کرتا تھا۔اس کا حال پوچھتا تھا۔اور پھر مٹی کی طرح ذرات بن جاتا تھا۔آج بھی آیا تھا۔مگر آج اس کی چہرے پہ ہر بار کی طرح مسکراہٹ نہیں تھی۔آج اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔

ایرج نے اسے فکر مندی سے دیکھا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا؟"اس نے اس کی عکس سے پوچھا۔

"تمہارے لیے رشتہ آیا ہے ناں ؟"اس نے سنجیدہ آواز میں پوچھا۔بھنویں اکھٹی تھیں۔

وہ اس کی بات پہ ٹھٹک گئی۔ پھر اسے بغور دیکھنے لگی۔

”تمہیں میرے لیے رشتہ آنا برا لگا؟“ اس نے ارمغان سے پوچھا تھا۔

”مجھے تمہارا ایک رشتے کو لیکر پریشان ہونا برا لگا۔“

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھے گئی تھی۔

”تم ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی اتنا پریشان ہو جاتی ہو۔ مجھے تم پریشان اچھی نہیں لگتی ہو۔ تم زندگی کیوں نہیں جیتی ہو؟“ وہ سوال کر رہا تھا۔ اس کے پاس جواب ہی نہیں تھا۔

"میں اب زندگی کیسے جی سکتی ہوں ارمغان؟" وہ حیران سا اسے دیکھے گئی۔

"کیوں نہیں جی سکتی؟ میں تمہارا ماضی ہوں ایرج! تم مجھے بھولو نہیں۔۔ مگر مجھے اپنے حال پہ حاوی بھی تو مت کرو!" وہ اسے سمجھانے لگا۔

"ماضی کی یاد کو دل و دماغ کے کونے پہ سمیٹ لیا جاتا ہے۔ اسے دل و دماغ کی پوری دنیا پہ طاری نہیں کیا جاتا۔"

ایرج کے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

”میرا ماضی ہی میرا حال ہے۔۔۔“

”نہیں! تمہارے اتنے اچھے، اتنا کیئر کرنے والے ابو تمہارا حال ہیں، تمہاری خوشی کے لیے تمہارے لیے دعا کرنے والی تمہاری ماں تمہارا حال ہیں۔ میں تو کچھ نہیں ہوں۔ بس ایک یاد ہوں۔ بس ایک ملاقات ہوں۔“ وہ اسے سرگوشیوں میں سمجھا رہا تھا۔ اس کی آواز ایرج پہ حاوی ہونے لگی۔

”میں تمہیں بھول نہیں پائی ہوں ارمغان!“ اس نے سر جھکایا۔ اپنے عکس سے بھی آنکھیں ملانا دشوار ہو رہا تھا۔

”تم نے مجھے بھولنے کی کوشش ہی کب کی ہے، ایکویرس!“ وہ مدھم سا مسکرایا۔

”میں تمہیں بھول جاؤں گی، تو زندگی ختم ہو جائے گی۔“ وہ دفاع میں بولی تھی۔

”تم مجھے بھول جاؤ گی، تب ہی تو زندگی شروع ہو گی!“ وہ اب ڈھول بنتا جا رہا تھا۔

”اپنی زندگی جیو ایرج۔ مجھے اچھا لگے گا جب تم خوش رہو گی۔“

وہ کچھ نہ بول سکی تھی۔

”تم واپس کب آؤ گے ارمغان؟“ اس نے وہی سوال دہرایا تھا۔

”جب مجھے لگے گا، کہ میری زندگی نے زندگی کو قبول کر لیا۔“

اس کا جواب اس بار مختلف تھا۔ وہ دھول بن کر خلاء میں غائب ہو گیا۔

ایرج تنہا رہ گئی تھی۔ اس کی آواز کانوں میں جھوم رہی تھی۔ جھومتی رہی تھی۔

....

”آپ شاہزیب کی امی کو میری طرف سے ہاں بول دیں، امی۔“

پچھلی رات حنا نے اسے شاہزیب کی تصویر دکھائی تھی۔ وہ اچھا، خوش شکل سا لڑکا تھا۔ نیوی بلو کوٹ پینٹ پہ سیاہ چشمہ جمائے۔ ایرج کو اس میں ارمغان کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

وہ پوری رات اس رشتے اور ارمغان کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ عشاء کے بعد استخارہ کر کے وہ سوئی تھی۔ اور صبح ذہن میں کوئی غلط فہمی نہ رہی تھی۔ وہ ناشتہ بناتی اپنی امی سے برابر آ کر انہیں کہہ رہی تھی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو ناں ایرج!" ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اتنے عرصے بعد اس نے حنا کو کھل کر مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ ان کی خوشی پہ خود بھی ہنس دی۔

"اگر آپ لوگوں کو بہتر لگتا ہے، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

شام کو جاوید جب آفس سے آئے تو انکے چہرے پہ بھی خبر سن کر خوشی کے آثار تھے۔ایرج کو خود سے لگاتے وہ اسے دعائیں دے رہے تھے۔

"مجھے معلوم تھا میری بیٹی صحیح فیصلہ کرے گی۔"

ایرج نے آنکھیں موندلی تھیں۔اسے آنکھوں کے پردے کہ پیچھے ارمغان کا مسکراتا چہرہ نظر آیا تھا۔

وہ بھی مسکرادی۔

''خوش؟''ایرج نے پوچھا تھا۔

''تم خوش؟''ارمغان نے الٹا سوال کیا۔ایرج نے سر ہلا دیا۔

''پھر میں بھی خوش۔''اس کا چہرہ گم ہو گیا۔

....

دو ماہ بعد آج اس کا نکاح تھا۔بہت سادگی سے رسم کا اہتمام کیا گیا تھا کیونکہ لڑکے والوں کی طرف سے کوئی مانگ نہیں تھی۔فاطمہ منزل میں قاضی آرہا تھا۔

وہ چار سال بعد تیار ہو رہی تھی۔دل سے۔آئینے کے سامنے کھڑے کیوٹیکس جماتے مسکرا رہی تھی۔اس کی ملاقات شاہزیب سے ہوئی تھی اور سچ بات تھی اسے شاہزیب کا خلوص بہت متاثر کر گیا تھا۔

حیدر اور النساء نے بھی اس کے نکاح میں شرکت کی تھی،اس نے انہیں خاص طور پر بلوایا تھا۔حیدر اولوِ گرین رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس ہر بار کی طرح گریس فُل لگ رہا تھا۔النساء نے اپنی آنکھوں کے رنگ کی طرح سرمئی رنگ کا سادہ سا جوڑا پہن رکھا تھا۔

ایرج نے ٹھان لی تھی کہ رخصت ہونے سے پہلے وہ حنا کو سعد اور سارہ کی سچائی بتا دے گی۔ہمت نہیں ہو رہی تھی،مگر یہ کام اسے لازماً کرنا تھا۔

دروازہ بند تھا۔انساء اس سے مل کر ابھی ہی باہر کو گئی تھی۔وہ بھی مطمئن سا تیار ہو رہی تھی

کہ اس کے پیچھے وہ آج پھر آگیا تھا۔

اسے دیکھ کر آج وہ ایک بار پھر مسکرائی تھی۔

اس نے ارمغان کے چہرے کو نوٹ نہیں کیا تھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے بے اختیار سوال کیا تھا۔

”زہر۔“اس کے جواب پر اس نے چونک کر ارمغان کو دیکھا۔

”تم کسی اور سے شادی کیسے کر سکتی ہو ایرج؟“اس کی بات پر وہ بالکل گنگ رہ گئی تھی۔اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

”تم اپنا وعدہ کیسے بھول سکتی ہو؟“اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔۔

”مگر۔۔۔مگر تم نے کہا تھا کہ۔۔“وہ ہکلا گئی تھی۔

”میں نے تمہیں خوش رہنے اور زندگی جینے کا کہا تھا۔شادی کرنے کا نہیں!“اس نے حتمی لہجے میں کہا،وہ ششدر سی اسے دیکھتے گئی۔

"تم۔۔ تم نے۔۔"

"تم سے جتنی محبت میں نے کی ہے اتنی کوئی نہیں کر سکتا۔۔اور تم کسی اور کی دلہن بن رہی ہو۔۔ کسی اور کے لیے سج رہی ہو۔۔ کسی اور کی ہو رہی ہو؟"

ایرج کو ایسا لگا کہ اس کی پاؤں سے جان نکل جائے گی۔اسے حبس کا احساس ہوا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

"تمہیں میرا بالکل احساس نہیں ہے ایرج؟" ایرج کو ایسا لگا کہ وہ ارمغان نہیں دوروس ہے۔

"ایسا نہیں ہے۔۔۔"

"وہ چھری کہاں ہے جو میں نے تمہیں دی تھی۔"ارمغان نے اس کی بات کاٹتے کہا تھا۔اس کی بات پہ وہ سن ہو گئی۔

"نکالو اس چھری کو۔"ایک حکم سادر ہوا۔اور وہ دراز کھول کر وہ زرد چھری نکال چکی تھی۔ان پہ ارمغان کے خون کے تین قطرے آج بھی واضح تھے۔

"تم صرف میری ہو ایرج!تمہیں مجھ تک ہی آنا ہے۔تم صرف مجھ سے محبت کر سکتی ہو۔۔کیا تمہیں میرا یقین ہے؟"

ایرج نے سر ہلایا تھا۔مگر اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ارمغان آج اتنا غصہ کیوں کر رہا تھا۔۔؟

"تو جیسا میں کہوں۔۔ویسا کرو۔"ایک اور حکم سادر ہوا۔اس نے سر ہلایا تھا۔

باہر شور سا برپا ہوا تھا۔شاید لڑکے والے مسجد سے آ گئے تھے۔

"اپنی کلائی سامنے کرو۔۔اور اس پہ چھری پھیرو۔"

اس کی بات پہ ایرج کا جسم لرزا تھا۔وہ یہ کیا کروا رہا تھا اس سے؟

"مگر ارمغان میں مر۔۔۔"

"تمہیں ہمیشہ شکایت رہتی تھی کی میں تھوڑے وقفے کے لیے تم سے ملنے آتا ہوں۔۔اب تم ہمیشہ کے لیے میرے پاس نہیں آنا چاہتی۔۔۔"

ایرج کو پسینے آنے لگے تھے۔سر سے دوپٹہ پھسل رہا تھا۔

"ہاں مگر مجھے یہ سب ٹھیک۔۔۔۔"

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

کمرے میں حبس بڑھتا جارہا تھا۔شور مدھم ہوتا جارہا تھا۔ارمغان کی آواز اطراف میں طاری ہوتی جارہی تھی۔گھٹن بڑھتی گئی۔ایرج نے ہاتھ گلے پہ مسلا تھا۔اسے سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی۔

"بہت ہے۔۔بہت زیادہ۔" اسنے بوکھلاہٹ میں کہا تھا۔سانس پھولنے لگا۔

"تو تم وہی کرو جو میں نے کہا۔۔" وہ آئینے کے سامنے کھڑا گھور کر اسے دیکھ رہا تھا۔ چہرہ اب بھی پتھریلا سا تھا۔

"میں تمہیں کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتا،ایکویرس۔"

ایرج نے نائف اپنی کلائی پہ رکھی تھی۔

''میں بھی تم سے بچھڑ نہیں سکتی ارمغان۔۔''ہاتھ پہ زور بڑھ رہا تھا۔دماغ پھٹنے لگا۔

''meet me in hell, aquarius''

اس نے آئینے کے طرف دیکھا۔وہ اب پہلی بار مسکرایا تھا۔ایرج بھی ہلکا سا مسکرائی۔

".I will catch you in hell, Aries"

اور اس نے چھری کو جارحانہ انداز میں اپنی کلائی پہ پھیرا تھا۔

ایک بار۔

دو بار

اور پھر تیسری بار اس کی ہاتھ میں دم ختم ہو گیا۔کلائی سے خون کا فوارہ اس کے کام دار جوڑے کو سرخ کر گیا تھا۔

وہ بے دم ہوتی زمین پہ گری تھی۔خون بہہ بہہ کر زمین پہ نہر بنا رہا تھا۔

اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔اس نے ہاتھ کو بے جان کر دیا۔ جسم سے درد اٹھنے لگا۔

آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔ منظر گم ہونے لگا۔اسے ارمغان دکھائی دیا تھا۔وہ مسکرارہا تھا۔

ایرج بھی مسکرادی۔

اس کی سانسوں کی مالا اکھڑ رہی تھی۔اسے اپنا آپ کھائی میں جاتا محسوس ہوا۔اس کی آنکھیں مکمل بند ہوئی تھیں۔۔۔

سانسیں رکنے لگیں۔منظر اندھیر ہو گیا۔۔۔

اور پھر۔۔

....

اور پھر اس کی آنکھیں کھلی تھیں!

چہرہ سفید،آنکھیں جیسے قبول ہی نا کر پا رہی ہوں کہ جو اس نے دیکھا وہ حقیقت تھا یا خواب۔

"تم۔۔۔تم نے کچھ نہیں دیکھا سارہ؟"۔وہ جیسے سمجھ ہی نہیں پائی ہو کہ جو منظر چند لمحوں پہلے اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا تھا،اچانک اوجھل کیسے ہو گیا۔

"کیا نہیں دیکھا؟تم کس چیز کی بات کر رہی ہو؟"-اس کو بھی جیسے سمجھ نا آیا ہو کہ ایسا کیا ہوا تھا جو وہ اتنی شاکڈ تھی۔

"وہ۔۔۔حادثہ؟تم نے نہیں دیکھا؟میں سچ کہہ رہی ہوں،میرے سامنے ایک حادثہ پیش آیا تھا سارہ،ابھی ابھی جب تم آرڈر لینے گئی تھی"۔وہ صدر کی قدیم سڑک پر موجود ایک انتہا کے ہجوم کو اشارے کے حصار میں لائے کہہ رہی تھی۔

"میں نے خود دیکھا تھا کہ ایک عورت گاڑی سے ٹکرا کر دور پھنکا گئی۔اس کی سر سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔۔۔اور پھر۔۔۔"

ایرج کی آواز تھم گئی۔ بالکل تھم گئی۔اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ یہ سب کہیں دیکھ چکی ہے۔ بالکل وہی جگہ، وہی سانحہ۔۔وہی الفاظ۔۔۔وہی گفتگو۔

ایرج کی دنیا تھم گئی۔اس نے ہونقوں کی طرح کیفے کو طائرانہ نگاہ سے دیکھا تھا۔ سب بالکل ویسے ہی تھا۔ بالکل حقیقت۔۔یا پھر خواب۔۔؟

اس کا چہرہ دیکھ کر سارہ پریشان ہوئی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا اچانک۔۔تم کس حادثے کی بات کر رہی ہو ایرج۔۔؟"اس نے بھنویں اکھٹی کیے پوچھا تھا۔ہاتھ میں ڈونٹ تھامے ہوئے۔۔

"وہ۔۔۔ابھی۔۔۔" وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔کچھ بول نہیں پائی تھی۔ لفظوں نے ساتھ نہیں دیا تھا۔اس نے پھر سے باہر دیکھا تھا۔اسے لگا وہ سب واپس دیکھ رہی ہے۔ بالکل اکزیکٹ۔ سیم ٹو سیم۔

"تم پھر سے ہیلیو سینیٹ کرنا شروع ہو گئی ہو ناں؟"

ایرج کی سانسیں تھمی تھیں۔۔

نہیں۔۔۔

ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔

وہ سب۔۔۔وہ سب خواب نہیں ہو سکتا۔۔

وہ اتنی بے خبر نہیں ہو سکتی۔۔

وہ تمام لوگ۔۔۔وہ تمام لوگ خواب نہیں ہو سکتے۔۔

اور پھر اسے وہ یاد آیا تھا۔وہی جس کی وجہ سے وہ ''حقیقت'' میں آئی تھی۔

“catch me in hell, aquarius.”

اس کی دماغ میں جھماکے ہو رہے تھے۔اس کی آنکھیں صدر کی سڑک پہ مرکوز کیں،وہ سڑک لوگوں کے ہجوم میں کھو گئی تھیں۔۔

"سارہ۔۔۔اٹھو۔۔چلو۔۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے اٹھی تھی۔سارہ پیچھے ہائیں ہائیں کرتے سوالات کرتی جارہی تھی، مگر اس کی پاس کوئی جواب نہیں تھا۔انکشاف کے بعد صرف سوال اٹھتے ہیں، جواب نہیں ملتے۔

وہ دروازے کی طرف بڑھی رہی تھی کہ دروازہ اندر کی جانب دھکیلے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

اس کی سانس اٹک گئی۔

••••••••••

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی۔

کوئی اس کی آنکھ کھلنے پر باہر کو بھاگا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کی ساتھ کیا ہوا ہے۔وہ ہسپتال کا بستر تھا۔اس نے دیکھا تھا۔اس کے ہاتھ سے کینولا جڑا تھا۔

وہ زندہ بچ گیا تھا؟وہ گولی کھا کر مرا نہیں تھا؟

اس کے چہرے پہ ہزار رنگ بکھرے تھے۔وہ زندہ بچ گیا تھا!ہاں!ایسا ہی ہوا تھا۔

اس نے اٹھ کے بیٹھنے کی کوشش کی تو دروازے سے تارا داخل ہوئی تھی۔وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"اوہ گاڈ سر! تھینک گاڈ!" وہ آنکھوں میں نمی اور چمک لیے خوشی سے کہہ رہی تھی۔

ارمغان اسے دیکھ کر ہنسا تھا۔اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ زندہ کیسے بچ گیا۔اسے گولی بہت شدت سے لگی تھی مگر درد کا کوئی نام ونشان بھی نہ رہا تھا۔

"تارا۔۔ایرج کہاں ہے؟" اس نے تعجب سے سوال کیا تھا۔وہی تو اس کو ہسپتال لیکر آئی تھی۔اور اب جناب خود غائب تھیں۔

تارا کے آنکھوں میں نا سمجھی ابھری۔۔

"سر۔۔۔کون ایرج۔۔؟"تارا نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔

ارمغان کو اس کی بات پہ اور تعجب ہوا۔وہ تو ایرج کو جانتی تھی ناں؟

"جس کو میں ہمارے آفس لایا تھا۔۔۔جو مجھے یہاں شوٹ ہونے کے بعد لائی تھی۔۔وہ اور حیدر۔۔دونوں کہاں ہیں؟"اس نے اب وضاحت دی تھی۔

تارا کو کچھ سمجھ نہ آیا تھا۔

"سر آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔۔۔؟ آپ کو گن شاٹ نہیں کیا گیا تھا آپ کا گاڑی سے ایکسیڈینٹ ہوا تھا۔۔اور آپ کو ہسپتال میں اور مرجان لے کر آئے تھے۔۔اپ ٹو ویکس سے کوما میں ہیں سر۔۔آپ کو ابھی ہوش آیا ہے۔۔"تارا نے کھل کر بتایا تھا۔

ارمغان کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔وہ مسکرا کر کہنا چاہتا تھا کہ وہ مزاق کر رہی ہے۔ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کوما میں ایک طویل خواب دیکھ رہا ہو۔ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔۔؟

مگر پھر اس کے لرزتے ہاتھ پیٹ تک گئے تھے۔ شرٹ اٹھا کر اس نے ایبز کی جانب چھو کر دیکھا۔ وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی، جیسے کوئی زخم سرے سے تھا ہی نہیں۔

اس نے چادر اٹھا کر وہاں دیکھا۔

وہاں کوئی زخم نہ تھا۔ وہاں کوئی نشان نہ تھا۔

اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے بے اختیار اپنا سر تھاما تھا۔ وہاں پٹی بندھی تھی۔ اس کی سر میں درد کی ٹھیس اٹھی۔

”سر آپ ٹھیک تو ہیں؟“ تارا آگے کو آئی تھی۔

”تارا۔۔وہ۔۔وہ سب۔۔“وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، لفظ ادا نہ ہوئے۔

اس نے چادر ہٹا کر بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کی۔

”وہ سب ایک خواب نہیں ہو سکتا۔“”وہ“بس ایک خواب نہیں ہو سکتی۔اسے ہونا چاہیے۔وہ میرے ذہن کا تخلیق کردہ کردار نہیں ہو سکتا۔۔وہ۔۔۔سب۔۔۔وہ سچ ایک جھوٹ نہیں ہو سکتا۔۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سر پلیز ابھی نہیں اٹھیں، یو نیڈ سم ریسٹ۔" وہ ارمغان کو شانوں سے تھامے واپس بٹھانے ہی لگی تھی کہ ارمغان نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"تارا۔۔ میرے لیے کراچی کی سب سے ریسنٹ فلائٹ بک کرواؤ۔ جلدی۔" وہ کہتے ہوئے ہاتھ سے کنولا الگ کر رہا تھا۔

"بٹ سر ابھی آپکی طبعیت۔۔۔"

ارمغان نے اسے گھورا تھا تو وہ "اوکے سر" کرتی بھاگی بھاگی کمرے سے نکلی تھی۔

"منظر جھوٹے ہو سکتے ہیں۔۔۔ محبت جھوٹی نہیں ہو سکتی۔"

اس نے خود کلامی کی تھی۔

”میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔۔۔تم۔۔۔کہاں ہو ایرج؟“

وہ کہتے ہوئے مسکرایا تھا۔انجان سی مسکراہٹ۔ایک اور موقع۔محبت مل گئی تھی، بس اسے تلاشنا باقی تھا۔۔!

••••••••••

کراچی پہنچتے ہی وہ سب سے پہلے فاطمہ منزل کی جانب گاڑی گھمار ہا تھا۔فون بار بار میسج اور کالز سے بجا جار ہا تھا مگر اسے فکر نہ تھی۔

اسے فکر بس ایک چیز کی تھی۔

''اگر وہاں کوئی فاطمہ منزل سرے سے ہوا ہی نہ تو؟''اس نے خود سے سوال کیا تھا،اندیشہ بیان کیا تھا۔

گاڑی دھیمی رفتار میں چل رہی تھی۔سر پہ پٹی بندھی تھی جس کے اندر سے سرخ خون کا نشان واضح ہو رہا تھا۔

ایک ''زخم'' نے اس کی زندگی پلٹ کر رکھ دی تھی۔

وہ فاطمہ منزل کی جگہ پہنچا تھا۔اور وہاں کھڑی فاطمہ منزل کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

''یس! آئی نیو اٹ۔'' وہ اسٹیرنگ وہیل پہ ہاتھ مارتا، آنکھیں بند کرتا وہ پل محسوس کر رہا تھا۔

گاڑی سے اتر کر اس نے اپنی منزل کی بیل بجائی۔دروازہ چند لمحوں بعد ہی کھل گیا تھا۔

وہ سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ٹھٹکا۔

سیاہ ٹراوزر پہ سیاہ بٹن شرٹ جسکے پہلے تین بٹن کھلے ہوئے تھے۔اس کی گردن سے کوئی لاکٹ لٹک نہیں رہا تھا۔

ارمغان ارحم کو دیکھ کر مسکرایا۔وہ سب جھوٹ تھا۔

ارحم سامنے کھڑے انجان شخص کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔وہ انجان شخص ہنس رہا تھا۔

"جی بھائی؟ آپ کون؟" ارحم نے انجان سے لہجے میں پوچھا۔ وہ اسے نہیں جانتا تھا۔

ارمغان کو ہوش آیا تو اس کا منہ بند ہوا۔

"ایرج گھر پہ ہے؟" اس نے سوال کیا تھا۔ وہ خود کنفیوزڈ تھا۔ اگر وہاں کوئی ایرج رہتی ہی نہ ہوئی ہو تو؟

ارحم اس کی بات پہ ٹھٹکا۔

"نہیں وہ کزن کے ساتھ شاپنگ گئی ہے۔۔آپ کون ہو؟"ارحم نے اسے نا سمجھی سے دیکھا۔

"میں ایرج کا دوست ہوں۔لوگو ڈیزائنگ پارٹنر۔"

ارمغان نے اندھیرے میں تیر چلایا۔اسے کوئی اور بہانہ ملا ہی نہ تھا۔

ارحم نے سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"اوکے۔وہ آجائے گی تو میں اسے انفارم کر دوں گا۔"ارحم نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

ارمغان کو معلوم تھاوہ کہاں ہو گی اس وقت۔اسے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی، سب کچھ واضح تھا۔بس سے ڈھونڈنا تھا اسے۔

ارمغان نے سر ہلایا تو وہ ''خداحافظ'' کرتے گیٹ بند کرنے لگا تھا۔اس نے ایک اور باراس کی کھلی گردن اور سینے کو دیکھا تھا۔

وہاں کوئی لاکٹ نہ تھا۔اس نے لمبی اطمینان بخش سانس خارج کی۔

گاڑی میں آکر بیٹھتے اس نے گاڑی موڑ دی تھی۔

ہم سب کو معلوم ہے وہ اب کہاں جا رہا تھا۔

....

صدر کی سڑکوں پہ ہجوم دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔اسے ہر وہ بات یاد آ رہی تھی جو اس کی حقیقت میں نہیں دیکھی تھی۔

زندگی کا کیسا دستور تھا کہ اسے اپنا خواب جینے کو مل رہا تھا۔یہ کیسا بساط کا پلٹ جانا تھا کہ جو اس سے چھین لیا گیا تھا وہی اسے واپس فراہم کر دیا گیا۔

زینب مارکیٹ کے سامنے والی سڑک اس وقت بھی لوگوں کے رش سے بھری ہوئی تھی۔ گو کہ چلنے تک کی جگہ نہ مل رہی تھی۔

وہ زینب مارکیٹ کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔اور اسی کے قریب اس کی نظر ایک قصائی کے دکان تک اٹھی تھی۔

وہ اشتیاق سے اسے قصائی کو مرغی ذبح کرتے دیکھتا رہا تھا۔کیسے مرغی پر پھڑ پھڑاتی آواز نکال رہی تھی، کیسے وہ قصائی کلمہ پڑھتے اسے کے گلے پہ چھری پھیر رہا تھا۔

وہاں سے خون کی تازہ تازہ "خوشبو" اٹھ رہی تھی۔اور اسے شاید پہلی بار خون کی وہ مہک اتنی دل فریب اور ذائقہ دار لگی تھی۔

اس کا ذہن کہیں اور نہیں بھٹکا تھا۔اس نے سر جھٹک کر اپنی نگاہ اسے انڈور کیفے پہ مرکوز کرلی تھیں۔اس نے رفتہ رفتہ اپنے قدم اٹھائے تھے۔کسی سلو موشن فلم کے کلائمیکس کی طرح۔

سب درست ہونے جارہا تھا۔سب میسر ہونے والا تھا۔

وہ دروازہ کھول کہ اندر ہی داخل ہو رہا تھا کہ اس کی نظران گول چشموں میں قفس ہو گئیں۔

وہ مبہوت سارہ گیا تھا۔

....

اس کی سانسیں اٹک گئی تھیں۔

اس کی سامنے ارمغان مطاہر علی، حقیقت کادروازہ کھولے،اس کے سامنے کھڑا تھا۔

ان دونوں کے چہروں پہ تاثر کے کئی رنگ آکر گزر رہے تھے۔آنکھوں میں نمی تھی،آنکھوں میں جوشی تھی، حیرانی تھی،ڈر تھااور شاید محبت بھی تھی۔

دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کے ساتھ جیسے پیوست ہو گئی تھیں۔ارد گرد سے بے نیاز۔وہ ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھے گئے تھے۔

سارہ اس کی کان میں سرگوشی کرتے کیفے سے باہر نکلی تھی۔غالباً اس نے کہا تھا وہ زینب مارکیٹ سے کچھ لینے جارہی ہے۔وہ سر بھی نہ ہلا پائی تھی۔آنکھیں اسی پہ منجمد رہیں۔

وہ بالکل ویسا ہی تھا۔بڑھی ہوئی شیو، گندمی رنگت۔اٹھی ہوئی ناک۔تیکھے نقوش۔ وہ آل بلیک تھری پیس میں حد سے زیادہ گریس فُل لگ رہا تھا۔

”look what I did. I caught you in hell, Aries“

ایرج کے لب ہلے تھے۔آنکھوں میں وہی الفت کا تاثر تھا۔بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

".sure you did"

وہ پہلی بار مسکرایا تھا۔ایرج کی نظر اس کی گلابی ہونٹوں تک گئے۔اس کی چہرے پہ آج بھی ڈمپل پڑتا تھا۔

سب کتنا اپنا اپنا سا لگتا تھا۔۔۔

''کیا تم نے بھی وہی۔۔''اس کا سوال ختم ہونے سے پہلے ہی ایرج نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔وہ خاموش ہو گیا۔

''اب ہم کیا کریں 'ارمغان ؟''اس نے ارمغان سے کہا تھا۔ایرج کا چہرہ اٹھا ہوا تھا۔

''وہ سب جو ہم پہلے نہیں کر پائے۔''اس نے ہنوز مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں پتا تھا میں یہاں ہوں گی؟''ایرج نے سوال کیا۔

"میری یادوں نے کہہ دیا تھا کہ تم یہاں ہی ہو گی۔" ارمغان نے اسے شانوں سے تھاما۔

"ایک بات بتاؤں ارمغان؟"

"ہمم۔۔؟"

اس نے بھی ارمغان کے بازو تھامے تھے۔

"آئی لو وڈیوان مائے ڈریم۔" ایرج نے بہت مدھم آواز میں کہا تھا۔اسی طلسم کو برقرار رکھتے ہوئے۔اس جادو کو برقرار رکھتے ہوئے۔

اس کی بات پہ ارمغان ہلکے سے ہنس دیا تھا۔

"اب ہمیں جدا بھلا کون کر سکتا ہے، ایکویرس؟" اس نے ایرج کو شانوں سے پکڑ کر اپنے قریب کیا۔

".be careful"

ایرج نے پھر سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا۔

".now I fear nothing, not even love"

وہ جملہ جو اس نے ایرج کو کہیں کبھی بولا تھا۔وہ محبت کے بچ جانے کی وارننگ ہی تو تھی۔ مگر اب کس وارننگ، کس احتیاط کی ضرورت تھی۔

”کیا ارمغان کو زندگی۔۔واپس مل سکتی ہے؟“اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

مگر اسے سے پہلے کہ ایرج کوئی جواب دیتی۔ان کے حصار کا طلسم اس ایک آواز سے ٹوٹا تھا۔

اس ایک چیخ سے۔۔

ان دونوں نے دھڑکتے دل سے کیفے کی کھڑکی سے سڑک کا منظر دیکھا تھا۔

ان دونوں کی زندگیاں تھم گئیں۔سانسیں بھی۔

ایک ٹرک نے کسی عورت کو روندھ دیا تھا۔ہجوم اس عورت کے گرد حصار کرنے لگا تھا۔

ایرج اور ارمغان۔۔دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ان دونوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

ارمغان بھاگتے ہوئے ایرج کی ٹیبل کے قریب آیا تھا۔ایرج نے لرزتے وجود کے ساتھ ارمغان کو دیکھا۔

وہ ٹیبل کے نیچے ہاتھ مار مار کر کچھ چیک کر رہا تھا کہ تبھی اس کی ہاتھ پہ کوئی وزنی شے آ کے گری تھی۔

اس نے ٹیبل کے نیچے سے ہاتھ نکال کر اس شے کو دیکھا۔

اسکے ہاتھ میں وہی سنہری پاکٹ واچ تھی۔

•••••••••••

ارحم دروازہ بند کرتے واپس اندر آیا تو سعد نے اسے آواز دی تھی۔

"ارحم بھائی! میں نے آپکا لاکٹ جوڑ دیا ہے۔یہ لے لیں۔"

ارحم کے چہرہ پہ ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔وہ سعد کے کمرے میں جانے کے بجائے اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"سعد! ایک کام کرو لاکٹ لے کر میرے کمرے میں آو ذرا، مجھے ایک ضروری کام ہے تم سے۔"

وہ بلند آواز میں سعد سے کہتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔اس نے دونوں ہاتھ اس کی سیاہ شرٹ کے بٹن پہ حرکت کر رہے تھے۔وہ ایک ایک کر کے تمام بٹن کھول رہا تھا۔ساتھ ہاتھ بیلٹ کا بکل بھی کھول رہے تھے۔

سعد اپنے کمرے سے اٹھ کر اوپر کے زینے پھلانگنے لگا تھا۔

....

ان دونوں کے چہرے زرد ہو گئے تھے،خون کی رفتار جیسے دل تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔دونوں کا جسم واقعی برف بن گیا تھا۔

وہ دونوں سہارے لیتے کیفے سے باہر آئے تھے۔اس ہجوم کو چیرتے وہ زمین پہ پڑی باڈی کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

قریب ہی کہیں ایمبولنس کی آواز آنے لگی تھی۔ان دونوں نے لوگوں کو دھکا دیتے اس زمین پہ پڑی عورت تک جانے کی کوشش کی۔

اور جب انہیں نے اس لڑکی کا چہرہ دیکھا تھا تو دونوں ہی زمین پہ گھٹنوں کے بل گر گئے تھے۔

وہ سارہ تھی۔سارہ نسیم صدیقی۔

جو خواب تھا، وہ حقیقت ہونے جا رہا تھا۔ جس کو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہوتا جا رہا تھا۔ جو زندگی کی ”نئ“ شروعات محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دراصل ایک چکر کا نیا سرا تھا۔

اس نے لرزتے ہاتھوں پہ قابو پایا تھا۔ ایمبولینس والے اس باڈی کو اسٹریچر پہ ڈال رہے تھے۔

اس نے ایرج کے خون میں بھیگے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام کر سہلایا تھا۔ ایرج نے خوف زدہ آنکھوں سے ارمغان کی طرف دیکھا۔

وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ سنجیدہ، نڈر اور بے خوف سیاہ آنکھوں سے۔

”اچھی یادوں میں اور بری یادوں میں، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

اس نے مدھم آواز میں سرگوشی کی تھی۔ان دونوں کے ہاتھ ہنوز جڑے ہوئے تھے۔اور ان دونوں کے ہاتھوں کے درمیان وہی سنہری گھڑی تھی جس پہ سارہ کا خون جم رہا تھا۔

•••••••••••

ایک ہفتے بعد۔۔۔

جناح انٹر نیشنل ایئر پورٹ پہ چلتے وہ دو لوگ بالکل انجان مگر بالکل ایک سے لگ رہے تھے۔ چمکتے سیاہ جوتوں میں اسکا عکس بھی واضح ہوا تھا اور ایئر پورٹ پہ بڑھتا ہجوم بھی۔ وہ ابھی بہت فارمل ڈریسنگ میں ملبوس تھا۔ سیاہ ڈریس شرٹ پہ سرمئی ڈریس کوٹ اور پینٹ۔ ہاتھ میں تھامافون کانوں سے لگا ہوا تھا، لب باہم ہل رہے تھے۔ سیاہ سن گلاسز شرٹ کے کھلے کالر سے لٹکے تھے۔ کوٹ کے بٹن بند تھے۔ چہرے پہ شیو تراش شدہ تھی اور بال نفاست سے سیٹ کیے گئے تھے۔

فون پہ بات کرتے وہ ٹک ٹک کرتا ایک سیدھ میں چل رہا تھا۔ اسکے برابر میں اسکے ہمقدم چلتا وجود سامنے نظر جمائے اسکے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ وجود کسی لڑکی کا تھا، برابر چلتے شخص سے دو فٹ چھوٹی۔ اسکے ہاتھ بھی اسکے قدم قدم پہ ہل جھل رہے تھے۔ آنکھوں پہ گول چشمے ٹکے ہوئے۔

کراچی ائیر پورٹ پہ کراچیآئٹس سے زیادہ تو باقی اقوام کے لوگ موجود تھے۔ سرائیکی، افغانی اور پٹھان جو ائیرپورٹ کو ٹرین اسٹیشن سمجھ کر کہیں بھی بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے تھے۔

وہ دونوں چھوٹا سا پل چڑھ کہ ائیر پورٹ کے اندر داخل ہوئے تھے۔ دراز قد شخص جو اپنی ڈریسنگ سے ایک سایہ سا لگ رہا تھا، اسنے اسنے برابر چلتی لڑکی کو کچھ نہ کہا۔ بس ایلیویٹر سے اوپر کی سمت رخ کر لیا۔ اسنے بھی کچھ نہ کہا، وہ بھی بس اسکے ساتھ ساتھ چل دی۔ دونوں کے چہرے ہمنوا سے لگ رہے تھے، سنجیدہ سنجیدہ سے۔

کال کاٹ کر اسنے فون کو پینٹ کی جیب میں اڑساتے ایرج کی طرف دیکھا۔ اسکی نظریں خود پہ محسوس کرتے اسنے بھی ارمغان کی طرف آنکھیں گھمائیں۔

"تمہارا دوست آگیا؟" سادہ سا لہجہ تھا۔ اسنے سر اثبات میں ہلایا۔

"تمہیں اپنے گھر رکنا چاہیے تھا' ایرج۔ میں دو دن میں واپس آجاتا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔۔" اسنے سیاہ آنکھوں سے اسکی ہیزل آنکھوں کا تعاقب کیا تھا۔

"پتا ہے۔۔ میں کبھی بھی جہاز پہ نہیں بیٹھی!" اسنے ارمغان کی بات کو نظرانداز کرتے نئے سرے سے بات کا سلسلہ جوڑا تھا۔ اسکی بات پہ وہ مسکرایا۔

"کنکٹنگ فلائیٹس ہیں، پھر تیار ہو جاؤ بور اور تھکنے کے لیے۔" اسکی آواز میں بہرم تھا، گہری آواز۔

"تم ساتھ ہو، پھر کیسے ہونگی میں بور؟" اسنے واپس سامنے کو دیکھا۔ ارمغان اسے ہی دیکھتا رہا۔

"تم خود کو ڈسٹریکٹ کر رہی ہو؟" ارمغان نے یکدم سوال کیا۔ ایرج نے اب بھی اسکی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"میرے پاس اسکے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔" سنجیدہ سا کہا تھا۔ لہجہ سپاٹ تھا، مگر نرم بھی۔ ارمغان نے آگے سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بس اب ائیرپورٹ کی دوسری منزل پہ چل رہے تھے۔ انہیں نیویارک کے لیے روانہ ہونا تھا۔

سارہ کو گم ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ سعد کو فرار ہوئے چھ دن۔ ارحم گھر پہ ہی گھر کا بڑا بیٹا بنتے سب کو سنبھالے ہوئے تھا۔ مگر اب کی بار وہ دونوں کافی پر سکون تھے۔ کیونکہ جو ہونا تھا، وہ تو انہیں پتا ہی تھا۔ جو ہونا تھا اسے وہ روک نہیں سکتے تھے، مگر جو ہو رہا تھا اسے حل کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

اس کہانی میں وہ دونوں جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ انہوں نے ایک زندگی کی مدت گزاری تھی دوسروں کی پرواہ کرتے ہوئے، اب کی بار انہیں پہلے خود کو اور اپنے دل کے قریب لوگوں کو خود سے جوڑنا تھا۔ سارہ کہاں تھی، انہیں پتا تھا۔ سعد کہاں بھجوادیا گیا ہے، وہ جانتے تھے۔ سب کام ارمغان کے ایک کلک پہ ہو رہا تھا۔

"ہاو از دس ینگ بزنس مین!" سامنے سے چلتا ہوا گورا امریکن اسکے گلے ملا تھا۔ ارمغان نے مدھم سا مسکراتے اس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ ایرج بس دو قدم کے فاصلے پہ کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی، چہرے پہ ہلکی سی مسکان تھی۔ اسنے بھی ایک عمر تک ارمغان کو غیر اور فریب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اب جبکہ وہ کھل کے مسکراتا تھا تو وہ بھی مسکرا دیتی۔

"اینڈ ہو از دس ینگ لیڈی!" اس گلابی رنگت والے گورے کا رخ اب ایرج کی طرف ہوا۔ وہ کنفیوژن کا شکار ہوئی۔ وہ کیا کہے؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔

ارمغان نے اسکی جانب دیکھا، پھر اسکے تاثر پڑھتے اسکا ہاتھ تھام کہ اسے خود سے لگایا تھا۔ ہاتھ کندھے پہ تھا۔ ایرج نے اسکا ہاتھ نہیں جھٹکا۔

”شی ازمائے وائف۔“ ارمغان نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ایرج کا چہرہ بلش کرتے گلابی ہوتا گیا اور گورے کا حیرت سے سرخ۔

وہ تینوں اب چیک ان کرتے اندر کے طرف بڑھ رہے تھے۔

یہ دنیا کتنی بڑی لگتی ہے نا؟

مگر کبھی کبھار، چھوٹی پڑ جاتی ہے

اپنی اس زندگی میں،

ہم نجانے کتنے لوگوں سے ملتے ہیں

مگر لوگوں کا کیا ہے؟ آتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں

پر کچھ ایسے بھی ہیں، جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں

انسان اپنی زندگی بھرپور طریقے سے جیتا ہے،

ہر طرح کے جزبات محسوس کرتا ہے

محبت،

دوستی،

خوشی،

پچھتاوا،

غم،

اور۔۔۔ نفرت۔

انسان جب نفرت کرتا ہے تو چیخ چیخ کر بتاتا ہے

پر جب پیار کرتا ہے۔۔۔ تو کہہ ہی نہیں پاتا

پیار کا اظہار کرنا اتنا مشکل کیوں ہوتا ہے؟

جب کسی سے محبت ہو، تو کہہ دینا چاہیے

اس سے پہلے کے دیر ہو جائے۔۔۔

(ڈراما سیریل-گم)

ٹرمنل کھلنے کا انتظار کرتے وہ دونوں کرسیوں پہ آ بیٹھے تھے۔ارمغان نے کوٹ کے بٹن کھول دیئے۔اس کا گورا دوست ان سے دور ٹہل کر کسی سے گفت گو میں مصروف تھا۔وہ دونوں ایک دوسرے کے برابر کندھے سے کندھا ملائے خاموش بیٹھے تھے۔ایرج کے ہاتھ پہلو میں گرے ہوئے تھے۔آنکھیں خلاء میں کسی چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ارمغان نے اپنے شانے کی طرف آنکھیں گھمائی تو اسے اپنے بازو سے ٹیک لگائے ایرج کی گم سم سی صورت دیکھائی دی۔اسکے ہونٹ ہلکے سے کھل گئے۔

ہاتھ بڑھا کر اسنے پہلو میں گرے ایرج کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ پھنسایا تھا۔

"تھینک یو۔" ارمغان نے اسکے کان کے قریب جھکتے ہوئے کہا۔ وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"کس لیے؟" مدھم نارمل سا لہجہ۔ جواب کے اشتیاق میں منتظر اسکی آنکھیں۔

"ہر چیز کے لیے۔" ارمغان نے ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے شانے سے لگایا تھا۔ ایرج نے پھر کچھ نا کہا تھا۔

ارمغان کو اپنی ضروریات نیو یارک سے لیکر واپس کراچی آنا تھا۔ مگر ایرج بھی اسکے ساتھ چل دی تھی۔اور وہ اسے منع کیسے کر سکتا تھا؟ان دونوں کا نکاح دو دن پہلے سب کی رضامندی سے کیا گیا تھا۔کاغذ پہ دستخط کرتے ارمغان نے ارحم کو اپنے برابر کھڑے پایا تھا۔اور پھر رخ موڑ کر اسنے دوسری طرف ایرج کو سر جھکائے بیٹھے دیکھا تھا۔

اسکی آنکھوں میں دو چیزوں کی جھلک ایک ساتھ اٹھی تھی۔ایک نفرت کا انگارہ اور ایک محبت کی بوندہ باندی۔

ائیر پورٹ پہ اعلان جاری کیا جارہا تھا۔وہ دونوں اب چیئر سے اٹھ کر دوسری طرف بڑھنے لگے تھے۔ارمغان نے ایرج کا ہاتھ اب بھی خود سے الگ نہیں کیا تھا۔نہ ایرج نے اسے الگ کرنے کی کوشش کی۔

ایرج نے اپنے رب سے ارمغان کے لیے زندگی مانگی تھی، اور اسے زندگی دے دی گئی تھی۔

....

(تمت بالخیر)

ناول کو یہاں تک مکمل پڑھنے کا بے حد شکریہ۔امید ہے آپ کو یہ کہانی پسند آئی ہو گی۔ایک آنلائن لکھاری کے لیے اسکا سب سے بڑا انعام قارئین کی رائے ہوتا

ہے۔ناول پڑھنے کے بعد اپنا اظہارِ تشکر میرے یعنی اس ناول کے لکھاری کے ڈی ایم ان باکس میں لازمی فراہم کریں۔

آئی ڈی:@syed.khizarr